مجلہ علمیہ ادبیہ سیاسیہ

مارچ ۱۹۵۳ء

ماہنامہ

ریاض

سید سلیمان ندوی نمبر

ایڈیٹر
رئیس احمد جعفری

قیمت

دلچسپ، نشاط انگیز اور پُر لطف کتابیں وقت گذاری کا بہترین مشغلہ ہیں

کتب ذیل، ناول، افسانہ، داستان، اور کہانیوں پر مشتمل ہیں، بےحد دلچسپ، سبق آموز، لرزہ خیز اور نشاط انگیز، ایک مرتبہ شروع کیجئے تو ختم کئے بغیر ہرگز جی نہ مانے گا



اسلام اور فطرت

علامہ شاویش کی عربی کتاب کا بہترین ترجمہ از ابو تمکین افتخار احمد، قیمت ۸؎ ضخامت ۲۲۸ صفحات، کتابت طباعت بہترین

مسلمانوں کا نظام حکمرانی

یہ بہترین کتاب نظام اسلامی کا عطر ہے۔ ترجمہ اتنا سلیس ہے کہ تصنیف کا گمان ہوتا ہے۔ ضخامت ۶۲۱ صفحات قیمت ۶ روپے ۸؍

شعر العجم پنجم!

علامہ شبلی کی یہ معرکہ آرا کتاب عام کتابی سائز پر مطبع انوار احمدی نے چھاپی ہے کتابت طباعت کاغذ بہترین قیمت بہت کم یعنی صرف دو روپے

حیات لیاقت

شہید ملت لیاقت علیخاں کی ولادت سے لیکر شہادت تک کے واقعات مؤرخانہ کاوش اور تفصیل کے ساتھ کاغذ نہایت عمدہ سفید آرٹ پیپر پر متعدد تصاویر ضخامت ۴۴۴ صفحات قیمت چھ روپیہ چھ آنے

مذکورہ بالا کتابوں کا تاجرانہ نرخ اور کمیشن خط وکتابت کے ذریعہ سے طے ہو سکتا ہے!

ہر قسم کی عربی، فارسی اور اردو کتابیں بکفایت ہم سے طلب فرمائیے

عباسی کتب خانہ۔ جونا مارکٹ۔ کراچی ۲

۷۸۶

ماہنامہ **ریاض** کراچی

جلد ۳ نمبر ۳

مارچ ۱۹۵۴ء

سید سلیمان ندوی نمبر

مدیر مسئول

رئیس احمد جعفری

قیمت

سالانہ	آٹھ روپے
ششماہی	پانچ روپے
فی پرچہ	بارہ آنے

سید سلیمان نمبر دو روپے

چھ ماہ سے کم کے لئے پرچہ جاری نہیں کیا جائے گا

مطبوعہ
انجمن پریس لارنس روڈ کراچی

طابع و ناشر
رئیس احمد جعفری

مندرجات

تاثرات :-

زبان کا ہنگامہ

ہمارا ملک ہنگامہ آرائیوں کا مرکز بنا ہوا ہے، کبھی الیکشن کا ہنگامہ ہے، کبھی صوبائی عصبیت کا ہنگامہ ہے، کبھی اُردو، اور بنگالی کا ہنگامہ ہے، غرض

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی، نغمۂ شادی نہ سہی!

آج کل زبان کا مسئلہ ہنگامہ آرائی کا موجب بنا ہوا ہے، ناظم الدین کے عہد میں یہ فتنہ ابھرا، محمد علی کے دور میں قیامت بن گیا۔

جب تدبّر کی جگہ موقع شناسی لے لیتی ہے، اور عزم و استقامت کی مسند پر تلوّن، اور سیماب وشی کے قدم پہنچ جاتے ہیں، معاملہ فہمی، عاقبت بینی، اور دور اندیشی کے قلمرو پر ہٹ دھرمی، تنگ نظری، اور عصبیت کا پرچم لہرانے لگتا ہے تو وہی ہوتا ہے جو آج ہم دیکھ رہے ہیں!

قائداعظم کے زمانہ میں بھی زبان کے اس فتنہ نے سر اُٹھایا تھا، لیکن قائداعظم، قائداعظم تھے، وہ ضعف، نقاہت اور بے انتہا مصروفیت کے باوجود، ڈھاکہ تشریف لے گئے، انہوں نے ڈھاکہ یونیورسٹی میں جو اس ہنگامہ کا مولد تھا، ایک تقریر فرمائی، قائداعظم کے لغت میں موقع شناسی، اور مصلحت بینی کا لفظ نہیں تھا، ان میں مردِ مومن کے تمام خصوصیات مجتمع تھے،

جو دل وہ زباں پر اللہ جانتا ہے!

قائداعظم نے اپنی یادگار، اور ناقابل فراموش تقریر میں فرمایا، پاکستان کی سرکاری زبان اُردو، اور صرف اُردو ہوگی، اور جو لوگ اس کے خلاف ایک محاذ بنانے کی سعی کر رہے ہیں، یاد رکھو وہ پاکستان کے غدّار ہیں، ——— قائداعظم نے یہ تقریر کی، اور زبان کا فتنہ فوراً ختم ہوگیا، پھر کسی حلقہ سے کوئی صدائے مخالفت بلند نہ ہوئی، محمد علی صاحب قائداعظم کی اس تقریر کے وقت خدا کے فضل و کرم سے بہ قید حیات تھے، مسلم لیگ میں شریک تھے، ہمیں نہیں یاد آتا کہ انہوں نے قائداعظم کے دوران قیام ڈھاکہ میں، یا ان کے واپس تشریف لانے کے بعد اس اعلان کے خلاف لب کشائی کی ہو، اگر وہ اس وقت خاموش تھے، تو اب ان کا زورِ زباں کیوں حدود و قیود کی سرحدیں پار کرنے پر تلا ہوا ہے؟

لیڈر کا کام یہ نہیں ہوتا کہ وہ رائے عامہ کے سامنے سرِ عقیدت خم کردے، یہ کام تو موقع شناسوں کا ہوا کرتا ہے، جیسا رنگ دیکھا، ویسی بولی بولنے لگے، لیڈر تو رائے عامہ کا خالق ہوتا ہے، اس کا خلوص، رائے عامہ کی تشکیل کرتا ہے، وہ رائے عامہ کا بندہ نہیں ہوتا، رائے عامہ اس کی کنیز ہوتی ہے، محمد علی صاحب بخت و اتفاق سے لیڈر تو بن گئے ہیں، لیکن ابھی لیڈر کے خصائص ان میں پیدا نہیں ہوئے ہیں، اور جب تک یہ خصائص ان میں نہ پیدا ہوجائیں کرسی وزارت بھی ڈولتی رہے گی، اور مسند صدارت بھی زیر و زبر ہوتی رہے گی، ——— ہیں وہ لیڈر چاہئے جس کی تلاش رومی کو تھی،

شیر خدا و رستم دستانم آرزوست

پاکستان اور امریکہ کا دفاعی معاہدہ؟

پاکستان اور امریکہ کے مبینہ دفاعی معاہدہ نے مصرعۂ طرح کی حیثیت اختیار کر لی ہے، ہر شخص خواہ وہ ملکی ہو یا غیر ملکی، دوست ہو یا مخالف، تماشائی ہو یا ہمدرد، پورے انہماک و استغراق کے ساتھ طبع آزمائی میں مصروف ہے، اس معاہدہ کا بھلا یا برا اثر ہم پر، اور صرف ہم پر پڑے گا، لیکن ہم تو بے فکر ہیں، اور ہمارے ہمدرد جان دیئے دے رہے ہیں، حتیٰ کہ جواہر لال تو زبانِ حال سے صاف صاف فرما رہے ہیں،

گر وفاداریٔ اغیار کا غوغا ہے یہی
جان سے ہم بھی گزر جائیں گے سوچا ہے یہی

اس مسئلہ پر بار بار تند و تلخ لہجہ میں اپنے افادات عالیہ سے مستفید کرنا نہ سیاست ہے، نہ تدبّر، یہ صرف چھچھورا پن ہے، تنگ ظرفی ہے، رکاکت کی انتہا ہے، یہ باتیں کسی فرد کو بھی زیب نہیں دیتیں، چہ جائے کہ ایک پورے ملک اور پوری قوم کے سرکاری نمائندے کو

اچاریہ کرپلانی پہلے تو اس معاہدے کے خلاف خوب خوب گرجے، اور برسے، لیکن جب انہوں نے دیکھا، یہ سلسلہ کسی طرح بند ہی نہیں ہوتا، بلکہ شب فراق اور زلف رسا کی طرح درازے دراز تر ہوتا چلا جا رہا ہے تو وہ بھی خوابِ گراں سے چونکے، چنانچہ ایک تازہ بیان میں انہوں نے اپنے ہم قوموں سے اپیل کی ہے کہ وہ اس مسئلہ پر معاندانہ اور مخالفانہ اظہارِ رائے کا سلسلہ بند کر دیں، اگر وہ واقعی اس معاہدہ کے مخالف ہیں، تو انہیں معلوم ہونا چاہئے، اظہارِ مخالفت کا بہترین طریقہ خاموشی ہے، اگر وہ خاموش نہیں رہیں گے تو ان کے اس فعل کا نتیجہ یہ ہو گا کہ پاکستان ضرور امریکہ سے معاہدہ کر لے گا۔

لیکن اچاریہ جی کے اس وعظ و پند کا جو اثر ہو گا وہ معلوم ہے، جب تک موصوف پنڈت نہرو کو خاموش ہونے پر راضی نہیں کر لیتے، کچھ نہیں ہو سکتا، اور پنڈت جی کا یہ عالم ہے کہ آج کل ہر تقریر، اور ہر بیان میں اس معاہدہ کا دکھڑا انڈیلے بیٹھتے ہیں!

پنڈت نہرو کا خود بھی بغیر کسی انکسار کے اپنے بارے میں یہ خیال ہے، اور ان کے حاشیہ نشینوں نے شاعرانہ مبالغہ کے ساتھ اس خیال کو اور زیادہ آب و رنگ سے مزیّن کیا ہے کہ وہ بہت بڑے بین الاقوامی سیاست داں ہیں، یہ انہی کی سیاست کا کرشمہ ہے کہ کوریا کی لڑائی نئی دلّی تک نہیں پہنچی ورنہ آج سیول کی طرح دلّی، غازی آباد، میرٹھ، خورجہ، اور بلند شہر وغیرہ بھی خاک کا ڈھیر ہو چکے ہوتے، یہی لوگ، پنڈت کو باور کرا رہے ہیں کہ یہ انہی کی شخصیت ہے جو امریکہ اور پاکستان کے معاہدے کے راستہ میں روک بنی ہوئی ہے، ورنہ کب کا معاہدہ مکمل ہو چکا ہوتا، پنڈت جی کو اپنے حاشیہ نشینوں کی اس بات کا یقین ہے، اور وہ اپنے آپ کو مبینہ معاہدے کی راہ میں سنگِ گراں ثابت کرنے کے لئے مسلسل آہ و بکا میں مصروف ہیں، جس سے ہمیں اندیشہ ہوتا ہے کہ،

یوں ہی گر روتا رہا غالب تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

بنگال کا انتخاب

مشرقی بنگال کا انتخاب زیادہ سے زیادہ نزدیک آچکا ہے، چند ہفتوں کے اندر یہ مرحلہ سر ہو جائے گا، سردار عبدالرب نشتر مسلم لیگ کے لئے کام کرنے گئے تھے، انہوں نے وہاں سے واپس آکر فرمایا ممکن ہے مسلم لیگ کامیاب ہو جائے، لیکن مقابلہ ہوگا بہت سخت، مسٹر فضل الرحمٰن بھی مسلم لیگ کی نصرت و حمایت کے لئے اڑ کر ڈھاکہ پہنچے تھے، لیکن وہیں بیمار پڑ گئے، اور اب تک پورے طور سے صحت یاب نہیں ہو سکے ہیں، بنگال مسلم لیگ کے سابق صدر مولوی اکرم خاں منہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھے ہیں، بولتے تو ہزار مصیبتیں تھیں، خاموش ہیں، لہٰذا ہر مصیبت دروازے تک آکر رک جاتی ہے، نورالامین کا معاملہ یہ ہے کہ

لگاؤں کدھر کی چوٹ۔ بچاؤں کدھر کی چوٹ؟

ایک طرف یہ فکر کہ کہیں دفعہ ۹۲- الف نافذ نہ ہو جائے، دوسری طرف یہ اندیشہ، کہیں مسلم لیگ شکست نہ کھا جائے، دفعہ ۹۲ الف نافذ ہوتی ہے تو آئندہ وزارت عظمیٰ کا امکان ضعیف تر، اور خدانخواستہ مسلم لیگ مات کھاتی ہے تو پھر سابق مسلم لیگی دوست، اور رفقاء چڑانا شروع کر دیں گے۔

اسی باعث تو قتلِ عاشقاں سے منع کرتے تھے
اکیلے پھر رہے ہو یوسفِ بے کارواں ہو کر

ہمارے وزیر اعظم صاحب یا تقابہم صبح کراچی میں ہوتے ہیں تو شام ڈھاکہ میں، بسر کرتے ہیں، ایک پرانی ضرب المثل کے مطابق کھانا یہاں کھاتے ہیں، پانی وہاں پیتے ہیں، مولانا احتشام الحق وغیرہ بھی ڈھاکہ کی گلگشت سے فارغ ہو کر واپس تشریف لائے اور گئے، لیکن نہ خوش ہیں نہ مطمئن، نہ پُر امید ہیں، نہ مایوس، دوسروں کی طرح انہیں بھی یہ اندیشہ ہے کہ

دیکھئے اس بحر کی تہ سے اُچھلتا ہے کیا؟
گنبد نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا؟

——— بہرحال، یہ حالات ہیں، اور الیکشن کی تیاریاں زور شور سے جاری ہیں، !

سوال یہ ہے جب مسلم لیگ زندہ تھی، فعّال، اور کارگزار جماعت تھی، کیا جب بھی "الیکشن کمپین" میں اسے اتنی ہی جد و جہد کرنا پڑتی تھی؟ ایسی ہی پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑتا تھا؟ اسی طرح کی رُوح فرسا، اور جان ہار مصیبتوں کا اسے مقابلہ کرنا پڑتا تھا؟ یا یہ ہوتا تھا کہ اس نے ایک شخص کو نامزد کیا، اور لوگ بغیر یہ سوچے ہوئے کہ یہ شخص کیسا ہے، ووٹ دینے کے لئے پل پڑتے، اس لئے کہ درحقیقت وہ ووٹ کسی شخص کو نہیں دیتے تھے، مسلم لیگ کو دیتے تھے! ——— اب مسلم لیگ ہے نہیں اشخاص ہیں، لہٰذا لوگ ٹھونک بجا کر، پرچہ رائے دہندگی پر کسی کا نام لکھتے ہیں، ——— کم از کم ہم تو اسے فالِ نیک سمجھتے ہیں، اپنی رائے سے غلط کام کرنا بھی، آنکھ بند کر کے صحیح کام کرنے سے بہتر ہے!

ہائی کورٹ کے فیصلے

گزشتہ ہفتوں میں سندھ چیف کورٹ لاہور ہائی کورٹ، اور فیڈرل کورٹ آف پاکستان نے ایسے معرکہ آرا فیصلے کئے ہیں، جنہوں نے پاکستان عدلیہ کے وقار میں بہت زیادہ اضافہ کر دیا ہے، اور ایک بار پھر یہ بات دُنیا پر واضح ہو گئی ہے کہ ہمارا عدلیہ ہر اثر اور تاثر سے آزاد ہے، وہ صرف اپنی صواب دید پر فیصلے کرتا ہے، اور یہ فیصلے اس اصول پر مبنی ہوتے ہیں کہ جج پارٹی پالٹیکس سے بالا ہوتا ہے، وہ صرف حقائق اور واقعات کو سامنے رکھ کر فیصلہ کرتا ہے، سندھ چیف کورٹ نے مولانا عبدالحامد بدایونی وغیرہ کی درخواست حبس بے جا کی سماعت کی، اور انہیں رہا کر دیا، پنجاب ہائی کورٹ کے سامنے اسی طرح کی درخواست مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری اور ماسٹر تاج الدین وغیرہ کی طرف سے پیش ہوئی، اور منظور قبول لے کر واپس ہوئی فیڈرل کورٹ آف پاکستان میں کمیونسٹ پارٹی کے سابق سکریٹری مسٹر حسن ناصر کی رہائی کے خلاف حکومت نے اپیل کی ایڈووکیٹ جنرل پاکستان نے اپنے کیس کی تائید میں دلائل کا انبار لگا دیا، لیکن اچھے سے اچھے دلائل بھی حقائق کو مجروح نہیں کر سکے، چنانچہ فیڈرل کورٹ نے حکومت پاکستان کی درخواست مسترد کر دی، اور مسٹر حسن ناصر کی رہائی کا فیصلہ برقرار رہا!

اُس ملک میں جمہوریت کبھی نہیں مر سکتی جہاں اس بلند معیار کا عدلیہ موجود ہو، اپنے حکمران طبقہ سے ہر قسم کی شکایات کے باوجود اگر عوام کسی بات سے خوش اور مطمئن ہیں تو وہ یہی ہے کہ عدلیہ کے فیصلے حکومت کی پالیسی، مقصد اور مصلحت کے خواہ کتنے ہی مخالف ہوں، لیکن بہرحال وہ نافذ ہو جاتے ہیں، اور لوگ محسوس کرتے ہیں کہ حکومت کی ہر دھاندلی کا آخری فیصلہ عدالت عالیہ سے کرایا جا سکتا ہے، یہی اطمینان جمہوریت کی اصل روح ہے!

انڈ منٹی ایکٹ کے سلسلہ میں حکومت نے جو پالیسی اختیار کی ہے وہ روایات عدل کے خلاف ہے، اگر حکومت ہائیکورٹ کے جج سے مشورہ کرنے کے بجائے اسے مقدمہ کی سماعت کرنے کا مجاز کر دے تو یہ اس کا قابل تعریف اقدام ہو گا!

غفار خاں آزاد ہیں یا نظر بند؟

خان عبدالغفار خاں، ڈاکٹر خان صاحب، اور دوسرے اسیران قید بے میعاد کی رہائی پر ہم نے حکومت کی خدمت میں سپاس و امتنان پیش کیا تھا، لیکن اب ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہمارا اظہار سپاس و امتنان قبل از وقت تھا!

اخبارات میں جو خبریں آئی ہیں، اور سرکٹ ہاؤس کے بستر علالت سے خود خان عبدالغفار خاں نے جو بیان دیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ رہا نہیں ہوئے ہیں، پہلے وہ قید تھے، اب نظر بند ہیں، عملاً ان دونوں صورتوں میں کچھ بہت زیادہ فرق نہیں!

اس صورت حال پر ہم اظہار افسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتے، نہ حکومت کے اس اقدام کو کسی طرح بھی سراہ سکتے ہیں اگر حکومت اب تک خان صاحب سے مطمئن نہیں ہوئی تھی تو اس کے لئے بہتر یہی تھا کہ وہ موصوف کو ابھی کچھ دن اور نذر زنداں رکھتی، لیکن یہ تو ستم ظریفی کی انتہا ہے کہ پانچ سال تک جرم بتائے، اور مقدمہ چلائے بغیر ایک شخص کو قید رکھا جائے، پھر

رائے عامہ کے دباؤ اور عوام کی چیخ پکار سے متاثر ہو کر اس طرح اس کی آزادی کا اعلان کر دیا جائے کہ اسے جیل کے بلند و بالا حصار سے باہر نکال کر ایک عام گزرگاہ پر نظر بند کر دیا جائے، ایک جمہوری حکومت کے لئے اس طرح کے افعال ہرگز سرمایۂ افتخار نہیں ہو سکتے ——!

اگر خان عبدالغفار خاں مجرم ہیں تو انہیں زیادہ سے زیادہ سزا ملنی چاہئے، لیکن اگر وہ مجرم نہیں ہیں یا ان کا جرم حکومت ثابت نہیں کر سکتی تو پھر اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہے کہ انہیں فوراً غیر مشروط طور پر رہا کر دیا جائے، صرف اسی طرح حکومت اپنے وقار کو بحال کر سکتی ہے!

ہم خان عبدالغفار خاں کے مداحوں، اور قدر شناسوں میں نہیں ہیں، زندگی بھر ہم ان کے مسلک کے خلاف مسلسل اور سخت تنقید کرتے رہے ہیں، لیکن ہم ان کے دشمن بھی نہیں ہیں، ہم کسی حیثیت پر اسے گوارا نہیں کر سکتے کہ ایک شخص کا جرم ثابت نہ کیا جا سکے پھر بھی اسے برسہا برس تک قید یا نظر بند رکھا جائے، اس اقدام کا جواز نہ اسلام کے روایات میں مل سکتا ہے نہ قانون کے دفعات میں!

پاکستان کی سالمیت کو خطرہ!

مشرقی بنگال کے وزیر اعظم مسٹر نورالامین نے ایک انتخابی جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے لوگوں سے اپیل کی کہ وہ مسلم لیگ کو ووٹ دیں، اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو پھر پاکستان کی سالمیت خطرے میں پڑ جائے گی! ——!

ہمیں اس انداز تخاطب پر سخت اعتراض ہے، جس طرح اصولاً یہ بات غلط اور ناقابل برداشت ہے کہ انتخابی معرکوں میں مذہب کا نام درمیان میں لایا جائے، اور جنت و دوزخ کی تقسیم شروع کر دی جائے، اسی طرح یہ بات بھی اصولاً غلط اور ناقابلِ برداشت ہے کہ انتخابی معرکوں میں پاکستان کی سالمیت زیر بحث لائی جائے، اور لوگوں کو ڈرایا جائے کہ اگر انہوں نے کسی خاص جماعت کے امیدواروں کو ووٹ نہ دیا تو وہ آزادی کھو بیٹھیں گے! —— یہ باتیں صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کے دلائل کا توشہ خالی ہو، جو بالکل مایوس ہو چکے ہوں، اور جنہیں مایوسی کی تاریکی میں روشنی کی کرن بھی نظر نہ آتی ہو!

پاکستان آزاد ہے، اور آزاد رہے گا، وہ زندہ ہے اور اس کی زندگی کوئی نہیں چھین سکتا، وہ مستحکم ہے، اور اس کا استحکام انشاءاللہ ہر حالت میں باقی رہے گا، خواہ مسلم لیگ اس انتخابی معرکہ میں کامیاب ہو یا ناکام، پاکستان اس لئے نہیں بنا تھا کہ وہ نورالامین صاحب کو وزارت عظمیٰ کی مسند پر لا بٹھائے، وہ اس لئے بنا تھا کہ یہاں کے عوام کی حالت سدھرے، لوٹ کھسوٹ بند ہو، لوگ امن اور عافیت کی زندگی بسر کریں، عوام انہی لوگوں کو ووٹ دیں گے، جو ان تمناؤں کو پورا کر سکیں، ان کی طرف سے نظریں پھیر لیں گے جن سے یہ امیدیں باندھی گئیں، لیکن ناکام ہوئیں۔

تو درون در چہ کردی کہ برون خانہ آئی!

ڈرگ روڈ یا کالا پانی ؟

گورنر جنرل ہاؤس کے سامنے والی نمائش گاہ میں بھی کئی ہزار بے گھر اور بے در مہاجرین زندگی کے دن گزار رہے ہیں، لیکن یہ بھی نظر التفات کے شکار رہے، اور ان کے بارے میں بھی فرمان واجب الاذعان صادر ہوا کہ فوراً ڈرگ روڈ منتقل ہو جائیں، اور مہاجرین کا یہ عالم ہے کہ وہ ڈرگ روڈ سے اتنے ہی خائف ہیں جتنے کسی زمانہ میں لوگ کالے پانی سے ڈرا کرتے تھے!

یقیناً حکومت کو حق ہے کہ وہ اپنے نظم و انتظام کے مطابق جہاں چاہے مہاجرین کو منتقل کر دے، اور کوئی خبر نہیں مہاجرین کا یہ فرض ہے کہ وہ حکومت سے تعاون کریں، اور کوئی ایسی بات نہ کریں جس سے حکومت کے راستہ میں مشکلات پیدا ہوں ـــــ لیکن کیا بات ہے کہ پہلے پہل میں خوشی خوشی ہزاروں مہاجرین ڈرگ روڈ کالونی میں جا بسے، اور اب یہ حالت ہے کہ جس طرح بچے "ہوے" کے نام سے ڈر جاتے ہیں، مہاجرین ڈرگ روڈ کا نام سنکر کانپنے لگتے ہیں!

بات صرف یہ ہے کہ پہلے لوگ اس توقع میں گئے تھے، کہ وہاں پانی اور روشنی کا انتظام ہوگا، روزگار ملے گا، بچوں کے لئے اسکول، اور بیماروں کے لئے ہسپتال ہوں گے، لیکن جب وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ

خود غلط بود انچہ ما پنداشتیم!

نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے فریاد و فغاں سے آسمان سر پر اٹھا لیا، ان کا حال زار دیکھ کر دوسرے لوگ ڈرگ روڈ کالونی کا نام سنکر کانوں پر ہاتھ دھرنے لگے،

وائے گر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو
اب تلک تو یہ توقع تھی کہ واں ہو جائے گا

جلد ہی انہوں نے محسوس کر لیا کہ آبادکاری کے نام پر وہ بربادی کے شکار ہو رہے ہیں، اور ظاہر ہے برباد ہونے کے لئے کوئی بھی خوشی خوشی نہیں تیار ہو سکتا۔

ہمیں مسرت ہے کہ وزیر مہاجرین مسٹر شعیب قریشی نے فی الحال چیف کمشنر کراچی کا یہ حکم معطل کر دیا ہے، لیکن صرف "فی الحال" سے کام نہیں چل سکتا، ہم جناب موصوف سے درخواست کریں گے کہ وہ حالات کا جائزہ لے کر، آبادکاری کی کوئی ایسی اسکیم تیار کریں جو واقعی آبادکاری کی ضامن ہو، چھ سال کے روح فرسا مصائب کے بعد بھی اگر یہ اسکیم نہ بنی تو کب بنے گی؟

کشمیر کا حال و مستقبل

کشمیر کا مسئلہ روز بروز نازک اور پیچیدہ ہوتا چلا جا رہا ہے، یہ بات اب روز روشن کی طرح واضح اور نمایاں ہو چکی ہے کہ کشمیر پر اقتدار اور قبضہ رکھنے کے لئے ہندوستان کسی بے اصولی سے بھی دریغ نہیں کرے گا، وہ کشمیر پر قابض رہنے کے لئے وہ تمام جائز اور ناجائز مناسب اور غیر مناسب، مستحسن، اور ناپسندیدہ وسائل و ذرائع استعمال کرے گا جو اس کے

قبضۂ قدرت میں ہیں، وہ غلط بیانی سے کام لے گا، دھاندلی کا مظاہرہ کرے گا، اصول توڑے گا، قانون کی دھجیاں اڑائے گا، وعدوں کو فراموش کرے گا، عہد ناموں کو چاک کرے گا، خود اپنی عائد کردہ پابندیوں سے روگرداں ہو جائے گا، خود اپنی کہی ہوئی باتوں سے مکر جائے گا، خود اپنے کئے ہوئے مواعید کو مکڑی کے جالے کی طرح توڑ کر رکھ دیگا اور اپنے وفادار سے وفادار اور کھرے سے کھرے دوست ——— مثلاً شیخ عبداللہ ——— کی بات سننے سے انکار کر دے گا پھر بھی اگر وہ اپنی بات پر اڑا رہے گا تو ضمیر کی ملامت سے بے پروا ہو کر اسے جیل میں ڈال دے گا، اور ایک ایسے شخص کو وزارت عظمیٰ کی مسند پر بٹھا دے گا جس سے نہ کشمیر کے عوام خوش ہیں نہ خواص، نہ ہندو مطمئن ہیں نہ مسلمان، نہ جن سنگھ کو بھروسہ ہے نہ نیشنل کانفرنس کو!

ان حرکتوں سے کوئی شبہ نہیں قبضہ کی کچھ مدت بڑھ جائے گی، لیکن دائمی صورت وہ کبھی بھی اختیار نہیں کر سکے گی، ہمارے سامنے ہٹلر کی مثال موجود ہے، اس نے کس آسانی سے بظاہر کتنے وثوق سے سوڈیٹن لینڈ پر قبضہ کیا تھا، پولینڈ کی سرزمین پر اپنی فوجیں اتار دی تھیں، لیکن آج ہٹلر ختم ہو چکا ہے، اور جرمنی کے چار ٹکڑے ہو چکے ہیں، ایک پر برطانیہ، دوسرے پر فرانس، تیسرے پر امریکہ اور چوتھے پر روس قابض ہے، وہ جرمنی جس کی عظمت سے دور و دراز کے ممالک دہل جاتے تھے، آج وہ مشت غبار ہے، جو پھونکوں سے اڑایا جا رہا ہے، ہم ایک لمحہ کے لئے بھی یہ باور نہیں کر سکتے کہ پنڈت جواہر لال ہٹلر سے زیادہ طاقتور ہیں، ان کی فوج جرمنی کے طوفانی دستوں سے زیادہ جاں نثار ہے، ہاں ہم یہ ضرور باور کر سکتے ہیں کہ اگر دانستہ یا نادانستہ طور پر پنڈت جی ہٹلر کے نقش قدم پر چلتے رہے تو انہیں اس انجام کے لئے بھی تیار رہنا چاہیے، جو ہٹلر کا ہو چکا ہے، باقی رہا کشمیر سو اس کے بارے میں ہم مطمئن ہیں کہ وہ بہرحال حق خود ارادیت سے بہرہ ور ہوگا، اور ایک دن،

آملیں گے سینہ چاکان چمن سے سینہ چاک!

ایک یادگار صحبت

۱۱ فروری کو پیرزادہ عبدالستار مجددی نے سردار محمد عتیق اللہ خاں وزیر مختار دولت علیہ افغانستان در پاکستان و حضرت صاحب فضل احمد مجددی، رئیس اعیان در کابل کو بیچ لکزری ہوٹل میں ایک پر تکلف عصرانہ دیا، اس میں سردار عبدالرب نشتر، کرنل اے، بی شاہ سفیر پاکستان در کابل اور دوسرے سربرآوردہ اصحاب شریک تھے، اس موقع پر پیرزادہ عبدالستار مجددی نے ایک سپاسنامہ ہر دو حضرات کی خدمت میں پیش کیا، اور اس تمنا کا اظہار کیا کہ ان دونوں اسلامی ممالک کے درمیان جلد از جلد وہ روابط قائم ہو جائیں گے جن کے لئے ہر مسلمان خدائے قدوس سے دست بدعا ہے، سردار عتیق اللہ خاں نے ایک شستہ اور شائستہ جوابی تقریر کی، ان کی تقریر میں خلوص اور سچائی کا رنگ جھلک رہا تھا، انہوں نے بھی یہ امید دلائی، اور ہم اس امید میں شریک ہیں کہ جلد از جلد ان دونوں ممالک کے درمیان وداد اور محبت کا وہ دور شروع ہوگا جو ایک نئے اور شاندار مستقبل کا آئینہ دار ہوگا، ——— ہماری تمنا ہے کہ جلد وہ دن آئے، جب پاکستان افغانستان کے بارے میں، اور افغانستان پاکستان کے بارے میں کہہ سکے،

ہم اس کے پاسباں ہیں وہ پاسباں ہمارا!

اور یہ دن جس قدر جلد آئے گا، اتنا ہی ہر دو ممالک کے لئے بہتر اور سودمند ہوگا!

دوسرے روز ہمارے عزیز دوست حکیم نصیر الدین صاحب ندوی نے اپنے دولت خانہ پر حضرت صاحب فضل احمد مجددی رئیسِ اعیانِ کابل کو ایک پرتکلف اور شاندار دعوت دی، اس موقعہ پر حضرت صاحب کے فضل و کمال، ذوقِ شعر و ادب، اور فراست و ذکاوت کے جو مناظر دیکھنے میں آئے وہ کبھی فراموش نہ ہوں گے!

حضرت صاحب، حضرت مجدد الف ثانی رہ کے احفاد امجاد میں سے ہیں، خدا نے انہیں دولتِ دُنیا بھی دی ہے، اور خوب دی ہے، ان کی سادگی، ان کا خلوص، ان کی للّٰہیت، اور جذبۂ اخوت دیکھ کر کوئی اندازہ نہیں کرسکتا، کہ یہ شخص اپنے ملک کا اتنا بڑا، اور بلند پایہ شخص ہے، وہ اس طرح ملتے ہیں جیسے ان سے بہت پرانی دوستی ہے، وہ اس اپنائیت، اور خلوص سے پیش آتے ہیں کہ صاف معلوم ہوتا ہے ان کا دل، مہر و محبت کا گنجینہ ہے، ان میں غرور نہیں، تکلف نہیں، رعونت نہیں پندار نہیں، خود پرستی نہیں، انانیت نہیں، ان میں سادگی ہے، خلوص ہے، حسن نیت ہے، ہمدردی ہے، محبت ہے، تعلق خاطر ہے، بے تکلفی ہے، اور یہ سب باتیں کچھ اس انداز سے طبیعت میں سموئی ہوئی ہیں کہ نہ ان کے وقار میں فرق آتا ہے، نہ دل آویزی میں، ایسا معلوم ہوتا ہے حافظ نے یہ شعر انہی کے لئے کہا ہے؛

مبیں حقیر گدایانِ عشق را کیں قوم
شہانِ بے کمر و خسروانِ بے کلہ اند

ممکن نہیں کہ ایک مرتبہ صاحب موصوف سے کوئی شخص مل لے، اور پھر وہ اپنے دل کو ان کی طرف کھنچتا ہوا نہ محسوس کرے، اور اس حقیقت کا یقین نہ کرے کہ عبا، اور سجادہ اب بھی بہت کچھ ہے، اس گئے گزرے زمانہ میں بھی اس کی آن اور شان قائم ہے!!

حضرت صاحب کا حافظہ غضب کا ہے، چوٹی کے اساتذہ کے بہترین اشعار یاد ہیں، وہ جس موضوع پر چاہیں، ایک شعر نہیں، چند شعر بھی نہیں، پورا دیوان سنا دے سکتے ہیں، اور شعر بھی ایسے کہ سُنیئے تو وجد کرنے کا جی چاہے،

اس صحبت کا ذکر نا تمام رہے گا اگر میں حکیم صاحب کے بارے میں کچھ عرض نہ کروں، بڑے حاضر جواب ہیں، شگفتہ مزاج ہیں، سخن سنج ہیں، سخنداں ہیں، ذہین ہیں، ذکی ہیں، عربی، فارسی، اور اردو کا بڑا ستھرا ذوق رکھتے ہیں، نثر کا بھی، اور نظم کا بھی، ہزارہا اشعار یاد ہیں، اور موقع موقع سے ان کا استعمال بھی کرتے ہیں، خود جتنے دلکش ہیں باتیں بھی اُتنی ہی دلآویز ہوتی ہیں، یہ سب خصائص وہ ہیں جن سے ان کے دوست اور ادا شناس اچھی طرح واقف ہیں، کبھی ان میں سے کسی خصوصیت کا ذکر ہو، تو ہر شخص اعتراف کرے گا چونکے گا نہیں!

لیکن اس مجلس میں حضرت صاحب کے دوش بدوش حکیم صاحب نے بیدل، صائب، اور دوسرے بلند پایہ شعراء کے استادانہ اور عارفانہ اشعار سنانے کا جو سلسلہ شروع کیا ہے تو اگرچہ وقت کی برق رفتاری جاری تھی، لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا، چلتے چلتے دفعتہً یہاں آکر وقت رک گیا ہے، اور اشعار سننے میں اتنا محو ہے کہ اپنی چال بھی بھول گیا، اور گردش بھی!——

خود حضرت صاحب کا یہ عالم تھا کہ لطف لیتے لیتے اور داد دیتے دیتے تھکے جاتے تھے!

کراچی میں ایسی دلچسپ اور یادگار صحبتیں شاذ و نادر ہی میسر آتی ہیں لیکن جب کبھی میسر آتی ہیں تو زیادہ تر حکیم صاحب

ہی کے دم سے، ان کے اس ذوق، اور افتاد طبیعت کو دیکھ کر صرف ایک ہی بات کہی جا سکتی ہے،

بہ کلام بیدل اگر رسی، مگذر ز جادۂ منصفی
کہ کسے نمی طلبد ز تو، صلۂ دگر ــــ گر آفریں

وہ ــــ اور ــــ ہم!

مُسلم کنونشن ــــ اور ہندو کانگرس

ان دنوں مشرقی پاکستان میں صوبائی اسمبلی کے انتخابات ہو رہے ہیں، اس میں تمام ہندو، اور اچھوت نشستوں پر کانگریس کے ٹکٹ پر انتخاب لڑے جا رہے ہیں، یہ کانگرس مشرقی بنگال کی مشہور و معروف متعصب ہندو مہاسبھا کا دوسرا نام ہے، یہ مسلمہ طور پر قیام پاکستان کے خلاف تھی، اور اب بھی اس نے پاکستان کا حق نمک اپنے کسی کارنامے سے ادا نہیں کیا، یہ جماعت ہندو اقلیت کے تحفظ سے زیادہ سیاسی ہے، اور اس کا خاص مقصد تمام ایسے حالات کو سازگار بنانا ہے کہ مشرقی بنگال متحدہ بنگال کا جزو ہو جائے، اور پاکستان میں شامل نہ رہے لیکن ان خطرناک عزائم اور خطرناک حالات کے باوجود حکومت پاکستان نے آج تک ہندوؤں کی واحد مسلمہ تنظیم کانگریس کو خلاف قانون قرار نہیں دیا، اور نہ کسی ایک کانگریسی کو شہری حقوق سے محروم کیا، اور نہ ان کے خلاف کسی طرح کی بدگمانی یا بدکلامی کی۔

مشرقی بنگال کا ہر کانگریسی ہندو آزاد ہے، اپنے پروپیگنڈے میں آزاد ہے، اور انتخابات لڑنے کے لئے اپنی تنظیم میں آزاد ہے، خود مشرقی بنگال اور پاکستان پارلیمنٹ میں ہندوؤں نے جو اپوزیشن پارٹی قائم کر رکھی ہے، وہ کانگریس کے نام سے ہے، حالانکہ ہندوستان میں کانگریس نے جس عظیم پیمانے پر مسلم کشی کی، اور اب بھی کر رہی ہے، اس کی بنا پر ایک ایک پاکستانی کو اس دشمن جماعت سے نفرت ہے، مگر پھر بھی پاکستان میں حکومت کی طرح عوام بھی اور اخبارات بھی، اور سیاسی لیڈر بھی اس قدر فراخ دل ہیں کہ وہ کانگریس کے وجود اور اس کی سرگرمی پر کبھی معترض نہیں ہوئے، اور کہیں سے ہندوؤں کی اس سیاسی شر انگیز تنظیم کے خلاف آواز بلند نہیں ہوئی، بلکہ ان ہندوؤں کو جو ابھی تک کانگریس کے زہریلے اثر سے آزاد نہیں ہوئے ہیں اکثریت میں ضم کرنے کے بجائے جداگانہ ووٹ اور جداگانہ سیٹ دی گئی، اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ان کو اپنے فرقے کی تنظیم باقی رکھنے اور اپنے قومی جذبات کے اظہار کا موقع دیا گیا،

اس کے برعکس ہندوستان میں سب سے پہلے مسلمانوں سے جداگانہ ووٹ اور جداگانہ حلقۂ نمائندگی کا حق چھین لیا گیا، ہندوستان کی مرکزی پارلیمنٹ اور تمام صوبوں میں مسلمان اپنی آبادی کے تناسب سے بھی نمائندے منتخب نہیں ہو سکے، اور ان پر جمہوریت اور لادینی کے نام پر ایک ایسا آئین مسلط کر دیا گیا ہے جس میں اس بات کا امکان غالب ہے کہ مستقبل قریب میں کوئی مسلمان کسی صوبے میں کبھی بھی نمائندہ بن کر نہ آسکے، اور پھر یہ شرمناک سیاسی قتل قانونی بھی ہے اور جائز بھی۔

گویا پاکستان کے "قابل نفرت" قانون و آئین میں لازماً ہندوؤں کو (۱) اپنی آبادی کے تناسب سے نشستیں ملیں گی، (۲) جداگانہ ووٹ ملے گا (۳) جداگانہ حلقۂ نیابت ملے گا، یعنی پاکستان کے ہندو از روئے آئین لازماً حکومت کے جزو رہیں گے، اور کسی بھی اختلاف خیال کی بنا پر ان کو ارکان حکومت بننے سے روکا نہ جا سکے گا، لیکن ہندوستان کی صد قابل تعریف لادینی حکومت میں مسلمانوں کو یہ تینوں حقوق حاصل نہیں، اور وہ بہ آسانی حکومت میں اپنی معمولی اور غیر اہم نمائندگی بھی کھو دیں گے۔

اب دنیا سے پوچھو کہ نعرہ باز نہرو کا مسلم کش دستور صحیح جمہوریت ہے یا خاموش اور شرمیلے پاکستان کا وہ مسلم دستور، جو

ہندوؤں کو پاکستان میں دائمی سیاسی زندگی بخش رہا ہے۔

اب طرزِ عمل کے فرق کا بھی ایک نمونہ دیکھئے کہ پاکستان میں کہیں کوئی ہندو مسلم فساد نہیں ہوتا، اور کہیں کوئی ہندو مسلم عوام کے ہاتھوں قتل نہیں ہوتا، لیکن ہندوستان میں ہر سال، بلکہ ہر ماہ کتنے ہی بے قصور اور بے سہارا مسلمان بے درد ہندو عوام کے ہاتھوں قتل ہوتے رہتے ہیں، اور حکومت مسلمانوں کے تحفظ کے لئے کچھ نہیں کر سکتی۔

دونوں حکومتوں میں اقلیت کے ساتھ نمایاں اور امتیازی فرق کی تازہ ترین مثال اگر کسی کو دیکھنا ہو تو وہ اُس سلوک کو دیکھے جو آج ہندوستان میں مختصر سی مسلم تنظیم یعنی آل انڈیا مسلم کنونشن علی گڑھ کے لیڈروں اور خود اس جماعت کے ساتھ کیا جا رہا ہے، پاکستان میں ہندوؤں کو، بدھوں کو، عیسائیوں کو، پارسیوں کو، الغرض ہر فرقے کو مکمل آزادی حاصل ہے، سب کی اپنی جداگانہ سیاسی تنظیمیں ہیں، مگر کبھی ایک حرف بھی کسی اخبار نے ان پر پاکستان دشمنی کا اعتراض نہیں کیا، اور نہ اقلیت کے کسی لیڈر کو ہندوستان کا جاسوس کہا گیا، نہ کسی کی تقریر ضبط کی گئی، نہ کسی پر مقدمہ قائم ہوا، لیکن یہ غریب ہندستان کی نئی مسلم جماعت جو محض مسلمانوں کے خلاف بے انصافیوں کی شکایت کرنے، اور اپنے ساتھ انصاف کا مطالبہ کرنے کے لئے قائم ہوئی ہے، ہندستان کے لئے ناقابلِ قبول ہے، قابلِ گردن زدنی ہے، ہندستان کا "اقلیت نواز" پریس بحرانی طریقے پر مسلسل گالیاں دے رہا ہے، ہندو جماعتیں مسلم جماعت کے لیڈروں کو پھانسی پر چڑھانا چاہتی ہیں، نہرو، کاٹجو، پنتھ، اور سمپورنانند، پارلیمنٹ اور اسمبلی میں مسلسل تہدید آمیز بیانات دے رہے ہیں،

بدر الدجیٰ نظر بند کر دئے گئے، اسحاق علی مسلسل نظر بندی کے بعد رہا ہوئے تو پھر نظر بند کر دئے گئے، اور اب ان پر بغاوت پھیلانے کے کئی کئی مقدمات چلائے جا رہے ہیں، ایم ایم بشیر بھی جیل میں بند ہیں، ان لیڈروں کی تقاریر بھی ضبط ہیں، اور کنونشن کی تمام کارروائی ضبط قرار پا گئی ہے، خود کاٹجو، اور سمپورنانند نے اعلان کیا ہے کہ وہ مسلم جماعت پر شدید نگرانی قائم رکھیں گے، الغرض جمہوریت پرست نہرو کے ہندستان میں مسلم تنظیم کا کوئی وجود برداشت نہیں کیا جا سکتا۔

یہ حقائق خود بول رہے ہیں، اور دُنیا کے سامنے ہیں،

ایک دلچسپ عصرانہ

جناب عبدالباقی خاں صاحب شروانی نے ۱۹ر فروری کو ملک شریح الدین چیئرمین اسٹینڈنگ کمیٹی کراچی کارپوریشن، مسٹر عرفان اللہ چیف آفیسر اور ڈاکٹر عبدالقدیر چیئرمین ہیلتھ کمیٹی کے اعزاز میں ایک پُرتکلف عصرانہ دیا، حاضرین میں مسٹر توفیق صدر کراچی مسلم لیگ بھی رونق افروز تھے، میر ذوالفقار علی کے حسب ایما حضرت رمزی نے وقت اور موقع کے لحاظ سے ایک معرکۃ آرا نظم پڑھی، جس کی خوب داد دی گئی، ملک شریح الدین کی داد صرف زبانی نہ تھی عملی بھی تھی، اس موقع پر ملک صاحب نے اعلان کیا کہ ڈرگ روڈ کالونی میں کارپوریشن عنقریب ایک مکمل ہسپتال کھول رہی ہے، اس اعلان کا پُرجوش تالیوں سے خیر مقدم کیا گیا۔

ہم اس اعلان کو سراہتے ہیں، لیکن یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ کارپوریشن آبادکاری کے سلسلہ میں بہت کچھ کر سکتی ہے اور یہ واقعہ ہے کہ اس نے اب تک کچھ نہیں کیا ہے، ملک شریح الدین، اور ان کے رفقا اگر کارپوریشن کو آمادۂ کار کر لیں تو یہ ان کا بہت بڑا کارنامہ ہوگا۔

رئیس احمد جعفری
۲۳ر فروری ۱۹۵۴ء

بغیر اعلان!

یہ سید سلیمان نمبر ہے۔

سید صاحب میرے استاد تھے، میرے محسن تھے، میرے بزرگ تھے، کیا میں اتنا بھی نہ کرتا کہ ان کی یاد میں ریاض کا ایک نمبر نکال دیتا؟

یہ نمبر بغیر کسی پیشگی اعلان کے شائع ہو رہا ہے، اعلان سے عمداً گریز کیا گیا۔ میں چاہتا تھا اس نمبر میں صرف وہ احباب لکھیں جو سید صاحب سے شاگردی، دوستی یا رفاقت کا تعلق رکھتے ہوں، ایسے لوگ اعلان پڑھ کر مضمون نہیں لکھتے، ان کا قلم اسی وقت حرکت میں آتا ہے جب دل مجبور کرے، یا کوئی لکھنے پر مجبور کر دے۔

معارف (اعظم گڑھ) بھی سید سلیمان نمبر کی تیاریاں کر رہا ہے، اسے حق ہے کہ وہ اس فرض کو انجام دے اور درحقیقت معارف کا یہ نمبر خاصہ کی چیز ہوگا۔ میں نے بزرگان دار المصنفین کو عمداً بزم ریاض میں شرکت کی دعوت نہیں دی، ورنہ مجھے یقین تھا کہ مولانا مسعود علی ندوی، برادر محترم مولانا معین الدین ندوی اور دوسرے احباب میری درخواست ضرور قبول فرماتے۔ ریاض کا یہ نمبر زیادہ تر سید صاحب کے شاگردوں یا شاگردوں کے شاگردوں کی سعی و محنت کا نتیجہ ہے۔ برا بھلا جیسا کچھ ہے حاضر ہے، گو جانتا ہوں حق ادا نہیں ہو سکا۔

مور ضعیف و ملک سلیمان ذی حشم!

موجودہ حالات میں پاکستان میں کاغذ کا حاصل کرنا، جوئے شیر لانے سے کم نہیں، صرف دو ہی صورتیں ممکن ہیں پرمٹ یا بلیک مارکٹ، پہلی آسان ہے لیکن عسیر الحصول، دوسری دشوار ہے لہٰذا استطاعت سے باہر، مجبوراً حالات کے سانچے میں ڈھلنا پڑا، اور یہ جتنی ضخامت کا بھی ہو سکا اسی پر قناعت کرنا پڑی۔ اگرچہ

بقدر ذوق نہیں ظرف تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لیے

ریاض کی تاریخ اشاعت بدل رہی ہے، اب تک یہ ہر مہینے کی ۲۰ تاریخ کو شائع ہوتا رہا ہے، اب میری کوشش ہے کہ ہر مہینے کی پہلی یا دوسری کو، وہ ڈھاکہ اور لائل پور کے قارئین تک پہنچ جائے، گزشتہ ایک سال میں ہر طرح کی مشکلات و موانع کے باوجود ایک دن بھی پرچہ لیٹ نہیں ہوا، اب بھی میری کوشش یہی ہوگی۔ خدا کامیاب کرے۔

رئیس احمد جعفری
23.2.54

بزمِ ریاض

حمیدیہ باغ خورجہ (یو۔پی)
۵ جنوری ۱۹۵۴ء

عزیز من زاد لطفہٗ سلام مسنون

آپ کا دلاویز مکتوب مورخہ ۲ اکتوبر مل گیا تھا، رسالہ بھی، شکر گزار ہوں۔ دونوں کی رسید آج تین ماہ کے بعد بھیج رہا ہوں۔

میرا ایک شعر ہے

روپوش ہے پلنگ بھی ہے اور کفن بھی ہے
سب کچھ وہاں پہ رہتا ہے دار و رسن کے ساتھ

اگر یہ سب آپ کے پاس ہوں تو ان سب کا اگر کوئی مستحق ہے تو وہ میں ہی ہوں، اور آپ کو کامل طور پر اختیار ہے کہ ان کو اس گناہ کی پاداش میں زیرِ کار لے آئیں۔

اب چوہتر سال کی عمر ہے اور لکھنے پڑھنے کو جی نہیں چاہتا، شوکت بھائی کے متعلق بہت کچھ لکھ سکتا تھا مگر پرانی باتیں یاد کرنے سے قلبی تکلیف ہوتی ہے۔

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد   پر طبیعت ادھر نہیں آتی

اس زمانہ میں ایک دیوانی کے مقدمہ میں پھنسا رہا، جس کا سلسلۂ لامتناہی ابھی تک چل رہا ہے اسی پریشانی کی وجہ سے جواب میں اتنی تاخیر ہوگئی۔ خدا کے لئے آپ معاف کر دیں۔

خدا کرے آپ بخیر و عافیت ہوں، والسلام۔

نیاز مند
(میجر) سعید محمد خاں

:(۲):

بارڈنگ روڈ، لکھنؤ، ۱۶/۱/۵۴ء
اخی فی الدین

السلام علیکم: نقد بر سود در جیب زباں اندوختہ" مجکو تو اس غم کے طفیل ایک مسرت یہ حاصل ہوگئی کہ مدت دراز کے ایک آزردہ دینی بھائی کے خطاب سے مشرف ہوگیا۔

باقی امتثال امر کے متعلق اس کے سوا کیا عرض کروں کہ اکثر دوستوں کی طرح آپ بھی اس غلط فہمی میں مبتلا نکلے کہ میں کوئی ایسا صاحب قلم آپ حضرات کا ہوں کہ مختلف و متنوع چیزوں پر رسائل کے لائق کچھ نہ کچھ برداشتہ لکھ دے سکتا ہوں، بھائی! میرا علم و قلم دونوں بہت ہی محدود ہیں، آپ یقین نہ فرمائیں گے کہ ایک کارڈ بھی قلم برداشتہ نہیں لکھ پاتا ہوں

بس بے تکلف وقتی طور پر کسی بات کی آمد ہو گئی تو قلم پر بھی آجاتی ہے، صدق میں چند سطریں سید صاحب قبلہ سے متعلق ایسے ہی وقتی تاثر کی تھیں، اس کے بعد پھر شاہ معین الدین صاحب کے معارف کے خاص نمبر کے لئے تین تین خط آچکے، خود آئے، زبانی اصرار فرمایا، مگر اب تک طبیعت پر زور دینے سے بھی ایک سطر نہیں لکھ سکا، آورد پر اور بھی قدرت نہیں آمد کا منتظر ہوں۔

ایک اور بات بھی آپ سے کیوں چھپاؤں، تو ہب ہمیشہ سے غالب ہے، نہ کبھی تیجے چالیسویں کی رسوم سمجھ میں آئیں نہ اب یہ "ماڈرن" رسمیں سمجھ میں آتی ہیں، اس سے زیادہ اس معاملہ میں کسل کر آپ کو اپنی دقیانوسیت و رجعت پر ماتم یا مضحکہ کا موقع کیوں دوں! والسلام

دعاجو احقر العباد

(پروفیسر) عبدالباری (ندوی) غفرلہ

——:(۳):——

۳۸ - امین آباد پارک

لکھنؤ ۱۸/۱/۵۴

محترم و مکرم السلام علیکم

آپ کا پیغام پہنچا تھا، سید صاحب مرحوم پر تو وہ لوگ لکھیں گے جو ان کے ہم عصر یا ان سے براہ راست قربت رکھنے والے ہیں/- بدقسمتی سے میرا شمار ان دونوں میں سے کسی میں بھی نہیں —— ہاں وہ میرے استادوں کے استاد تھے، اسی وجہ سے انہیں اپنا استاد سمجھتا تھا، اور اس پر فخر کرتا تھا، اور اسی بنیاد پر ان کی خدمت کرنے کی ہمت کر سکا ہوں —— گر قبول افتد،

بریدِ فرنگ" سے سید صاحب مرحوم کے ہی الفاظ میں ان کا سفرنامہ یورپ مرتب کیا ہے/ انگریزی لٹریچر میں تو "مصنف کے الفاظ میں مصنف کی کتاب کا خلاصہ کرنا" بہت رائج اور عام ہے، لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں اردو ادب میں میری یہ کوشش ان کوششوں کی صف میں رکھی جائے گی جو "پہلی" کہلانے کی مستحق ہوتی ہیں۔

اس جرأت بے جا کو دیکھئے کہ (حفاظت کے خیال سے) خط بیرنگ بھیج رہا ہوں، اگر مضمون آپ کو پسند آیا تو خالق بیاتی زبان میں/ مری محنت از آپ کے پیسے دونوں ٹھکانے لگ گئے —— ورنہ بلا تکلف بیرنگ ہی واپس کیجئے گا تاکہ اپنی اس حرکت کا خمیازہ میں بھی کچھ برداشت کر سکوں۔

بہر صورت رسید کا منتظر رہوں گا فقط والسلام

نیاز کیش

مشیر الحق بجری آبادی

——:(۴):——

محترمی، سلام و رحمت۔

لفافہ ملا، یہ کیسے ممکن ہے کہ جعفری جعفر سے مقالہ مانگے اور وہ نہ پہنچے، ؟ لیکن ہوا یہ کہ آپ سے چند روز پہلے نورچشم حسن مثنیٰ سلمہ اللہ تعالیٰ کا خط اسی مضمون کا آگیا تھا، اس لئے آج ان ہی کے نام سے مطلوبہ مقالہ بذریعہ رجسٹری بھیج رہا ہوں، ان کی نظروں سے پہلے یہ گزر جائے تو بہتر ہے۔ بحمد اللہ مع الخیر ہوں خدا کرے سب مع الخیر ہوں آمین۔ والسلام

محمد جعفر پھلواروی ندوی

۲۰/۱/۵۴

—— (۵) ——

فرنگی محل ۲۷ جنوری ۱۹۵۴ء

مولانا العزیز السلام علیکم

الحمد للہ علالت اور ضعف بصر کے باوجود میں آپ کی فرمائش پوری کر رہا ہوں، خدا کرے آپ کو پسند بھی آجائے، ابھی چند منٹ کے بعد مضمون اور نظم بھیج رہا ہوں رسید سے دل شاد کیجئے۔

آپ سے نصف ملاقات نے آپ کے دیدار کا اور مشتاق بنا دیا ہے، میری دلی دعائیں آپ کے لئے ہیں، انشاء اللہ آپ آئندہ بھی مجھے اس قسم کی خدمتوں کے لئے تیار پائیں گے، خدا آپ کو خوش رکھے۔ والسلام

فقیر شہید انصاری

—— (٦) ——

فرنگی محل ، ۲۷ جنوری ۱۹۵۴ء

مولانا العزیز السلام علیکم

کئی بیماریوں کے علاوہ آنکھوں میں پانی آرہا ہے، اس لئے آپ کی فرمائش پوری کرنے کے لئے اپنے شاگرد سے کتابت میں مدد لے رہا ہوں، لفظی غلطیوں اور کتابت، کی خامیوں کا خطرہ ہے اس لئے آپ کو پوری بے تکلفی سے اس میں محو و اثبات کا حق دیتا ہوں، اور سب سے پہلے تو میں آپ کی یاد آوری اور فرمائش کا اس لئے شکریہ ادا کروں گا کہ اس کی بدولت میں ایک اس فرض سے سبکدوش ہو رہا ہوں جس کو ادا کرنے کا جی چاہتا تھا، مگر علالت کی وجہ سے ادا نہ کر سکا تھا، اور سچ یہ ہے کہ اگر آپ کا ایسا محبوب مجھ سے یہ سطریں لکھنے کو نہ کہتا تو میں انہیں نہ لکھ سکتا،

اس کے قبل جب میں ڈھاکہ میں بغرض تبدیل آب و ہوا مقیم تھا، مولانا شوکت علی المرحوم پر آپ نے مجھ سے مضمون مانگا تھا، یہ خط مجھے تین مہینے کے بعد لکھنؤ آکر ملا، اس لئے بطور جرمانہ 'اپنی طرف' سے آپ کی فرمائش کے بغیر' میں ایک نظم بھی بھیج رہا ہوں۔

اس نیاز نامے کے پہنچنے کی اطلاع مجھے فوراً دے کر میری دعائیں لیجئے، خدا شاہد ہے کہ آپ کی کامیابیوں کا حال سُن سُن کر میں بہت خوش ہوا کرتا ہوں، اور آپ کے لئے دعائے ترقیات کرتا ہوں، والسلام

فقیر شہید انصاری

—— (۷) ——

باسمہ سبحانہٗ

مکرمی ! سلام مسنون !

رسید گرامی نامہ ڈاک ... پیش کر چکا ہوں، اللہ کا احسان ہے ایفائے وعدہ بھی میعاد کے اندر کر رہا ہوں، اس زمانہ میں مطبوعات موقتہ بالعموم اغلاط سے بھرے رہا کرتے ہیں، اور مدیران کرام کو مطلق احساس نہیں معلوم ہوتا، مسودہ سابقہ نیز منسلکہ اگر صرف رحم و کرم کاتب پر چھوڑے گئے تو اور فرمایئے کہ مجھے آئندہ کے لئے سوائے معذرت کوئی چارہ نہ ہوگا۔

آئندہ اختیار بدست مختار !

ننگ نام

سید حسن امام عفرلہ

(۸)

لکھنؤ ۵ فروری ۱۹۵۴ء

برادر مکرم السلام علیکم ورحمۃ اللہ

میرے دوران سفر میں آپ کی طرف سے دو خط آئے، کل ۲۸ر جنوری کو واپس ہوا تو دونوں ملے، آپ کو جواب کا انتظار ہوگا، چونکہ ایک جگہ قیام نہ تھا، اس لئے ڈاک بھیجی نہ جا سکی۔

"ریاض" کا سلیمان نمبر نکالنا ضروری تھا، اور بالکل برمحل، آپ کی یہ دعوت بھی بجا ہے کہ یہ ناچیز بھی اس بزم میں شریک ہو، لیکن فروری کے وسط تک بجد مشغول ہوں، ۹ر فروری تک لکھنؤ سے باہر رہوں گا، پھر بھی شاید جلد کچھ لکھنے کے قابل نہ ہو سکوں اس لئے مضمون پیش کرنے سے تو بالکل قاصر ہوں، البتہ سید صاحب کے خطوط جو اس ناچیز کے نام ہیں آپ کی طلبی پر بھیجے جا سکتے ہیں۔ جلسہ کی روداد البتہ بھیجدی جائے گی، میں نے مولوی عبداللہ صاحب ندوی کو تاکید کی ہے کہ وہ مفصل لکھ کر آپکو بھیجدیں، امید ہے کہ آپ کو پہنچ جائے گی۔

ریاض کی سیر کبھی کبھی ہو جاتی ہے، اللہ اس کو سدا بہار رکھے۔ آپ کی یاد آوری سے مسرت و عزت حاصل ہوئی۔

آپ کا

(مولانا ابوالحسن) علی (ندوی)

(۹)

دریاباد ضلع بارہ بنکی

۱۴ر فروری ۱۹۵۴ء

عزیزم! وعلیکم السلام

بحمداللہ اب اچھا ہوں — کھانسی سے، البتہ گلوخلاصی پوری طرح نہیں ہوئی ہے،

مقالہ سید صاحب بہ حیثیت ایڈیٹر اسی وقت "صدق" کو دے چکا تھا، (نیا مقالہ لکھنا علالت کے باعث) ممکن نہ تھا، ورنہ پہلے "ریاض" کی نذر کر دیتا۔ والسلام

دعاگو

عبدالماجد

(۱۰)

شبلی ہوسٹل، بادشاہ باغ، لکھنؤ

۱۴ر فروری ۱۹۵۴ء

برادر مکرم زاد مجدہٗ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

میں دو ماہ کے بعد دارالعلوم حاضر ہوا، آپ کا گرامی نامہ مورخہ ۱۵ر جنوری ۵۴ء ملا، تعمیل حکم میں دیر بہت ہو گئی ہے، مگر یہ تاخیر غیر اختیاری تھی، بہرحال جلدی میں جو کچھ لکھ سکا، پیش خدمت ہے، رسید سے مطلع فرمایئے گا تاکہ اطمینان ہو۔

اب انشاءاللہ ۱۰ر مارچ تک ندوہ میں قیام رہے گا، آپ کا سواد تحریر عرصہ کے بعد دیکھنے میں آیا، گاہے گاہے خیریت مزاج سے سرفراز فرماتے رہیں۔

آپ کا خادم

(مولانا محمد) اویس (ندوی)

(باقی صـ۲۹ پر)

سیّد الملّت رح کی مکتبی زندگی

مناظر احسن گیلانی

جیسا کہ معلوم ہے، علامہ سید سلیمان ندوی غفر اللہ لہ صوبۂ بہار کے مشہور و معروف قریۃ السادات والملوک دسنہ[1] نامی میں پیدا ہوئے، یوں تو سادات کرام کے موطن و مسکن ہونے کے بعد اطراف و نواح کی ممتاز بستیوں میں دسنہ بھی شمار ہوتا رہا، عموماً اہل علم و صاحب دل بزرگوں کو ہر زمانہ میں اس بستی میں ہم پاتے ہیں، مولٰنا مصطفٰی شیر تقریباً سو سال پہلے ایک مشہور عالم دسنہ میں گذرے ہیں، شیر شاہ کی خواب گاہ سہسرام (بہار) کے قدیم اسلامی مدرسہ میں صدارت کی خدمت کافی مدت تک وہ انجام دیتے رہے، ان ہی مولٰنا مصطفٰی شیر کے تلمیذ رشید مولٰنا الحاج سید یعقوب رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے، جو اپنے علم اور اخلاص کی وجہ سے نفوس طیبہ میں شمار ہونے کا بجا استحقاق رکھتے ہیں، بادبانی جہاز سے کلکتہ و چٹگانگ حج و زیارت کی سعادت سے سرفراز ہونے کے بعد واپسی کے وقت ٹھیک جب بہار اپنے وطن میں ان کی کشتی مقام باڑھ کے قریب گنگا میں چل رہی تھی، تو اچانک اپنی زوجۂ محترمہ سے، جو سفر حج میں ہمراہ تھیں یہ فرمانے لگے کہ

" دیکھو ! میں بہشت کا مشاہدہ کر رہا ہوں"

یہ کہتے ہوئے گنگا میں کود پڑے، یہ جگہ گنگا کی ایسی تھی جہاں سے ڈوبنے والوں کو ہاسانی نکال لیا جاتا ہے، کوشش کا کوئی

---

[1] دسنہ کو بعض لوگ دیسنہ بھی لکھتے ہیں لیکن عام طور پر تلفظ یہی اس کا دسنہ ہی کیا جاتا ہے، اور لکھنے والے املا بھی اس لفظ کا دسنہ کی شکل میں کرتے ہیں، خود سید صاحب کے قلم سے "دیسنہ" یعنی یا کے اضافہ کے ساتھ میری نظر سے گذرا ہے، شرفاء دسنہ کی موجودہ آبادی کی ابتدا اس مقام پر کب ہوئی یہ کہنا تو مشکل ہے لیکن مشہور یہی ہے کہ یہاں کے سادات دو ماںجائی سید بھائیوں کی اولاد ہیں جن میں ایک صاحب کا نام سید صدرالدین اور دوسرے بزرگ کا نام سید محمد جان تھا، اول الذکر کے غیر معمولی دینی حالات سے متاثر ہو کر بیان کیا جاتا ہے کہ بہار کے حاکم نے دلّی سے جاگیر کا فرمان حاصل کر کے ان کی خدمت میں اس کو پیش کیا۔ سید صاحب ممدوح نے اس شاہی عطیہ کو قبول نہ فرمایا، سید جان محمد صاحب جو اس وقت موجود نہ تھے، انکو جب اسکی خبر ملی تو اپنے بڑے بھائی کے اس طرز عمل پر افسوس کر چکنے کے بعد حکومت میں دوبارہ کوشش کر کے فرمان کو حاصل کیا۔ اس فرمان کے رو سے کچھ زمین موضع دسنہ میں اور کچھ دوسری جگہ جاگیر میں داخل ہوئی، سید جان محمد صاحب نے اگرچہ یہ جاگیر اپنی کوشش سے حاصل کی تھی، لیکن اپنے بڑے بھائی کی اولاد کو بھی برابر کا شریک قرار دیکر جاگیر کو دونوں بھائیوں کی اولاد پر تقسیم کر دیا، سید جان محمد کے نام طرف سے ایک زرعی قطعہ "چک جان محمد" کے نام سے ساحل گنگا کے کنارے تال نامی علاقہ میں اب تک کہتے ہیں کہ موجود ہے، دسنہ کے سادات اس وقت ان ہی دونوں بزرگوں کی اولاد ہے، دسنہ کے زرعی قطعات جو عامہ یا ائمہ کے نام سے موسوم ہیں یہ شاہی جاگیر کا وہی حصہ ہے جو فرمان شاہی سے ملا تھا، واللہ اعلم بالصواب، میں نے سادات کے ساتھ "الملوک" کے لفظ کا اضافہ جو کیا ہے اس سے مراد یہی ہے کہ سادات کے ساتھ طبقہ شرفا میں کافی تعداد ان لوگوں کی بھی دسنہ میں آباد ہے جو اپنے آپ کو "ملک" کہتے ہیں۔ ملک شرفاء بہار کا کافی سربرآوردہ طبقہ ہے ان کی مستقل آبادیاں اس صوبہ میں پائی جاتی ہیں، ان میں بعضوں کا دعویٰ تو یہی ہے کہ وہ بھی خانوادہ سادات ہی سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن بعض لوگ شکل و صورت رنگ روپ، انکی صفات مردانہ کی بنیاد پر ان کو "ترک" قرار دیتے ہیں نظریہ ان کا یہ ہے کہ فاتح بہار ملک محمد بن بختیار خلجی کے ساتھ یہ لوگ بہار میں داخل ہوئے، ملک کا لفظ سپہ سالار کے نام کا جیسے جزء تھا اسیطرح دوسرے ترکی خلجی امراء بھی اسی خطاب سے مخاطب تھے، موروثی طور پر یہی خطاب نسلاً منتقل ہوتا چلا آرہا ہے بہرحال یہ ایک ایسی بحث ہے جس کا قطعی فیصلہ مشکل ہے اور دین کی راہ میں جب فلاں بن فلاں چیزے نیست" کا اصول تسلیم کر لیا گیا ہے تو اس قسم کی باتوں میں زیادہ کد و کاوش کی ضرورت نہیں کل امرء بما کسب رہین یہی نفوس قرآنی حقیقت ہے۔

دقیقہ اٹھا نہ رکھا گیا، جال مہاجال بڑے بڑے ماہرین نے ڈالے، میلوں کے طول و عرض میں پتہ چلایا گیا، لیکن مولٰنا یعقوبؒ کی لاش کے برآمد کرنے میں لوگ کامیاب نہ ہو سکے، "خبرش باز نیامد" کی خبر مشہور ہو گی، خود ہمارے سید الملت رحمۃ اللہ علیہ جو سید صدرالدین کے خاندان کی ایک شاخ میں پیدا ہوئے تھے، عموماً اہل علم و فضل تقوٰی و دیانت اس شاخ میں مسلسل پیدا ہوتے چلے آرہے تھے، سید الملت کے والد ماجد مولانا حکیم سید ابوالحسن حاذق طبیب ہونے کے سوا اپنے وقت کے عارف وکاسب بزرگ تھے، وجد و حال میں کبھی کبھی ان کی باطنی کیفیت، جس کے اخفا کی کوشش فرماتے تھے نمایاں ہو جاتی تھی، برادری میں شادی تھی، رخصتی کے وقت مشہور روداعی گیت لونڈیاں گارہی تھیں، حکیم صاحب ممدوح مسجد میں تھے، بیان کیا جاتا ہے کہ سمع مبارک میں گیت کے چند الفاظ پہنچ گئے، ایک ایسا حال ان پر طاری ہوا کہ مسجد کی دیوار پہ سر دے مارا جس سے خون جاری ہو گیا۔

حکیم سید ابوالحسن صاحب مرحوم بہار کی ایک اسلامی ریاست اسلام پور کے دربار کے طبیب تھے، ان کے والد یعنی سید الملت کے جد امجد جن کا اصلی نام تو محمد شبیر تھا لیکن عام طور پر "حکیم محمدی" کے نام سے مشہور رہے، اور طبابت ہی کا مشغلہ فرماتے تھے، ان ہی حکیم محمدی صاحب کے ایک بھائی مولٰنا مصطفٰے شبیر تھے جن کے متعلق عرض کر چکا ہوں کہ عربی و اسلامی علوم کی قدیم تعلیم گاہ سہسرام میں جو تھی اس کے صدر مدرس تھے، تیسرے بھائی کا نام باقر شبیر تھا، ان کے خاندان بھی عام علمی ذوق کے ساتھ طب میں بعضوں نے خاص شہرت حاصل کی، اور اس زمانہ میں بھی بمبئی یونیورسٹی میں پروفیسر سعید رضا ندوی اپنے خاندانی اعزاز کی نمائندگی فرماتے ہیں۔

خود سید الملت کے بڑے بھائی مولٰنا حکیم ابوحبیب بھی دسنہ کے مشہور طبیبوں میں تھے، اور ان کی باطنی نسبت کے متعلق میں نے جو کچھ سنا ہے وہ تو ایک مستقل داستان ہے، بھوپال کے ایک نقش بندی شیخ طریقت شاہ ابواحمد رحمۃ اللہ علیہ سے وہ بیعت ہی نہ تھے بلکہ نقش بندی سلسلہ کے مجاہدات و ریاضات میں جو محنتیں انہوں نے برداشت کیں ہم تو شاید ان کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ان کا یہ ایک معمولی مجاہدہ تھا کہ جہاز سے اترنے کے بعد حج و زیارت کا سارا سفر پیادہ پا پورا فرمایا تھا، حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے مکتوبات کے تو عاشق زار تھے، خاکسار سے ایک دفعہ فرمانے لگے کہ "مکاتیب طیبہ" کے خاص پہلوؤں پر میں نے کچھ لکھا بھی ہے، لیکن افسوس کہ وہ شائع نہ ہو سکا، حکیم ابوحبیب صاحب ہی کے صاحبزادے مولٰنا ابوظفر ندوی ہیں، جو اپنے بلند پایہ تصنیفات مثلاً تاریخ سندھ و گجرات، اور اپنے تحقیقی مقالات کی وجہ سے ملک میں کافی روشناس ہیں۔

ان بزرگوں کے سواد سنہ میں پہلے بھی اور اس وقت تک اسلامی و دینی علوم کے بھی، اور جدید مغربی یونیورسٹیوں کے بھی کافی فضلاء ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ہیں، اپنی طالب علمی کے زمانہ میں مجھے یاد آتا ہے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں جب حاضر ہوا تھا تو معلوم ہوا کہ اس وقت ندوہ کے دارالعلوم میں دسنہ کے طالب علموں کی تعداد سترہ تک پہنچ چکی تھی جن میں ایک پروفیسر نجیب اشرف سلمہ اللہ تعالٰی بھی تھے، اس وقت شائد نو دس سال سے زیادہ ان کی عمر نہ ہوگی، اب تو ماشاء اللہ اردو زبان کے مستند اساتذہ و مصنفین میں شمار ہوتے ہیں، بارک اللہ فی عمرہ وعلمہ، پروفیسر سعید رضا بھی اسی زمانہ میں زیر تعلیم تھے، سید الملت رح فارغ ہونے کے بعد درس اور رسالہ الندوہ میں مضمون نگاری کے کاروبار میں مشغول ہو چکے تھے، علاوہ ندوہ کے ٹونک جہاں خاکسار نے اپنی تعلیم کی پہلی منزل گزاری، وہاں بھی بہاری طلبہ میں دسنہ ہی کے چار چار طلبہ تھے جن میں مولٰنا سید عبدالسبحان سابق استاذ مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ نے خاص امتیاز حاصل کیا، آج کل تصوف و عرفان کی منزلوں کے طے کرنے میں مشغول ہیں، ان ہی کے منجھلے بھائی مولوی حکیم عبدالسلام تو بجائے دسنوی کے مستقلاً سالہا سال سے دہلوی بن چکے ہیں۔

ہرحال ان مختلف شخصیتوں کے علاوہ آج سے چالیس پینتالیس سال پہلے دسنہ میں اردو کی لائبریری انجمن الاصلاح کی طرف سے جو قائم کی گئی تھی رفتہ رفتہ بہ تدریج کتابوں، رسالوں، پرانے اخباروں کا ایک ایسا نادر ذخیرہ ہزارہا ہزار کی تعداد میں اس لائبریری میں جمع ہوگیا ہے جو مجموعی حیثیت سے شائد سارے ہندستان میں اپنی آپ نظیر ہے، اردو کا کوئی کتب خانہ اس ذخیرے کو میرا خیال تو یہی ہے کہ مشکل ہی سے پیش کرسکتا ہے، پچھلے دنوں عمر خیام کے رباعیات کے ایک خاص مخطوطہ کی وجہ سے اس لائبریری کا ذکر یورپ و امریکہ کے اخباروں میں بھی کیا گیا تھا، یہ لائبریری مستحق ہے کہ حکومت اس کے غیر معمولی سرمایہ کی حفاظت کا انتظام کرے، سچ تو یہ ہے کہ یورپ و امریکہ میں اگر یہ لائبریری ہوتی تو خدا ہی جانتا ہے کہ ملک اور حکومت کی طرف سے اس کی قدر افزائیوں میں کیا کچھ نہ کیا جاتا، کتب خانہ کے قیام میں جن لوگوں کی غیر معمولی دلچسپیوں نے کام کیا ہے ان کے نام سنہرے حروف میں لکھے جاتے، کچھ بھی ہو، اس سلسلہ میں مولوی ابوالکمال مولوی سید عبدالحکیم صاحب قبلہ کی شخصیت ایک تاریخی شخصیت بن چکی ہے[1]

بہرحال عرض یہی کرنا چاہتا ہوں کہ جس ماحول میں سید الملت کو ناسوتی وجود بخشا گیا تھا، اس کی خصوصیتوں کا کچھ سرسری اندازہ لوگوں کو ہو جائے، ورنہ تفصیلات کے لحاظ سے دسنہ تو مستحق ہے کہ اس کی مستقل تاریخ لکھی جائے[2]

یہ حسن اتفاق ہے کہ فقیر کا کہفی زاویہ یعنی گیلانی جہاں دُنیا سے واپس ہوکر آخری واپسی کے پیغام کا منتظر ہے، اسی ویرانہ میں آج کل سید الملت مرحوم کے ایک مکتبی رفیق بھی مقیم ہیں، ان کا نام مولوی سید محمد حنیف ہے، مولانا حاجی محمد یعقوب صاحب مرحوم دسنوی جن کا ذکر کر چکا ہوں، ان ہی کے یہ پوتے ہیں دسنہ ہی کے رہنے والے تھے، شادی گیلانی میں ہوئی اسی تقریب سے گیلانی ہی کو مستقر بنا لیا، پریذیڈنسی کالج کلکتہ میں انٹرمیڈیٹ تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد مختارکاری کا امتحان پاس کیا تھا، لیکن اس پیشہ سے طبعی مناسبت نہ تھی، چھوڑ بیٹھے، سید الملت کے فاجعہ وفات کے بعد مولوی حنیف صاحب سے ان کی مکتبی زندگی کے بعض پہلو معلوم ہوئے، اسی کو قلم بند کرکے بھیج رہا ہوں۔

مولوی سید محمد حنیف صاحب کا بیان ہے کہ سید صاحب سے تین چار سال عمر میں اگرچہ وہ بڑے تھے، لیکن کتب خانے میں

---

[1] سید الملت رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق کلی و جزئی معلومات کی فراہمی میں جہاں تک میرا خیال ہے مولوی ابوالکمال عبدالحکیم صاحب سے جتنی مدد مل سکتی ہے، شائد ان معلومات کو دنیا کسی ذریعہ سے حاصل نہیں کرسکتی، کاش ان معلومات سمیٹنے اور مرتب کرنے کا انتظام کیا جائے۔

[2] مجھے یاد آتا ہے، غالباً سید الملت نے خاکسار سے خود ہی تذکرہ فرمایا تھا کہ فارسی زبان میں اپنے مولد و منشا دسنہ کی تاریخ مرتب فرما رہے ہیں میں نہیں جانتا کہ فارسی زبان میں سید صاحب کی یہ کتاب پایۂ تکمیل کو پہنچی یا نہیں، اردو اور عربی کے سوا فارسی میں سید صاحب کی دستگاہ کی شہادت یہی کتاب ادا کرسکتی ہے کاش! ڈھونڈھنے والے ان کے مسودات میں اس کتاب کو یا اس کی یادداشتوں کو تلاش کرتے۔ سید صاحب کا خیال تھا کہ دسنہ جو اس وقت گنگا کی ایک معاون ندی جیران نامی کے مغربی ساحل پر آباد ہے کسی زمانہ میں بودھ مت کے ماننے والوں کی کوئی خاص مرکزی جگہ تھی، کھودنے سے بودھ زمانہ کی بعض چیزیں بھی کہیں کہیں برآمد ہوئی تھیں، دسنہ سے بجانب جنوب میل پون میل کے فاصلہ پر ایک تالاب بھی پایا جاتا ہے، جو دلیپا کے نام سے موسوم و مشہور ہے۔ آج کل دسنہ کے ہم سرحد گاؤں استھانواں کے اراضی میں تالاب داخل ہوگیا ہے۔ ایک گڑھ بھی اسی کے آس پاس دھیم کی شکل میں ہے جسے دیپال راجہ کا گڑھ لوگ کہتے ہیں، دیس کا لفظ سب کے شروع میں ہے۔

ابجد سے فارسی کی عام درسی کتابیں گلستان بوستان وغیرہ تک دونوں نے سالہاسال تک ایک ہی استاذ سے ایک ہی مکتب خانہ دسنہ ہی میں سید صاحب کے گھر پر قائم تھا، دسنہ ہی کے نواح میں اوکھڈی[1] نامی بستی کے ایک معلم جن کا نام مولوی مقصود تھا، ان ہی کا تقرر بچوں کو پڑھانے کے لئے سید الملت کے والد ماجد مولوی حکیم ابوالحسن صاحب مرحوم نے کیا تھا، علاوہ کھانا ناشتہ پان حقہ وغیرہ کے سید صاحب کے گھر سے مولوی مقصود صاحب کو دو روپے ماہوار ملتے تھے، اور جاڑوں کے موسم میں سید صاحب کے والد ماجد جب اسلام پور سے وطن دسنہ میں تشریف لاتے تو مولوی مقصود صاحب کے لئے روئی کا ایک دگلا، روئی بھرا ہوا پائجامہ روئی کا کنٹوپ التزاماً ساتھ لاتے، گویا سرمائی لباس بھی تنخواہ کا ایک جز تھا،

سید الملت کی حیثیت اس مکتب خانے میں گویا شاہ مکتب کی تھی، ان کے سوا دوسرے بچے بھی شرفا دسنہ کے مولوی مقصود صاحب سے پڑھتے تھے، ان کے ہاں سے بھی ماہوار ان کی خدمت میں کچھ پیش کر دیا جاتا تھا، مولوی سید حنیف کے گھر سے ماہوار ایک روپیہ ملتا تھا، عموماً ۸ر اور ۴ر ماہوار کے دینے والے زیادہ تھے، عیدوں کے موقعہ پر بھی مولوی صاحب کو بچوں سے کافی آمدنی ہو جاتی تھی۔

مولوی سید حنیف صاحب کا بیان ہے کہ اس زمانہ میں سید الملت کی تعلیم کا یہ نظم اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے والد ماجد کو اپنے بچے کی تعلیم کا حد سے زیادہ خیال تھا، سید صاحب کے استاذ کی قدر و منزلت کے جو مظاہر ان کی نظروں سے آئے دن گزرتے رہتے تھے ان ہی سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس باب میں سید صاحب کے والد ماجد کا کیا حال اور کیا ذوق تھا۔ کہتے ہیں کہ ایام طفلی ہی سے فطرۃً سید صاحب کچھ خاموش رہنے کے عادی تھے، بچوں کی عام شرارتوں سے ان کی طبیعت کو جبلّۃً کسی قسم کی مناسبت نہیں تھی، اسی لئے شرارت وغیرہ کے قصوں میں مولوی سید محمد حنیف کا بیان ہے، سید الملت تنبیہ کے بہت کم محتاج تھے۔ خود اپنے متعلق بھی ان کا حسن ظن یہی ہے، البتہ اپنی جماعت کے ایک صاحب جنہوں نے بعد کو دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تعلیم حاصل کی، اور لکھنؤ ہی میں طب پڑھ کر مولوی حکیم سید نجم الہدیٰ کے نام سے مشہور ہوئے، الحمدللہ اس وقت تک بقید حیات ہیں، کچھ دن طبابت کا پیشہ ہزاری باغ میں کرنے کے بعد اسکول کے ہیڈ مولوی بن گئے، اور اسی عہدہ سے وظیفہ یاب ہو کر آج کل دسنہ ہی میں خانہ نشین ہیں اور طبابت کی راہ سے اپنے وطن کے باشندوں کی خدمت فرما رہے ہیں۔ العہدۃ علی الراوی (السید محمد حنیف) کہ ساری کمبختی شرارتوں کے بانی مبانی یہی مولوی سید حکیم نجم الہدیٰ ندوی اس سلیمانی مکتب میں تھے، وہی کبھی مشورہ دیتے کہ آج ندی زوروں پر جا رہی ہے چلو! کرتے پائجامے اتار اتار کر کہتے ہیں کہ ساحل کے کرارے سے ہم لوگوں کو ندی میں کود جانے کا حکم دیتے، حکیم صاحب تیرنے سے واقف تھے، اس لئے تیرتے ہوئے وہ دور تک چلے جاتے، اور ہم دونوں (یعنی سید الملت اور مولوی سید حنیف) شناوری سے قطعاً چونکہ نابلد تھے، اس لئے کنارے ہی پر ہاتھ پاؤں پٹکتے رہتے، کبھی حکیم صاحب باغوں کی طرف مکتب کے بچوں کی توجہ منعطف فرماتے، ایک دفعہ اسی سلسلہ میں مولوی سید حنیف صاحب کا بیان ہے، ایک کافی اہم حادثہ بھی پیش آ گیا، بیری کے درختوں پر حملہ کر دیا گیا تھا، ایک چھوکری بیروں کی حفاظت کر رہی تھی، اس نے بچوں کو اس ظلم و تعدی سے روکنا چاہا، حکیم صاحب کو غصہ آ گیا، جیب میں چاقو تھا، غریب چھوکری کے کان پر جسے چلا دیا گیا، غالباً کل یا کچھ حصہ کان کا غائب ہو گیا گاؤں میں اسی واقعہ کی وجہ سے کانی سنّی پھیلی، مقدمہ مولوی مقصود صاحب کے اجلاس میں پیش ہوا، اور

---

[1] دسنہ ضلع پٹنہ کے مشرقی حدود میں واقع ہے، اور اوکھڈی ضلع مونگیر کا گاؤں ہے، یہ بھی سادات بہار کی مشہور و معروف بستی ہے اچھے اچھے اہل علم و فضل یہاں پیدا ہوئے، اور اس وقت تک پیدا ہو رہے ہیں۔ یہاں قدیم عہد کے بعض صاحب دل بزرگوں کے مزار ہیں۔

کھجور کی چھڑی سے ہر ایک پر مولوی صاحب نے حد جاری کی، وہی اس قصے کے بھی راوی ہیں کہ گاؤں کے ایک بوڑھے کہار پر جب کھیت میں رات کو بے چارا قضاء حاجت کے مشغلہ میں مصروف تھا، بچوں نے اس پر ڈھیلے چلانے شروع کئے، جن میں سید الملت بے چارے بھی شریک تھے، کہار نے مولوی صاحب سے شکایت کی، اس جرأت بے جا پر مولوی حنیف صاحب کہتے ہیں کافی مرمت مولوی صاحب کی چھڑی نے کی۔

تعلیم کے ساتھ اخلاقی تربیت پر بقول مولوی حنیف صاحب سید الملت کے والد ماجد ہی کی کافی توجہ تھی، نشست برخاست گفتار رفتار ہر مسئلہ میں دیکھتے رہتے تھے کہ کوئی نامناسب بات بچوں سے سرزد نہ ہو، اس باب میں ان کی نزاکت احساس کا حال یہ تھا کہ دسترخوان پر ایک دن جب سید الملت بھی اپنے پدر بزرگوار کے ساتھ کھانے میں مشغول تھے چباتے ہوئے ہلکی سی آواز بھی پیدا ہوئی، دیکھا گیا کہ بے ساختہ ایک چپت رسید کی گئی، سید صاحب کے والد ماجد کہتے جاتے تھے کہ آدمی کے بچوں کو آدمی کے بچوں کی طرح کھانا کھانا چاہیے کھاتے ہوئے منہ سے آواز تو کتے نکالتے ہیں، والد ماجد کے اسی نقطۂ نظر کی رعایت مولوی مقصود صاحب سید صاحب کے مکتب کے معلم بھی کرتے تھے، سچ تو یہ ہے کہ اخلاق و عادات کے جس شریفانہ معیار کو سید صاحب کی زندگی پیش کرتی رہی، اس معیار کے قائم کرنے میں مکتبی زندگی کی ان کڑی نگرانیوں کو بھی غالباً دخل تھا۔

مکتبی تعلیم کے ان ہی دنوں میں جب طفلانہ بے ضابطگیوں میں سید الملت کی حیثیت مقلّد کی تھی، ایک واقعہ کا تذکرہ مولوی سید حنیف صاحب کرتے ہیں جس میں بجائے مقلد کے امامت کا فرض سید صاحب ہی نے انجام دیا تھا، اس سے ان کے رجحان طبع کا پتہ چلتا ہے۔

اور صوبوں کا حال تو معلوم نہیں لیکن آج سے چالیس پچاس سال پہلے بہار میں یہ عام دستور تھا کہ کسی گاؤں میں دوسرے گاؤں سے جب برات آتی تھی تو طرفین کے بچے عموماً شعر لڑایا کرتے تھے، اس علمی معرکہ کا اصطلاحی نام اس زمانہ میں بیتا بجت[1] تھا، ہوتا یہ تھا کہ ایک فریق کوئی شعر اردو یا فارسی کا پڑھتا جس حرف پر وہ شعر ختم ہوتا تھا فریق مخالف کا فرض تھا کہ اسی حرف سے شروع ہونے والے شعر کو جواب میں پڑھے، پھر یہ جوابی شعر جس حرف پر ختم ہوتا، فریق اول اسی حرف سے شروع ہونے والے شعر کو سناتا، وھلم جرا جب تک جوابی شعر کے سنانے سے کوئی فریق عاجز نہیں ہو جاتا اس وقت تک یہ سلسلہ برابر جاری رہتا، بعض دفعہ تین تین چار چار گھنٹے خرچ ہو جاتے اور شعری سوال و جواب کا یہ قصہ ختم نہ ہوتا، قاعدہ تھا کہ برات آنے سے چند مہینے پیش تر تیاریوں میں مکتب خانوں کے بچے اس "بیتا بجت" کے قصوں میں مشغول ہو جاتے تھے، اس زمانہ میں کچھ کتابیں بھی اسی سلسلہ میں مروج تھیں، جن سے اس معرکہ کے سر کرنے میں مدد ملتی تھی، ان ہی کتابوں کے اشعار لوگ زبانی یاد کرتے، ایسے حروف جو اردو و فارسی میں کم مستعمل ہیں، مثلاً فارسی کا حرف ژ، یا ہندی کا حرف ڈال، ڑ، کوشش کی جاتی تھی کہ شعر اسی قسم کے حروف پر ختم ہوں، جن کے جواب میں مخالف کو کافی دشواری پیش آتی تھی، چند مشہور اشعار تو لوگوں کو اس سلسلہ میں عموماً یاد تھے، لیکن جب بات کہیں آ کے رک گئی تو بالکل رکھ دی جاتی تھی، شعر کو غلط طریقہ سے کوئی پڑھتا تو "القط" کی ایک اصطلاح تھی، جو گویا اس زمانہ کے پوائنٹ آف آرڈر کا قائم مقام تھا، شطرنج میں "مات" کا لفظ ہارنے کے معنوں میں مستعمل ہے اسی طرح بیتا بجت میں بھی ہارنے والے فریق کے متعلق اعلان ہو جاتا تھا کہ اس کو مات ہو گئی، عجیب زمانہ تھا مسلمانوں کی براتوں سے متجاوز ہو کر ہندوؤں کے خواندہ طبقات کائستھ وغیرہ میں بھی اس "بیتا بجت" کا چرچا کچھ دن پہلے زوروں پر جاری تھا۔

---

[1] بظاہر بیت بازی کے لفظ نے بچوں کی زبان پر یہ صورت اختیار کر لی صحیح تلفظ اس کا چاہئے تو یہی کہ بیت بازی ہو۔

بہر حال سید الملت کی مکتبی زندگی میں "بیت بازی" کا کافی رواج تھا، دستور کے مطابق سلیمانی مکتب کے بچے بھی اس میں کافی حصہ لیتے تھے، مولوی حنیف صاحب کا بیان ہے کہ مشق کے لئے مکتب خانے ہی میں دو فریق بچوں میں بن گئے تھے، ایک فریق کے امام سید الملت تھے، اور دوسرے فریق کی قیادت حکیم مولوی سید نجم الہدیٰ ندوی کے ہاتھوں میں تھی، مولوی سید حنیف سید صاحب کی زیر امامت کام کرتے تھے، اور مدرسہ شمس الہدیٰ کے سابق استاذ مولانا محمد قاسم[1] ندوی دعالوی حکیم صاحب کے فدویات میں تھے، حکیم صاحب نے نوادر اشعار کی ایک بیاض صیغۂ راز میں تیار کی تھی، جس کا سید الملت کو کسی طرح سراغ مل گیا۔
اب یہی سننے کی بات ہے کہ ایام طفلی کے اس علمی مشغلہ میں سید صاحب کا طبعی رجحان برسر کار آیا، انہوں نے مولوی سید حنیف صاحب کو آمادہ کیا کہ مصنوعی طور پر ان کی پارٹی سے ٹوٹ کر حکیم سید نجم الہدیٰ کی پارٹی میں شریک ہو جائیں، اور جس طرح بن پڑے نوادر اشعار کی یہ بیاض جس پر ان کو ناز ہے، اس کے اڑانے کی کوئی تدبیر اختیار کریں، سید الملت کے حسب ہدایت چند روز کیلئے بجائے سلیمانی پارٹی کے مولوی حنیف صاحب نجمی پارٹی میں گھل مل گئے، اور مولوی قاسم صاحب جو نسبتاً سادہ آدمی تھے، اور اب تک سادگی ہی ان کی سب سے بڑی امتیازی صفت ہے، ان ہی سے یہ "بیاض" ان کو ہاتھ لگی، جسے اسی وقت اپنے امام کے سامنے لاکر انہوں نے حاضر کر دیا، اور پھر حسب دستور سلیمانی پارٹی ہی میں شریک ہونے کا اعلان کر دیا، حکیم نجم الہدیٰ اس واقعہ سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ معمر ہونے کے بعد بھی مولوی حنیف صاحب کے اس "کید عظیم" کا اب بھی ذکر کرتے رہتے ہیں۔
مکتب خانے میں پڑھنے کا دستور یہ تھا کہ چند کلاسوں پر بچے منقسم تھے، ہر کلاس میں "سامع و قاری" یعنی سننے اور پڑھنے کا فرض باری باری سے بچوں کو ادا کرنا پڑتا تھا، سید الملت کی کلاس میں مولوی سید حنیف اور غالباً حکیم نجم الہدیٰ ندوی سامع و قاری بنتے تھے، اور یہ سلسلہ بارہ تیرہ سال کی عمر تک جاری رہا، مکتبی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد سید الملت طلب علم کی راہ میں والدین سے جدا ہو کر پھلواری شریف کی تعلیمی و تدریسی خانقاہ میں پڑھنے کے لئے داخل ہوئے، بیرونی تعلیم کی یہ پہلی منزل تھی، سننے میں آیا ہے کہ پھلواری شریف کی خانقاہ کے بعد کچھ دن دربھنگہ کے مدرسہ امدادیہ میں بھی ان کے گذرے، اگرچہ کبھی اس کا ذکر انہوں نے مجھ سے نہیں فرمایا، کچھ ہی دن کے بعد سفر کی آخری منزل ندوہ تھی، جس کے بعد وہ ندوی ہی ہو گئے۔ علامہ، ڈاکٹر، تصنیف و تالیف تحقیق و تدقیق کے یکہ تاز فاضل یگانہ بن جانے کے بعد کچھ دن ہوئے سید الملت کسی وجہ سے تھوڑی دیر کے لئے گیلانی تشریف فرما ہوئے، غالباً ان کا خیال تھا کہ فقیر گھر ہی پر ہے، لیکن مجھ سے ملاقات نہ ہوئی، غالباً میں حیدرآباد میں تھا، لوگوں سے میں نے یہ سنا کہ خاکسار کے غریب خانے پر پہنچنے کے ساتھ ہی یہ دریافت فرمانے لگے کہ

"میرے پرانے ساتھی، اور بھائی کہو ادن الناس کہاں ہیں؟"

---

[1] مولانا قاسم صاحب جو بحمد اللہ وظیفہ یاب ہو کر اب دسنہ ہی میں خانہ نشین ہیں، دسنہ کے مشہور درویش عالم مولانا حافظ تجمل حسین صاحب کے صاحبزادے ہیں، حافظ تجمل حسین رحمۃ اللہ علیہ بھی دسنہ کی مشہور شخصیتوں میں تھے، بانی دار العلوم دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم سے پہلے مرید ہوئے اور ارشاد و تربیت کا تعلق مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی قدس اللہ سرہ سے رکھتے تھے، اپنے عہد کے علما میں حافظ صاحب کافی روشناس تھے۔ چند کتابیں لکھی ہیں، ان کے لطائف و ظرائف کا ذکر ہم عصر علما کی مجلسوں میں عموماً ہوا کرتا تھا، حضرت تھانوی کے ملفوظات میں بھی ہے۔ مکہ معظمہ میں صبح کی نماز حرم میں ہو رہی تھی حافظ صاحب بھی نماز میں شریک تھے، اچانک نماز کے اندر خدا جانے ان پر کیا حال طاری ہوا کہ "بادشاہا جرم ما را درگزار" کے ساتھ چلانے لگے، حافظ صاحب کے صاحبزادے مولوی قاسم صاحب نے ندوہ اور غالباً دیوبند میں تعلیم پانے کے بعد مدرسہ عالیہ کلکتہ کے نصاب کی بھی تکمیل کی اسی لئے ندوی کے ساتھ عالوی کے لفظ کا بھی اضافہ ان کے نام کے ساتھ کیا گیا۔

یہ "کھڑاؤں الناس" مولوی سید حنیف صاحب کا خطاب تھا، مولوی صاحب ممدوح پڑھنے پڑھانے اور زندگی کی مختلف منزلوں سے گزرنے کے بعد اس زمانہ میں کچھ مجذوبانہ رنگ اختیار کر چکے تھے، جوتوں کی جگہ ہمیشہ کھڑاؤں استعمال کرنے لگے، اور ناس پینے کی ایسی عادت ڈالی کہ ایک لمحہ کے لئے اس مشغلہ سے الگ ہونا نہیں چاہتے تھے، سید الملت نے ان کی کھڑاؤں اور ناس کی وجہ سے "کھڑاؤں الناس" کا خطاب ہمارے ان کو دیا تھا، زیر لب ہلکے سے تبسم کے ساتھ اس قسم کے مزاحانہ فقرے اور طبیعت سید الملت کی عام فطرت تھی، ان لطائف کو اپنی یادداشتوں کی مدد سے لوگ، اگر جمع کریں تو ایک دلچسپ ذخیرہ یہ بھی ہو سکتا ہے۔

یہی مولوی سید حنیف صاحب جو ہمارے راوی ہیں، اپنی تمام مزاجی وارستگیوں کے ساتھ آخر عمر میں حج و زیارت کی سعادت سے بھی بحمد اللہ بہرہ اندوز ہوئے، اتفاقاً یہ وہی سال تھا جس میں بھوپال سے سید الملت نے بھی حج کا سفر فرمایا تھا، مولوی سید حنیف کی حالت یہ تھی کہ مکہ معظمہ میں بھی اپنے مجذوبانہ رنگ ہی کے ساتھ چلتے پھرتے رہے، ناس کی عادت تو چھوٹ چکی تھی، لیکن کھڑاؤں وہاں بھی ان کے قدموں کے ساتھ لپٹی رہی، صرف لنگی پہنے کرتے کے بغیر ننگے سر مکہ کے بازاروں میں نکل جاتے، عرب کے بچے خود ہی کہتے ہیں کہ ان کو دیکھ کر "صوفی صوفی" چلاتے ہوئے تالیاں لگاتے۔

بہر حال کہنا یہ ہے کہ مکتب کے ان دونوں رفیقوں کی بلد اللہ الحرام میں عام طاقاتیں تو ہوتی رہتی تھیں، اتفاق کی بات کہ مولوی سید حنیف صاحب بیمار ہوئے، اور علالت نے کچھ شدت کی شکل اختیار کی، سید الملت کو کسی نے ان کی اس علالت کی خبر پہنچائی، مولوی حنیف کا بیان ہے کہ سننے کے ساتھ ہی سید صاحب بے تحاشا اپنے بچپن کے رفیق کی عیادت کے لئے پہنچے، اور طرح طرح سے تسلی دی، اب بھی اس واقعہ کا جب ذکر کرتے ہیں تو آب دیدہ ہو جاتے ہیں، بے چارے کو خیال آتا ہے کہ کہاں میں ایک لاابالی کس مپرس آدمی، اور کہاں سید صاحب کی ذات والا قدر، حکومت سعودی کے بڑے بڑے حکام جس کی تعظیم کیلئے سروقد کھڑے ہو جاتے ہوں، اور دنیائے اسلام کے ممتاز ترین علما میں جو شمار ہوتا ہو، بے تحاشا وہی ان کی عیادت بھی کرتا ہے اور تسلی و تشفی کے کلمات سے بھی سرفراز کرتا ہے۔

اور یہ بھی سید الملت کی مختلف دل آویز شانوں میں ایک خاص شان تھی، کم سخنی، اور کم آمیزی، جوان کی جبلت تھی، بسا اوقات لوگوں کو کبر و خود بینی کا شبہ اس پر ہوتا تھا، لیکن ذاتی تجربات نے ہمیشہ اس غلط فیصلہ کی تکذیب کی، جس کی ایک معمولی نظیر یہ واقعہ بھی ہو سکتا ہے۔ فغفر اللہ لہ و تغمد لا لغفرانہ

حج کے سلسلہ میں ایک چیز موقعہ کے لحاظ سے یاد آئی، سید الملت حالانکہ فریضۂ حج سے بحمد اللہ فارغ ہو چکے تھے، لیکن اس کے بعد بھی حج و زیارت کی ہوک ان کے قلب مبارک میں اٹھتی رہتی تھی، خیال شاید یہ تھا کہ اپنے ذاتی مصارف سے اس عبادت کے ادا کرنے کا موقع بھی نکالنا چاہئے کیونکہ آخری سفر حجاز سے پہلے جتنے سفر ان کے حجاز کے ہوئے قومی دلی تھے، بہر حال میرا خیال یہی ہے، بھوپال سے حج کا سفر قلب کے اسی تقاضے کی تکمیل تھی، حج کا یہ ذوق بھی ان میں معلوم ہوتا ہے کہ بچپن کے اس ماحول ہی میں پیدا ہوا، جس میں انہوں نے آنکھیں کھولی تھیں، مطلب یہ ہے کہ نہ صرف ان کے والد ماجد حکیم سید ابوالحسن صاحب مرحوم بلکہ سید صاحب کی والدہ ماجدہ بھی حج و زیارت کے شرف سے فیض یاب تھیں، والدہ ماجدہ پر تو ان کے حجاز سے واپسی کے بعد یہ حال طاری ہوا کہ سادات بہار کی خواتین کا جو عام لباس اس زمانہ میں تھا اس کو ترک کر کے قریب قریب وہی لباس اختیار فرما لیا تھا جو اس زمانہ میں خواتین عرب کے لباس سے زیادہ مشابہ تھا گویا ہندیہ متعربہ بن گئی تھیں، عربیت سے سید الملت کا لگاؤ، ممکن ہے اس میں ان کی والدہ ماجدہ کے اس حال کو بھی دخل ہو۔

این نہ مورے بود میگوئی سلیمانے شکست! (عرفی)

حالِ ما بنگر کہ آہوئے حرم گم کردہ ایم
رہبرِ امید را در ہر قدم گم کردہ ایم (عرفی)

سید حسن امام وارثی

"سید صاحب" ہماری اصطلاح میں کعبۃ اللہ کے کوئی مطوف مراد ہوتے تھے یا پھر علامہ سید سلیمان ندوی، جن کو ہم "عالم" کم مگر "قابل" زیادہ مانتے تھے - یہ اس وقت کی باتیں ہیں جب "ندوی" فارغ التحصیل "نیم مولوی" یا "دد علیگ" کا معرب گنے جاتے تھے - دنیا سازی کے اعتبار سے چاہے ان کی جو کچھ بھی تکریم کی جاتی ہو مگر قتادے کے لئے "درس نظامیہ" والوں ہی کو ترجیح دی جاتی تھی۔ سید صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ مجھے تو یہی معلوم ہوا تھا کہ انھوں نے اپنی ذات کے لئے اس عصبیت کی چہار دیواری میں بڑے رخنے ڈال دیئے تھے۔ وہ بزرگانِ علمِ دین جو واقعی "قدر افزائی" کا حق رکھتے تھے، ان کا رویہ سید صاحب کے ساتھ ایسا ہونے لگا تھا جس کو دیکھتے ہوئے، ہاشما کے لئے گنجائش نہیں رہ جاتی تھی کہ سید صاحب کے عالمانہ وقار میں شک و شبہہ کو راہ دے سکیں۔ چنانچہ وہ "عالم و قابل" بحصۂ رسدی یاد کئے جانے لگے، یہاں تک غنیمت تھا۔ ہم خوش تھے ہمارا خدا خوش تھا۔ مگر ایک دن معلوم ہوا کہ "یکے از سر خیل اصحاب شبلی (؟)" ہوتے سوتے سید صاحب "مرید" ہو کر "جامع شریعت و طریقت" بن جانا چاہتے ہیں۔ اس پر حیرت سے زیادہ افسوس ہوا کہ ایک جوہرِ قابل، بام شہرت پر پہنچتے پہنچتے، کس "بھول بھلیاں" میں پڑ گیا۔

خراب حالیِ دلہا ببیں کہ آں مغرور بعہد حسنِ جوانی، ز ناز می گزرد (عرفی)

اس تاسف میں کچھ خاص حصہ میرا اپنا یوں تھا کہ میں خود بھی اپنی نئی زندگی کے لئے نیا نیا "زنگروٹ" تھا اور ایسے وقتوں میں جیسا ہونا چاہیئے مجھے اپنے مفروضات "حرفِ آخر" معلوم ہوتے تھے۔ "مدرسے والا تصوف" میرے نزدیک "زبردستی کی بات" تھی۔ اس لئے اور بھی افسوس ہوتا تھا کہ "سید صاحب" بھی نرے مولوی ہی ثابت ہوئے اور اپنے مخصوص دائرے سے باہر دیکھنے سے قاصر رہے۔ جی چاہتا تھا کہ عرفی کے یہ دو شعر سید صاحب کو لکھ بھیجوں

بدیر آ از حرم صوفی کہ شد بر قہوہ کشود اینجا از انجا انچہ می جوئی بہ میخواراں نمود اینجا
ہماں زنگے کہ آنجا در دلِ اسلامیاں بینی مغاں را نیز بود اما صفائے شد زدود اینجا

با دوست رسیدیم چو از خویش گزشتیم
از خویش گزشتن چہ مبارک سفرے بود (دارا شکوہ)

پس منظر سطور بالا میں عرض کیا جا چکا- اس صورتِ حال میں ایک دن لکھنؤ کے چار باغ اسٹیشن پر سید صاحب مل گئے۔ وہ

بھی قبلہ سے رو گرداں سمت مشرق کو عازم تھے اور میں بھی۔ ان کی ہم وطنی اور بڑی شخصیت اس کی اجازت کہاں دیتی کہ ممدوح الشان سے کج خلقی برتی جا سکتی، پھر بھی ان کی معیت اس وقت بار خاطر محسوس ہو رہی تھی۔ اس لئے ان سے کنی کتا کر کسی ایسے ڈبہ میں سوار ہونا چاہتا تھا، جہاں ان سے علیحدہ رہ کر سفر کر سکوں، میرے خیالات ایسے کیوں تھے؟ اس کی وجہ سُن لیجئے۔ بات یہ تھی کہ میرے معاشرے کی تبدیلی کے بعد سے وہ ملنے ملانے میں اور طرح پیش آنے لگے تھے جس کو "عقیدتمندی" تو میں نہیں سمجھتا تھا البتہ "اعجوبہ نوازی" سے تعبیر کرتا تھا۔ ایک "اعجوبۂ تصوف" سے انھوں نے خود اپنا سلسلہ ملا لیا تھا اس لئے خطرہ تھا کہ وہ "من تراحاجی بگویم تو مرا حاجی بگو" والے تعاون کے طالب ہوں گے جس کے لئے اُس وقت میرا حوصلہ کافی فراخ نہیں تھا چونکہ ان کے تصوف کو میں اپنے خیال میں "مدرسے والا اُفزار" دیئے ہوئے تھا، بہرکیف رسمی اخلاقیات کے بعد رخصت ہوا اور اپنے خیال میں چھپ چھپا کر ایک کافی بھرے ہوئے انٹر کلاس کمپارٹمنٹ میں جا بیٹھا۔ ابھی اچھی طرح مطمئن بھی ہونے نہ پایا تھا کہ سیّد صاحب بہ نفس نفیس پہنچ ہی تو گئے اور پہلو سے پہلو ملا کر جم گئے۔ اب کیا ہو سکتا تھا؟ کافر نتوانی شد ناچار مسلمان شو۔ چاہیئے تو یہی تھا کہ مجھے سخت کوفت محسوس ہوتی بلکہ سچی بات یہ ہے کہ ایسی ہی کچھ کیفیت میں نے اپنے اوپر طاری کرنی چاہی مگر مجھے اس اَدرد میں بھی کامیابی نہیں ہوئی۔ اس کو سیّد صاحب کی کرامت آج بھی تسلیم کرتا ہوں۔ خیر ریل چل پڑی۔ تھوڑی دیر تو یہ عالم رہا کہ ؎

من از حیرت، تو از تمکیں، نہ ایمائے نہ تقریرے
بداں مانندم کہ ہم بزم است تصویرے بتصویرے
(غنیمت)

لگے ہاتھوں یہ بھی سُن لیجئے کہ سیّد صاحب اور مجھ میں، بعض اعتبارات سے بعد المشرقین۔ وہ متین، کم سخن مگر پر مغز گفتگو کرنے والے اور صاحب علم وافی و عمل کافی۔ برعکس اس کے میری جہالت خود میرے علم میں موجود علی الرغم غالب ؏
در گفتگو اندازۂ گفتار ندانند (باندک تصرف) عمل خیر کے لئے عذریہ" کہ سلطان نخواہد خراج از خراب" رہ گئی متانت تو اس سے مجھے اللہ واسطے کا بیر اور وہ بھی اس حد تک کہ ؎

تمکین برہمن دلم از کفر بگرداند
تبخانہ بتے خانہ براندازند ندارد
(غالب)

بایں ہمہ لکھنؤ سے شاہ گنج تک کئی گھنٹے کا سفر، قفل بدہن کیسے کٹ سکتا تھا، کسی عنوان سے باتیں شروع ہو گئیں۔ ریل کے اُس خانہ میں یوں تو آدمی ہی آدمی بھرے تھے مگر کوئی بھی ایسا نہ تھا جو ہماری گفتگو میں حارج ہوتا۔ اس لئے گویا "خلوت در انجمن" کا لطف حاصل تھا۔ سیّد صاحب اپنی طرف سے "مختصر المعانی" قسم کے جملے اور بڑی تُک کی باتیں کرتے جاتے تھے مگر سعیٔ احتیاط کے باوجود میری جہالت کی گفتگو کے لئے اگر کوئی معذرت ہو سکتی تھی تو صرف یہی کہ ؎

تو خواہی کافری داں خدمتم، خواہی مسلمانی
مرا کار لیست با صدقِ دل امید دار خود
(نظیر نیشاپوری)

میں جوش و خروش میں کھویا ہوا "حکمت بلقمان آموختن" کی حماقت کو محسوس کرنے کے بھی قابل نہیں رہا تھا، مگر اسی یاوہ گوئی میں جب سیّد صاحب کے سفر کا رستہ طے ہو گیا جو میری معیت میں جاری رہنے والا تھا اور وہ معانقہ و مصافحہ کے بعد کافی متاثر نظر آئے تو مجھے پتہ چلا کہ شاید حماقتوں کے اظہار میں بھی کوئی کمال میری قسمت میں نہیں تھا اور "از غلط بر ہدف زند تیرے" کی مصداق میں بھی شاید کچھ کام کی باتیں کر گزرا تھا۔ یا پھر بقول نظیری نیشاپوری ؎

باہر کہ بنشستم دمے چوں خویش محزوں کردمش

سیّد صاحب کی "یافت" تو ان کے ساتھ گئی قدس اللہ اسرارہٗ۔ میں اپنی "دریافت" عرض کئے دیتا ہوں۔

(۱) سیّد صاحب کی صلاحیت ذاتی و صدق طلب ان کی صفائے باطن کیلئے سب سے بڑی ضمانت تھی۔

(۲) سیّد صاحب الفنس و آفاق کی سیر میں کسی کے محتاج نہیں تھے۔

(۳) گداز خاطر سے کافی بہرہ رکھتے ہوئے وہ اس کے کتمان پر پوری قدرت رکھتے تھے۔

(۴) ان کے قلب کی وسعت ان کو تنگ نظری سے بچائے ہوئے تھی

(۵) جب میری ہیچمدانی اور ہرزہ سرائی بھی ان کو "حجاب الاکبر" کی پناہ گاہ کیطرف رجوع نہ کر سکی تو ظاہر ہے کہ علم اُن کا "مصاحب" تھا اور خود وہ "صاحبِ علم" ہونے کے باوجود "طالب العلم" تھے بقول طالب کلیم ؎

ہیچگہ ذوقِ طلب از جستجو بازم نداشت
خوشہ چیں بودم من آں روزیکہ خرمن داشتم

اسی ایک بات سے ان کی عالی ظرفی، حق پژوہی، فروتنی اور خودگزاری کے کتنے درخشاں شواہد صاحبان نظر کے لئے کیسے خیرہ کن ثابت ہوتے ہیں ؎

خودگزاری نم کیف صہبائیش بود
خالی از خویش شدن صورتِ مینائیش بود　　(اقبال)

یہاں پر چند جملۂ معترضہ ملاحظہ میں آ جائیں تو جا سے ہوں گے بیان بالا کو پڑھنے والوں میں ایسے "خوش فہم" حضرات بھی ہو سکتے ہیں جو بڑی دور کی کوڑی یہیں کے یہیں سے اٹھا کر خالی الذہن ممدوحین کو تھما دیں تو عجب نہیں کہ راقم الحروف اپنا بردبگنفا کرنے کیلئے نعوذ باللہ سیّد صاحب کو "مستفید و مستفیض" ظاہر کر رہا ہے تو واضح باد کہ "راقم الحروف" دارنیٔ ہے اور مصدر جملہ فیوض و برکات ذات پاک حضرت واہب العطایا کے سوا کسی کو سمجھنا یا سمجھانا "کفر طریقت" یقین کرتا ہے۔ اگر کسی ڈاکیہ کی منی آرڈر رسانی کی رسیدات پیش کرنے پر اس پر اتہام لگایا جا سکتا ہے کہ وہ بیچارہ ڈاکیہ تقسیم رقوم کے ذریعہ اپنا لکھ پتی ہونا ثابت کرنا چاہتا ہے تو اس صورت میں مجھے بھی اپنے مجرم ہونے کی ندامت کی جگہ فخریہ اقرار ہوگا

اس پہ گزرے نہ گماں روئے ریا کا ہرگز
غالب خاک نشیں اہل خرابات سے ہے

اس کے بعد سیّد صاحب سے پھر ملاقات اس طرح ہوئی کہ "میں خود آیا نہیں لایا گیا ہوں" کہہ کر ملتا ہوا میرے پاؤں کی انگلیاں پک آئی تھیں جس کی وجہ سے برہنہ پائی ہی پر مجبور نہیں تھا بلکہ چلنے پھرنے سے بھی معذور تھا۔ سیّد صاحب کو مستشار مومتن کی حیثیت سے پبلک سروس کمیشن نے رانچی مدعو کیا تھا چونکہ پٹنہ کے مدرسہ شمس الہدیٰ کیلئے پرنسپل کا انتخاب کرنا تھا جس کے لئے عزیزی سید ریاست علی ندوی سلمہٗ امیدواروں میں شامل تھے۔ وہ ہی بضد ہو کر مجھے جیتے جی چار کے کاندھے پر سوار پالکی میں بٹھا کر گیا کے اسٹیشن پر رات گئے لے گئے تھے جہاں ریل بدلنے کے لئے چند ساعت سیّد صاحب ٹھہرنے والے تھے۔ میری معذوری دیکھکر سید صاحب ایسے متاثر نظر آئے جیسا کہ ان کے خلوص اور مودت

کا اقتضا ہونا چاہیئے تھا۔ میں نے اس کو اپنی سفارش کی کامیابی کا ذریعہ سمجھکر اپنا ایا ہیچ ہونا ہی بہتر باور کیا مگر یہ میری بھول تھی۔ یہ بھی سید صاحب کا حُسن خلق داعتماد تھا کہ "امیدوار بودہ بدانند" والی دنیا سازی روا رکھنے کے بجائے ممدوح الشان نے معقولیت کے ساتھ مجھے راضی کرلیا کہ دارالمصنفین کو ریاست سلمہا کی جو ضرورت تھی اس بر میں اپنے قابل فخر عزیز کا اقتصادی نقصان گوارا کرلوں۔ اس کو سید صاحب نے بر وقت راز رکھنے کی ہدایت فرمائی تھی اس لئے میں نے ظاہر نہیں کیا تھا۔ بعد کو یہی ہوا کہ ریاست میاں اعظم گڑھ سدھارے اور مزاہین ماہنامہ ندیم کی خدمت میرے سر ڈال گئے جس کو یہ کہہ کر میں نے گوارا کرلیا کہ ؎

ایک بیداد گر رنج فزا اور سہی !

کجا در روز محنت غمگسار کس شود عرفی
کہ می گرید بروز خویش و بیدار دانہ می گرید

سید صاحب نے کبھی کوئی فرمائش مجھ سے نہیں کی تھی، ایک فرمائش ایک بار ممدوح الشان نے کی جو استحکام روابط اور ازدیاد مراسم کا ذریعہ یقینی ہونے والی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس سے مجھے کتنی خوشی ہوئی ہوگی، اس کے کہنے کی بھی ضرورت نہیں کہ میں نے اس کے لئے کوشش کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا مگر میرے اعزا کی کجرائی سد راہ کامیابی ہوئی اس کی شرمندگی ایسی ہوئی کہ سید صاحب سے پھر آنکھیں چار نہ کرسکا تا آنکہ ممدوح الشان لکڑی کے اوٹ اُدھر بیٹھے رہے مگر مجھے ہمت نہ ہوسکی کہ ان کا مواجہ حاصل کرتا۔ حین قیام کراچی ایک عریضے کے جواب میں سید صاحب میری نارسائیوں کے گلہ مند بھی ہوئے مگر مجھے کیا خبر تھی کہ ؎

ہر کجا شمعیست، روشن می کنند از بہر بزم
شمع جاں ہرگاہ روشن شد ز محفل می برند　　(عرفی)

قیامت یہ ہوئی کہ علالت کی مجھے کوئی اطلاع ہی نہ ہوئی۔ ریڈیو کی خبر ارتحال میرے لئے غیر متوقع اور بالکل اچانک ہونے کی وجہ سے اور بھی اثر انگیز ہوئی۔　　انا للہ وانا الیہ راجعون۔ چند جملے اور قطعے جن سے سال وصال مستخرج ہوتے ہیں، اسی وقت کے لکھے ہوئے ہنوز غیر مطبوعہ ہیں ان کو غالب کی زبان سے یہ کہکر درج کرتا ہوں ؎

مٹتا ہے فوت فرصت ہستی کا غم کہیں
عمر عزیز صرف عبادت ہی کیوں نہ ہو

"ذالک من فضل رب"
(۱۹۵۴ء)

"مولانا سید سلیمان ندوی علیہ الرحمہ تاج الدین بود"
(۱۳۷۳ ہجری)

"باب خلد سید سلیمان ندوی علیہ الرحمہ"
(۱۳۷۳ ہجری)

"آج حبیبی علامہ سید سلیمان ندوی فی مقعد صدق عند ملیک مقتدر"

۱۹۵۳ء

بعد مغرب چار دہ ربیع الاول — لبیک کہا اجل کی دعوت کے لئے
علامہ سلیمان 'بہاری' ندوی — سرمایۂ ناز تھے سیادت کے لئے
خود علم و عمل تھے ان پر نازاں — تھے فخر شریعت و طریقت کے لئے

"بلغ العلا بکماله کافی" ہے حسنؔ
(۱۳۷۳ھ)
سید صاحب کے سال رحلت کے لئے

آہ علامہ سلیمان قدست اسرارہٗ — سید والا گہر از آل ختم المرسلین
علم را نازے بذاتش ہم عمل را امتیاز — واقف سر طریقت ماہر شرع مبین
در بیان سیرت نبوی عدیم المثل بود — ہم بگفتار آوردہ بسیارے مضامین متین
بست و دو ماہ نوبمر بعد مغرب زیں جہاں — کرد گلگشت جناں بگذاشت دنیا را غمین

سر نہادہ پیش "یزداں" سال بنوشتم حسنؔ
زآیت قرآں "طبتم فادخلوها خالدین"

۱۸۷۳
۲۷
(۱۹۵۳ء)

خدا کی رحمتیں ہوں ان پر۔ اپنا صاحب دل ہونا یوں بھی ثابت کر گئے کہ آخر دم جو بیماری جھیلی وہ بھی "دل" کی تھی؎

بود در اضطراب از اہل عالم، ہر کہ کامل شد
تپیدن در میان جملہ اعضا قسمت دل شد (غنی کشمیری)

بقیہ بزم ریاض :-

رضا لائبریری رام پور
۵ر فروری ۵۴ء

عزیز محترم سلمکم اللہ تعالیٰ

مکرمت نامہ ملا، میں ایک مضمون، علامہ مرحوم کے ان خطوط پر لکھ رہا ہوں جو انہوں نے مجھے بھیجے تھے، اس مضمون میں اپنے ان کے تعلقات پر مختصر روشنی ہوگی، اور ان کے خطوں کا متن اور اس پر میرے توضیحی حواشی ہوں گے، ضخامت شاید آپ کے رسالہ کے ۱۵ صفحات کے بقدر ہو جائے،

میں یہ مقالہ انشاء اللہ فروری کے دوسرے ہفتے کے آخر تک روانہ کر دوں گا۔

ہاں، اگر کسی باعث یہ مقالہ آپ اس نمبر میں شائع نہ کر سکیں تو اگلے شمارے میں شامل کر دیجئے گا۔ والسلام

احقر — امتیاز علیخاں عرشی

سیّد صاحب کی یاد

عبدالقدوس ہاشمی ندوی

علامہ سید سلیمان ندوی کا نام نامی تو نہ جانے کب سے کانوں میں پڑا ہوا تھا، اور نہ کیوں ہوتا، سید صاحب علیہ الرحمۃ کا وطن یعنی دیسنہ ضلع پٹنہ میرے گھر مخدوم پور ضلع گیا سے صرف سولہ سترہ میل ہی کے فاصلہ پر تو تھا، مولانا کے بڑے برادر بزرگوار حکیم سید ابوالحسن صاحب میرے گاؤں سے چار میل پر قصبہ اسلام پور میں ایک مدت تک رہ چکے تھے، ان کی نیکی، بزرگی، علم و فضل، اور عوام سے محبت کے فسانے سارے قرب و جوار میں مشہور تھے، غرض یہ کہ جن لوگوں کا ذکر بڑوں کی محفل میں سنتا تھا، ان میں دو بزرگ یہی تھے مولانا شاہ بدرالدین صاحب پھلواری شریف کی خانقاہ کے صاحب سجادہ اور مولانا سید سلیمان ندوی سیرۃ النبی کے مصنف۔

سید صاحب کو پہلی بار دیکھنے کا اتفاق ۱۹۲۲ء کے آخری دنوں میں ہوا، اس وقت میری عمر کا گیارہواں سال شروع ہوا تھا، مجھے والد مرحوم مولانا اوسط حسین کے انتقال کے بعد ایک سال سے تعلیم کے لئے مولانا عبدالرحمٰن صاحب کے سپرد کر دیا گیا تھا، اور میں گھر سے بہت دور مئو ضلع اعظم گڈھ میں رہتا تھا۔ وہاں مولانا عبدالرحمٰن صاحب کا مدرسہ مدرسہ عالیہ کے نام سے قایم تھا، مولانا مرحوم حضرت میاں نذیر حسین صاحب محدث دہلوی کے شاگرد اور والد مرحوم کے ہم سبق تھے،

اس زمانہ میں تحریک ترک موالات کا زور تھا، جگہ جگہ جلسے ہوا کرتے تھے، مئو میں بھی بہت بڑے پیانہ پر ایک جلسہ ہوا، اور سید صاحب اس جلسہ کی صدارت کے لئے اعظم گڈھ سے آئے، مولانا عبدالرحمٰن صاحب نے مجھے ایک تقریر لکھ کر یاد کرا دی تھی اس جلسہ میں مجھے یہ تقریر دہرانی تھی، مجھے وہ دن اب بھی اچھی طرح یاد ہے، اتنے عظیم الشان جلسہ میں جب میرا نام پکارا گیا اور میں اپنی تقریر دہرانے کھڑا ہوا تو میرے پیر کانپ رہے تھے، اور سید صاحب زیر لب تبسم کے ساتھ مجھے شاباش و آفرین کہتے جاتے تھے، ایک مسحور یا مجبور کی طرح میں نے وہ تقریر دہرا دی، خدا جانے صحیح الفاظ بھی ادا ہوئے یا نہیں، لیکن سید صاحب نے میرے سر پر ہاتھ رکھا، دل بڑھایا،

وہ دن اور نومبر ۱۹۵۳ء میں سید صاحب کی وفات سے دو تین دن پہلے کا دن، مولانا بستر علالت پر تھے، اور میں چارپائی کے قریب فرش پر بیٹھا تھا، مولانا مسکرا کر، محبت و شفقت کے ساتھ مجھ سے کچھ دیر باتیں کرتے رہے، اور میں بیالیس سالہ ادھیڑ بلکہ بوڑھا بچہ، بچوں کی طرح باتیں کرتا رہا، مولانا نے پھر ایک بار سر پر ہاتھ رکھا، اور میں نے ٹھنڈک محسوس کی۔

۱۹۲۶ء کے آخری حصہ میں مجھے درس نظامیہ کی تکمیل کے بعد علم حدیث کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں بھیج دیا گیا، اس زمانہ میں سید صاحب وفد خلافت کے لیڈر کی حیثیت سے حجاز گئے ہوئے تھے، کچھ دنوں کے بعد مولانا واپس تشریف لائے، اور طلبہ و اساتذۂ دارالعلوم کی طرف سے ان کا بڑا شاندار استقبال کیا گیا، میں نے اس تقریب استقبالیہ میں ایک قصیدہ پڑھا تھا، یہ میرا پہلا اور شاید آخری قصیدۂ مدحیہ تھا، نہ پہلے کبھی کسی کی مدح کی تھی، اور نہ پھر کبھی اتفاق ہوا، اس طفلانہ کوشش کے دو شعر یہ تھے :-

بر سر اوج سما ابر خبر امان آمد، مژدہ اے بلبل شیدا کہ بہاراں آمد
سید آمد بہ وطن روح بہ گردید بہ تن گل رفتہ ز چمن باز بہ بستاں آمد

اس دن کے بعد سے سید صاحب اکثر دار العلوم آتے رہے، اور علمی افاضات کا سلسلہ جاری رہا، ۱۹۲۸ء میں تاریخ اسلام کے لکچر خود سید صاحب نے کئی ماہ ندوہ میں رہ کر ہمارے درجہ میں دئے۔

۱۹۲۹ء میں دار العلوم سے تعلیم کی تکمیل کے بعد میں اپنے وطن آ گیا، استاذ محترم نے مجھے دار المصنفین اعظم گڈھ میں طلب کیا، لیکن ٹھیک ان ہی دنوں میں مجھے رام پور کے سرکاری کتب خانہ میں بعض قلمی کتابوں پر کام کرنے کے لئے بلایا گیا تھا، اس لئے اس وقت میں اعظم گڈھ نہ جا سکا، رام پور میں کام کرنے کی ہامی بھر چکا تھا۔

اس کے بعد دار المصنفین جانے کا بارہا اتفاق ہوا، جب سے رسالہ ندیم جاری کیا تو سید صاحب سے زبانی و تحریری اصلاح و ہدایات حاصل ہوتی رہیں، حیدر آباد دکن کے طویل عرصۂ قیام کے دوران میں بھی بارہا اعظم گڈھ حاضر ہوا، اور بارہا مولانا خود حیدر آباد کسی نہ کسی کام سے گئے تو استفادہ کیا۔

سید صاحب اپنے طلبہ کو جس محبت و شفقت کے ساتھ تعلیم دیتے تھے وہ اپنی آپ مثال تھی، چھوٹی چھوٹی غلطیوں پر ٹوکتے تھے، لیکن اتنے شیریں انداز میں کہ کبھی طبیعت میں جھنجلاہٹ پیدا نہ ہونے پاتی تھی۔

ندوہ کے دوران تعلیم کا ایک واقعہ ہے کہ میں بائیں ہاتھ میں کتاب لئے ہوئے درجہ میں جا رہا تھا، سید صاحب کے آنے کی مجھے اطلاع بھی نہ تھی، عباسی ہال کے دروازے پر حضرت چند اساتذہ کے جھرمٹ میں کھڑے مل گئے، اور پیش قدمی کر کے خود ہی فرمایا السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ' میں نے سلام کا جواب دیا اور بچ کر نکل جانے ہی کو تھا کہ ہاتھ بڑھا کر فرمانے لگے مصافحہ تو کر لو، میں نے ایک ہاتھ سے مصافحہ کیا۔ مسکرا کر خیریت پوچھی، اور کہنے لگے، ایک ہاتھ سے مصافحہ آپ نے فیشن کے ماتحت کیا یا روایت کے ماتحت، میں نے عرض کیا کہ روایت کے ماتحت، المصافحۃ بالیمنی والی حدیث پڑھ کر سنائی، فرمانے لگے، لیکن جناب آپ جیسے طالب علم حدیث کو اس مسئلہ میں کوئی غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے، حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ کی روایت آپ کو یاد نہیں کہ کفی بین کفی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اس کے بعد مولانا نے مصافحہ کی مختلف روایات سنائیں، ان پر بحث کی، روایات سے استنباط مسائل کا طریقہ بتایا، اور باتوں باتوں میں اتنا کچھ پڑھا دیا کہ مہینوں کے مطالعہ سے بھی بہ مشکل ہی حاصل ہوتا۔

ایک دن حیدر آباد دکن میں مولانا میرے ہاں تشریف فرما تھے، قرآن مجید میں جن قدیم اقوام کا ذکر ہے، ان کے کچھ تاریخی حالات پر باتیں کر رہا تھا، اہل علم کی ایک چھوٹی سی جماعت موجود تھی، مولانا نے بحث کے اختتام پر ایک بات کہی، اور اتنی محکم بات کہی کہ آنکھیں روشن ہو گئیں، فرمانے لگے، عزیزم! کیا قرآن مجید کے بیان سے زیادہ قابل وثوق کوئی تاریخی شہادت کہیں مل گئی ہے؟ اگر نہیں تو قرآن مجید کے بیان کو بعینہٖ تسلیم کرنا ہی پڑے گا، دوسرے بیانات و آثار سے ان کی تفصیل تو مہیا کی جا سکتی ہے لیکن ان کی توثیق و تردید کیوں کر ممکن ہو گی؟

سید صاحب کی عادت تھی کہ جب کسی بات کی تحقیق نہ ہوتی وہ اسے بیان نہ کرتے تھے، عربی میں ایک مثل ہے لا ادری نصف العلم، حق بھی یہی ہے، کہ دعوائے ہمہ دانی کرنے والا ایسا جاہل ہوتا ہے کہ اپنی جہالت کا علم بھی اسے نہیں ہوتا، اہل علم کی ہمیشہ سے یہی شان رہی ہے کہ جس بات کی پوری تحقیق نہ ہو، اس پر قطعی رائے نہیں دیتے، اور تو اور خود حضرت امام اعظم نے بارہا مسائل کا جواب دینے کی بجائے لا ادری کہا ہے۔

جس زمانہ میں خاکسار مولانا محمود حسن خاں مرحوم[1] کی نگرانی میں معجم المصنفین کی تالیف کا کام کر رہا تھا، ایک مصنف احمد بن طغرل بک کا حال تلاش کرنے میں حیران تھا، یورپ کے مشاہیر مستشرقین کو لکھا، مسٹر مارگولیتھ نے جو جواب دیا وہ پایۂ تحقیق سے گرا ہوا تھا، میں نے مولانا کو وہ جواب بھیجکر ہدایت طلب کی، اور اپنے شبہات ظاہر کئے، جواب ملا کہ

"خود تحقیق کرو، چھٹی ساتویں صدی کے فقہا پر میں نے کوئی تحقیقی کام نہیں کیا ہے، دوسرے علما، اور مستشرقین کی تخفیف نہ کیا کرو، یہ طریقہ اہل علم کی شان سے بعید ہے، دوسروں کی تخفیف وتغلیط میں جو وقت صرف کیا جاتا ہے، ضائع ہوتا ہے، جب تک خود تحقیق نہ کرلو، کچھ نہ لکھو، دوسروں کی تحقیق کو اس وقت تک کے لئے قبول کرو جب تک خود تحقیق نہ کرلو۔"

پارسال میں جب انڈونیشیا سے واپس آیا، مولانا کی خدمت میں سلام کے لئے حاضر ہوا، حالات سفر اور انڈونیشی مسلمانوں کے احوال پوچھتے رہے، انڈونیشیا میں دین اسلامی کے مبلغ ملک ابراہیم گوجر کے متعلق بات ہو رہی تھی، ان کے حالات مولانا نے کچھ بیان فرمائے، اور آخر میں فرمایا،

"یاد نہیں کہ کہاں ان کے حالات پڑھے ہیں، میری تحقیق نہیں، اتفاق سے دوران مطالعہ میں کہیں حالات دیکھے ہیں، تحقیق کر لینا، میری گفتگو پر بھروسہ نہ کرنا۔"

اتنے میں ایک صاحب تشریف لائے، مؤتمر عالم اسلامی کا ذکر نکل آیا، انہوں نے مولانا سے بہ اصرار کہا کہ قرآن مجید میں ایتمار کا مصدر اسی معنی میں آیا ہے۔ فرمانے لگے کہ قرآن مجید میں تلاش کرلیجئے، مجھے صرف اس قدر معلوم ہے کہ قرآن مجید میں یہ لفظ سورۂ طلاق میں صرف ایک جگہ زن وشو کے مابین مصالحت کے لئے آیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔"

سید صاحب علیہ الرحمہ گفتگو میں بہت ہی محتاط تھے، اوّل تو وہ بہت ہی کم سخن آدمی تھے، اور جو کچھ فرماتے تھے اس میں بھی دعوے کا انداز کبھی نہیں اختیار کرتے تھے، مناظرانہ تحدی، سخت ایراد والزام ہمیشہ سطحی علم رکھنے والوں کا شیوہ رہا ہے، اہل علم اس سے پرہیز کرتے ہیں۔

دوسرے علوم وفنون میں سید صاحب کی جامعیت کے علاوہ یہ کہا جاتا تھا کہ تاریخ اسلام پر دنیا کے سب سے بڑے عالم بھی تھے، میں نے سید صاحب کے متعلق یہ تعریف مصر، عراق، حجاز، اور شام میں بھی سنی، اور ہندوستان وپاکستان کے اہل علم نظر سے بھی، میری اپنی رائے اس سلسلہ میں کیا ہو سکتی ہے، میں اس کا اہل بھی نہیں، کہ کوئی رائے دے سکوں، بڑی مشہور مثل ہے، انما یعرف من الناس ذوی الفضل ذووہ، کسی عالم کا مقام علم وعرفان پہچاننے کے لئے بھی تو کچھ نہ کچھ علم وفضل چاہئے۔ اور اس ہیچ مدان کو علم وفضل سے اتنا حصہ بھی کہاں ملا ہے۔

خاکسار کے لئے تو حضرت علامہ کی ذات ایک شفیق استاذ، ایک محبت بھرے بزرگ کی ذات تھی، اور یہ کہہ سکتا ہوں کہ مشرق ومغرب کے سفر میں اس متانت وسنجیدگی، اس وسعت مطالعہ اور اس محبت وشفقت کا آدمی دیکھنے میں نہیں آیا، مجھے انہوں نے بارہا تنبیہ کی ہے لیکن اس طرح کہ ان کا ٹوکنا کبھی جبر نہیں نظر آیا، میرے چست چوڑی دار پائجامے پر انہوں نے مجھے ٹوکا، کہ ٹخنے سے نیچے تک پائچے خلاف سنّت ہیں، ان کی ممانعت ہے، پھر اس میں کوئی خاص فائدہ بھی نہیں کیا ضرورت ہے کہ آدمی بغیر ضرورت اتباع سنّت کے اجر سے محرومی اختیار کرلے، لیکن جب کبھی میں دوسرے ممالک کے

[1] آپ مولانا حیدر حسن خاں صاحب سابق مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے بڑے بھائی تھے۔ "ح"

سفر پر روانہ ہوا تو میرے سوٹ کو کبھی بُرا نہ کہا،

ایک دن لباس کے مسئلہ پر گفتگو ہو رہی تھی، فرمانے لگے،

"اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے، ہر ملک، ہر نسل، اور ہر زمانہ کے لئے، اس لئے مسلمانوں کو کسی خاص لباس و وضع کا پابند نہیں کیا گیا۔

لباس تین ضروریات کی بنا پر پہنا جاتا ہے، حیا کے لئے، زینت کے لئے، اور عافیت کے لئے، اسلام نے ان میں حیا کو اوّلیت کا مرتبہ دیا ہے۔

مولانا اس طرح معمولی بات چیت کے دوران میں بعض اتنی بڑی حقیقتیں بیان کر دیتے تھے کہ برسوں کے مطالعہ سے ایک طالب علم وہاں تک پہنچ سکتا ہے۔

پٹنہ میں ایک بار مولانا کی خدمت میں ہم چند طلبہ حاضر تھے، مجھے ان دنوں سرزمین ہند میں مسلمانوں کی ابتدائی تاریخ پر ایک مقالہ لکھنا تھا، ایک بڑی مشہور علمی کانفرنس میں یہ مقالہ پیش کیا جانے والا تھا، میں اس مقالہ کا خاکہ حضرت کی خدمت میں پیش کر رہا تھا، فرمایا،

"تمہیں معلوم ہے کہ عہد مامون کے بعد سے یوسف لنگاہ کے دور تک تقریباً ساڑھے چار سو سال کی تاریخ سندھ کے متعلق کافی معلومات کیوں نہیں ملتی ہیں؟ —

خود ہی جواب دیا کہ سندھ میں تاریخی تصانیف کا کوئی ذوق پیدا نہیں ہوا تھا، اور دربار خلافت سے منقطع ہو کر طوائف الملوکی نے عرب مصنفین کو ان سے بے تعلق بنا دیا تھا۔"

سید صاحب یہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے شاگرد کوئی درجہ دوم کی تحریر بھی لکھیں، ایک دن مجھے ایک کتاب کی اشاعت پر بڑی سختی سے تنبیہ فرمائی، اور کہنے لگے، "کہ کسی موضوع پر لکھنے کا ارادہ اس وقت کرو جب بقدر امکان اس پر مطالعہ کر کے کافی مواد جمع کر لو، پھر اپنی تحریروں کو اشاعت کے لئے اس وقت تک نہ دو، جب تک دوبارہ و سہ بارہ اس پر نظر ثانی نہ کر لو۔" خاکسار اس زمانہ میں ایک روزنامہ کا چیف ایڈیٹر تھا، عرض کیا کہ حضور ہمارے پاس کسی تحریر کو دوبارہ و سہ بارہ پڑھنے کے لئے وقت ہی نہیں ہوتا، یہ کہاں ممکن ہے کہ مقالات پر بار بار نظر ثانی کی جائے، میں یہ عذر کرتا رہا لیکن مولانا اپنی بات پر اڑے رہے، اور یہی کہتے رہے کہ وقت نکالو۔

مولانا خود اس کے پابند تھے، وہ بڑی احتیاط سے لکھتے تھے، اور لکھنے کے بعد جس طرح بھی موقع ملے، تحریر کو دوبارہ و سہ بارہ ضرور دیکھ لیا کرتے تھے، ان کے ذوق مطالعہ و شوق تحقیق کا یہ عالم تھا کہ بیماری میں بھی کتابوں کا مطالعہ جاری رہتا، اکثر رات کو دیر تک مطالعہ کرتے، اس کے بعد تھوڑی دیر کے لئے آرام فرماتے، اور پھر بیدار ہو کر تہجد، نوافل، اور یاد الٰہی۔

حیدر آباد کے مشہور علمی ادارہ دائرۃ المعارف عثمانیہ کی طرف سے ایک بار کانفرنس ہوئی، ملک کے مشہور اہل علم و تحقیق حضرات تشریف لائے، میں چند نوجوانوں کے ساتھ رات کو مہمان خانہ میں ان بزرگوں سے ملنے کے لئے حاضر ہوا، لوگ باتوں میں مشغول تھے، کہیں کہیں پر قہقہے بھی سنائی دیتے تھے، ہم مختلف کمروں میں لوگوں سے ملتے ہوئے ایک کمرے کے سامنے پہنچے تو دیکھا کہ علامہ سید سلیمان ندوی تنہا بیٹھے ہوئے کسی کتاب کی روڈ گراف کاپی پر غور کر رہے ہیں، مقالہ کے اوراق سامنے

پڑھے ہوئے ہیں، اور قلم ہاتھ میں ہے، ہم نے سلام کیا، انہوں نے جیسے نیند سے چونک کر جواب دیا، خیریت پوچھی، اور اپنے کام میں لگ گئے، دو چار منٹ کے بعد ہم واپس آگئے، راستہ میں مجھ سے ایک نوجوان نے پوچھا، آپ کی رائے میں کس کا مقالہ اس کانفرنس میں سب سے بہتر قرار پائے گا، میں نے کہا سید صاحب کا، آپ نے دیکھا کہ اسے بار بار نظرثانی کرنے کے بعد ان کے ذوق تحقیق کی سیری نہیں ہوئی ہے، حیدرآباد پہنچتے ہی انہوں نے حوالہ کے لئے کتب خانہ آصفیہ سے روٹوگراف کاپی منگوائی، اور اس وقت شاید دسویں بار اس کی نظرثانی کر رہے ہیں، میرا مقالہ بھی تو آپ نے دیکھا ہے، ایک بار لکھ لیا، زیادہ سے زیادہ دوسری بار اسے پڑھ لیا، اور کل کانفرنس میں دہرا دوں گا، بھلا اس قسم کے مقالوں کا سید صاحب کے مقالے سے کیا مقابلہ ہوگا، اور واقعۃً یہی ہوا، کہ اس کانفرنس میں سب سے زیادہ قیمتی مقالہ سید صاحب ہی کا مقالہ قرار پایا۔

برطانوی میوزیم لندن میں ملٹن کی ایک تحریر کا مسودہ رکھا ہے، ملٹن نے اس مسودہ پر سولہ مرتبہ نظرثانی کی تھی، کہا جاتا ہے کہ علامہ ابن تیمیہ المتوفی ۷۲۸ھ نے اپنی ایک کتاب الرد علی المنطقیین کو ستائیس بار دیکھا تھا۔

بات یہ ہے کہ علم کی کوئی انتہا نہیں، اور جو شخص اپنی کسی بات کو انتہائے تحقیق قرار دے وہ ایک ایسا جاہل ہے جسے اپنے جہل کی بھی خبر نہیں، اس لئے اہل علم ہر اس چیز کو جسے دنیا کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں حتی الامکان بہتر سے بہتر شکل دینا چاہتے ہیں۔

سید صاحب کی تصانیف میں سے ارض القرآن کو جو مقام حاصل ہے، اس سے اہل علم اچھی طرح واقف ہیں، یہ کتاب اپنے موضوع پر دنیا کی بہترین کتاب مانی جاتی ہے، لیکن اس کے باوجود جب کبھی ان سے اس کے کسی نئے اڈیشن کی درخواست کی گئی، انہوں نے اس پر نظرثانی اور تکمیل و اضافہ ضروری قرار دیا۔

بہت دن ہوئے ایک زمانہ میں حکومت حیدرآباد نے قانون ٹاڈ کی ترتیب کا فیصلہ کیا، دار المصنفین سے درخواست کی گئی کہ اس کا مسودہ مرتب کرے، اور فقہ حنفی کی پابندی کے ساتھ مرتب کرے، ایک مدت کے بعد یہ مسودہ مرتب ہوا اور حیدرآباد آیا، سید صاحب کو تکلیف دی گئی کہ وہ حیدرآباد تشریف لاکر چند ماہ قیام فرمائیں، اور اس پر نظرثانی کی جائے، مولانا نور الضیاء حیدرآباد کے مشہور فاضل اور ہائی کورٹ کے سابق جج کے ساتھ چند فاضل قانون داں حضرات اور سید صاحب کئی ماہ تک اس کی نظرثانی کرتے رہے، مولانا نور الضیاء نے یہ خدمت میرے سپرد کی تھی کہ ہر دفعہ اور ہر استثناء کا ماخذ فقہ حنفی سے ڈھونڈھ کر حاشیہ مسودہ پر بعینہ درج کر دوں، یہ بڑا دلچسپ کام تھا، اتنے جلیل القدر علماء اور ایسے فاضل قانون دانوں کی بحثیں سننے کا موقع ملتا رہا، ان دنوں میں سید صاحب کو دیکھتا تھا کہ ایک طالب علم کی طرح محنت و دیدہ ریزی کے ساتھ جزئیات پر نظرثانی کرتے تھے، اور اس پوری کمیٹی کے لئے ایک زندہ کتب خانہ اور حوالہ کی ایک جیتی جاگتی کتاب کا کام انجام دیتے تھے۔

اس کام کے دوران میں مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ سید صاحب مسلک کے اعتبار سے حنفی تو ہیں لیکن ایسے حنفی جیسے امام ابو یوسف، امام محمد، اور امام زفر رحمہم اللہ تھے، یعنی وہ یہ خیال نہیں رکھتے کہ کسی ایک مسئلہ میں امام اعظمؒ کی رائے سے اختلاف رکھنا جرم ہے، یا ان اختلافات کی وجہ سے آدمی حنفی مسلک کا آدمی نہیں رہتا، نہ وہ قرآن و حدیث کی طرح فقہ کو غیر متبدل مجموعہ شرعی کا مقام دیتے ہیں، ہاں! وہ اسے البتہ ناپسند کرتے کہ بے تکا پن، شریعت کی پابندی سے آزادی حاصل کرنے کیلئے جہالت کے باوجود کوئی مجتہد علی الاطلاق ہونے کا مدعی بن بیٹھے۔

وہ چاہتے تھے کہ فقہ کی تشکیل جدید کی جائے، تمدن جدید نے جو جدید مسائل پیدا کئے ہیں ان کے لئے قرآن و حدیث کی

روشنی میں حل پیدا کئے جائیں، وہ اسلامی تاریخ کے سب سے بڑے ماہر سمجھے جاتے تھے، وہ یہ اچھی طرح جانتے تھے کہ نہ فقہ کے ابتدائی مرتبین نے اور نہ ان کے بعد، ان کے عظیم المرتبت جانشینوں نے کبھی فقہ کو ہر زمانہ میں یکساں طور پر بغیر ترمیم واجب العمل قرار دیا تھا، اور نہ آج یہ ممکن ہے، اس لئے فقہ پھر سے مرتب ہو تو قابل عمل ہو گی ورنہ اس کے حصۂ معاملات پر پوری طرح عمل شاید آج ممکن نہ ہو سکے گا، بات یہ ہے کہ ہمارے علمائے کرام میں سے صرف علامہ ندوی ہی صرف وہ شخص تھے جو اسلامیات پر ماہرانہ نظر کے ساتھ دور حاضر کے مسائل سے واقف تھے، اس لئے وہ ان دقتوں سے بھی کماحقہٗ واقف تھے جو عمل کے سلسلہ میں پیش آسکتی ہیں، اور ان وسعتوں اور پابندیوں پر بھی نظر رکھتے تھے، جن کے مجموعہ کا نام شریعت اسلامی ہے۔

سید صاحب اگرچہ اپنی قوم کی ضروریات سے مجبور ہو کر سیاسی خدمات بھی انجام دیتے رہے، انہوں نے تحریک ترکِ موالات میں بڑا کام کیا، خلافت کانفرنس، اور جمعیتہ علمائے ہند و جمعیتہ علمائے اسلام کی صدارت کی، آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے کچھ دنوں تک رکن بھی رہے، وفد حجاز کی قیادت کی، وفد خلافت کے رکن ہو کر لندن میں کام کیا لیکن ان ساری خدمات، اور اچھے سیاست داں ہونے کے باوجود سیاست کار نہ تھے، اُن کو خداوند تعالیٰ نے ایک عالم و محقق کی طبیعت عطا فرمائی تھی، اور یہی ان کا مزاج تھا، اُن کو سیاسیات میں وہ انہماک نہ ہوتا تھا، جو سیاست کاری کے لئے ضروری ہے، وہ لندن میں برطانوی میوزیم کی لائبریری سے بے نیاز ہو کر ان پارلیمان سے ملاقاتوں میں وقت صرف کر دینا اپنے لئے کچھ بہت اچھا نہیں سمجھتے تھے۔

وہ اس دو عملی کو جو انگریزی سیاست کاری کی وجہ سے ہماری قومی تعلیم میں پیدا ہو گئی ہے، عربی مدارس اور انگریزی کالجوں کے درمیان کی خلیج ناقابل عبور بن گئی ہے، اپنی قوم کے لئے نہایت مضر سمجھتے تھے، انہوں نے اپنی ساری زندگی میں ہر مناسب موقع پر خطبات، اور تقریروں میں اس کے خلاف آواز اٹھائی، وہ چاہتے تھے کہ پورے نظام تعلیم کو یکسر بدل دیا جائے، اور ایسا نظام پیدا کیا جائے، جس میں ایک اچھا قانون داں اچھا فقیہ بھی ہو، ایک انجینئر علم دین سے خاصا واقف نکلے، اور ایک گورنر خود صاحب افتا عالم کی خدمت بھی انجام دے سکے، لیکن اس میں دونوں طرف سے ڈھیل ہی نہیں بلکہ کسی قدر مخالفتیں بھی ہوتی رہیں، دونوں گروہ اپنی اپنی مملکت کے حدود دوسرے گروہ والوں کے لئے حدود ممنوعہ بنائے رکھنے پر مصر رہا، اور اس کا جو نتیجہ نکلا وہ آج ہمارے اور آپ کے سامنے موجود ہے۔

علم و فضل کے اس مرتبۂ اعلیٰ کے علاوہ جس پر سید صاحب مرحوم فائز تھے، سید صاحب کی زندگی میں سیرت و کردار کی ایسی تابناکیاں موجود تھیں کہ

یک نفس در صحبتے با اولیار
بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

کا مشہور شعر ان کی محفل میں ایک حقیقت نفس الامری بن جاتا تھا، میں نے پچھلے اکتیس بتیس سال میں کبھی ان میں نہ خشونت دیکھی، اور نہ مداہنت و مصلحت پرستی، پچاس سال مشغول مدت میں کسی معاصر نے یہ شکایت نہ کی، کہ سید صاحب کے قلم یا زبان سے اسے کوئی گزند پہنچا ہے، وہ اپنی محفلوں میں معاصرین کا تذکرہ نہ مبالغہ کے ساتھ کرتے تھے اور نہ تخفیف و استہزا کے ساتھ، یہی حال ان کی تحریروں کا تھا، آج بھی ان کے وہ نوٹ موجود ہیں جو مشاہیر کی وفات پر یا ان کی زندگی میں انہوں نے بعض لوگوں کے

متعلق لکھے ہیں کہیں آپ کو یہ کمزوری نظر نہ آئے گی، اور تو اور خود اپنے استاذ شبلی نعمانی کے متعلق لکھ دیا کہ

بہرحال شبلی شبلی تھے، جنید و شبلی" نہ تھے !

ایک بار کا ذکر ہے کہ یہیں کراچی میں ایک شخص نے ان کی خدمت میں ایک واقعہ بیان کیا، ایک صاحب کے وہ الفاظ نقل کئے جو انہوں نے سید صاحب کے متعلق کہے تھے، الفاظ کیا تھے خاصی گالیاں تھیں، اور وہ بھی بے جا، بے قصور، اور بلا وجہ، لیکن سید صاحب نے ایک خاموشی کے ساتھ برداشت کرلیا، جب بیان کرنے والے صاحب جانے لگے تو بڑے اطمینان اور نہایت شفقت کے ساتھ انہیں سمجھا دیا کہ ایک جگہ سُنی ہوئی بات دوسری جگہ پہنچانا کچھ اچھا کام نہیں، گناہ ہے، آپ نے جن صاحب کا ذکر کیا میں ان کی خوبیوں کا قائل ہوں، ان کے درشت الفاظ سے میں اپنی رائے نہیں بدل سکتا، چلو بات ختم ہوئی، بیان کرنے والے صاحب کی ایسی اصلاح ہوئی، کہ پھر دو تین سال کی مدّت میں انہیں ایسی باتیں کرتے میں نے نہیں دیکھا۔

ایک زمانہ میں حیدرآباد دکن سے سید صاحب کے نام مبلغ دوسو روپیہ ماہانہ کا علمی وظیفہ جاری ہوا؛ فرمان شاہی ہو گیا تھا، کچھ دفتری اندراجات میں پیروی کی ضرورت تھی، میں نے عرض کیا کہ فرمائیں تو میں اس کے دفتری مراحل طے کرادوں، ایک دن تو فرمایا کہ بہت اچھا صیغۂ حساب میں جاکر پیروی کر دینا، دوسرے یا تیسرے دن جب میں نے پھر عرض کیا تو فرمانے لگے، جانے دو نظام چاہتے ہیں کہ اس وظیفہ کے بدلے میں میرا ایمان خرید لیں، اب مجھے یہ وظیفہ منظور نہیں، مجھے حیرت ہوئی، جب دریافت حال کیا تو معلوم ہوا کہ ایک اجتہادی مسئلہ میں نظام نے مولانا سے اپنے موافق رائے کی درخواست کی تھی، مولانا نے نہ صرف اختلاف کیا بلکہ منظورہ وظیفہ سے بھی متنفر ہوگئے،

اسی طرح ایک بار مجلس اتحاد المسلمین کے مرکز دارالسلام میں سید صاحب تقریباً بیس پچیس ہزار کے مجمع کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدنی زندگی کے حالات بتا رہے تھے، تقریر کے اختتام پر ایک نوجوان نے سوال کیا، کہ مولانا ! اسلام میں بادشاہ کا کیا مقام ہے ؟ — حیدرآباد کی دُنیا میں جہاں مطلق العنان بادشاہت کار فرما تھی، اور شاہی چشم و ابرو کے اشارہ سے قسمتیں بدل جاتی تھیں، اس قسم کے سوالات کا جواب دینا کچھ آسان کام نہ تھا، مصلحت بینی کو بہتوں کے ایمان و تقویٰ پر غالب آتے ہوئے میں نے دیکھا ہے، سوال سُن کر میں اور سارا مجمع گوش بر آواز ہوگیا، لوگ نہ جانے کس کس طرح الفاظ کے گورکھ دھندے میں جواب کے گم ہونے کی امید کر رہے تھے، لیکن اللہ تعالیٰ اپنی رحمتوں میں جگہ دے علامہ سید سلیمان ندوی کو، انہوں نے نہایت اطمینان دسکون کے ساتھ واضح الفاظ میں اعلان کردیا کہ

" اسلام میں کسی قسم کی بادشاہت کے لئے کوئی گنجائش نہیں، اور نہ کسی غاصب اختیارات کی اطاعت کرنا جائز ہے ۔"

سارا مجمع چپ تھا، اور تو اور نواب بہادر یار جنگ چپ تھے، اور بولے تو صرف اسی قدر کہ" سبحان اللہ و بحمدہ، حق تو یہی ہے جو حضرت نے فرمایا"

اس حق گوئی کا نتیجہ وہی نکلا جو متوقع تھا، دوسرے ہی دن مولانا کو حیدرآباد میں تقریروں سے ممانعت کردی گئی، اور شاید تیسرے چوتھے دن مولانا وہاں سے واپس چلے آئے۔ یہ مضمون طویل ہوتا جا رہا ہے، حالانکہ ارادہ چند سطور میں اپنے تاثرات قلم بند کرنے کا تھا اسلئے یہیں ختم کرتا ہوں علامہ سید سلیمان پر بہت کچھ لکھا جائے گا، اور یقیناً لکھا جانا چاہئے، کسی قوم میں اتنے بڑے لوگ روز روز نہیں پیدا ہوتے، اقبال نے سچ کہا ہے، ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے ؎ بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

علامہ سیّد سلیمان ندوی

سید احمد اللہ ندوی

علامہ سید سلیمان ندوی نے دُنیا کی ۷۰ بہاریں دیکھیں اور ۱۴ ربیع الاول ۱۳۷۳ھ مطابق ۲۲ نومبر ۱۹۵۳ء کو سدا بہار باغ جنت کی طرف رحلت کی۔ آپ نیک نفس، پاک طینت، خوش اخلاق، کم گو، بامروّت، عالم باعمل، صائب الرائے، مُستقیم المزاج، باعزم، ملّت کے رُکن رکین، اور جماعت علماء کے فرد فرید تھے، کُتب بینی کے گرویدہ، علمی تحقیق کے دلدادہ، اور وضعداری کے پابند تھے، پست آواز سے گفتگو کرتے اور علمی فیض رسانی کے خواہاں رہتے تھے، آپ کے حلقۂ صحبت میں نئے اور پُرانے دونوں خیالات کے حضرات شریک رہتے تھے، آپکی قلمی قوت لسانی قوت سے زیادہ کامیاب تھی۔

آپ کے لازوال نقوش سُلیمانی حیات نو کیلئے لاکھوں افرادِ ملّت کے دل ودماغ کو مُسخر کر چکے ہیں، یہ نقوش حکومت الٰہیہ کے قیام کیلئے مشعل ہدایت کا کام دے رہے ہیں، یہ نقوش علمائے امت کو انکے فرائض دینی اور واجبات مذہبی کیطرف متوجہ کر رہے ہیں، اور یہ نقوش پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا اُسوۂ حسنہ پیش کر کے عالمِ اسلام کو روشن چراغ دکھا رہے ہیں۔

علامۂ مرحوم بیسویں صدی کے پہلے عشرہ میں ہندوستان سے پہلے عربی ممالک کے علمی حلقے سے رُوشناس ہوئے جبکہ آپکے عربی مضامین لکھنؤ کے عربی رسالۂ "البیان" میں شائع ہوتے تھے۔

جب علامہ شبلی نعمانی مرحوم نے ندوۃ العلماء کے طلبہ میں سے چند ممتاز طالب علموں کو انتخاب کر کے خاص اپنے حلقۂ تلمذ میں لیا تو اُن میں ایک علّامہ سُلیمان کی ذات بھی تھی، علامہ نعمانی نے ان تلامذہ کے مخفی جوہروں کو اُبھارنے کیلئے غیر معمولی توجہ سے کام لیا اور سچ تو یہ ہے کہ اُنھوں نے اپنا دل پاک کر کے اپنے علمی فیوض کو ان شاگردوں پر نچھاور کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض تلامذہ قطب بن کر مخصوص مستقر پر جم گئے اور اپنی علمی ضیاپاشی سے گم کردہ راہوں کیلئے دلیلِ راہ کا کام دینے لگے، لیکن علّامہ سید سلیمان شمس دوّار کی طرح ہند سے مصر گئے، مکہ مکرمہ گئے، کابل گئے۔ فرانس اور لندن گئے، اور ہند کے شہر شہر کا دورہ کیا اور اپنے انوارِ علم سے جگ کو روشن کر دیا۔

وُہ علمی حیثیت سے بیک وقت عربی اور اردو کے ادیب، فن رجال کے ناقد، علم حدیث کے مبصر، اسلامی تاریخ کے امام، اور کلام الٰہی کے واقف اسرار تھے، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رح کے فیضِ صحبت سے مشرف ہونے کے بعد اسلامی تصوف کے رنگ میں بھی رنگ گئے تھے۔

عملی حیثیت سے وہ ناظم تعلیم ندوہ، ناظم دار المصنفین، رُکن دایرۃ المعارف حیدرآباد دکن اسی طرح اور مختلف اداروں کے رُکن اور مشیر تھے پاکستان تشریف لانیکے بعد بورڈ تعلیمات اسلامیہ اور جمعیۃ علمائے اسلام کی صدارت کی خدمات انجام دیں۔

حیدرآباد دکن آپ اکثر تشریف لے جاتے تھے، جب آپ وہاں تشریف فرما ہوتے تو جامعہ عثمانیہ کے طلبہ اور اساتذہ کا مجمع آپکے حلقۂ صحبت میں بھرا رہتا تھا۔

ایکدفعہ جامعہ عثمانیہ کے اساتذہ کی استدعا پر آپ نے "اسلامی تاریخ" کے عُنوان پر کالج میں ایک بسوط تقریر فرمائی، میں بھی اس جلسہ

میں موجود تھا، آپکی پوری تقریر قیمتی معلومات سے لبریز تھی، تاریخی مواد کی فراوانی کا یہ حال تھا کہ طلبہ کے علاوہ جامعہ کے پروفیسر بھی آپکی تقریر کے نوٹ لکھتے جاتے تھے، اس محاضرہ میں آپ نے فرمایا کہ انگریزی لفظ "ہسٹری" جسکے معنے تاریخ کے ہیں ممکن ہے کہ عربی لفظ "اُسْطُورہ" سے لیا گیا ہو، عربی میں بھی اُسطورہ کے معنی تاریخ کے ہیں۔

اسکی جمع "اساطیر" ہے، قرآن پاک میں "اساطیرُ الاوّلین" آیا ہے جسکا مطلب ہے اگلے لوگوں کی تاریخ اسلامی تاریخ میں جتنی اُمہات الکتُب ہیں آپ نے اُنکے اور اُنکے مصنفین کے نام، اوران تاریخی کتابوں کی خصوصیات کو وضاحت سے بیان فرمایا، اس تقریر کو سُن کر سارا مجمع جو اہل علم کا تھا عش عش کرنے لگا، تعجب کی بات یہ تھی کہ پوری تقریر جس میں بکثرت سن و سال کا تذکرہ تھا، بغیر کسی تحریری یادداشت کے جاری رکھی۔

ایک دفعہ حیدرآباد دکن میں کنگ کوٹھی (قصر شاہی کا نام) کے نواح میں محفل میلاد بہت بڑے پیمانہ پر منعقد کی گئی۔ وقت نامہ میں منجملہ مقررین کے جناب علامہ شبیر احمد عثمانی مرحوم اور جناب علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم کے اسمائے گرامی بھی درج تھے جو اس زمانہ میں اتفاقاً یہ دونوں جلیل القدر ہستیاں حیدرآباد میں موجود تھیں، ان دونوں بزرگوں نے جلسہ میں شرکت فرما کر محفل کی رونق کو دوبالا کر دیا، نظام دکن شاہ عثمان بھی مدعو تھے وہ بھی تشریف لائے، اذن عام تھا خلقت کا خاصہ ہجوم تھا، مقررین میں علامہ سید سلیمان کا نام نامی اول تھا آپ ایستادہ ہوئے اور "بعثت نبوی کی ضرورت" پر تقریر فرمائی جو پُر مغز تھی مگر بہت مختصر چند منٹ تک خطاب کرنے کے بعد آپ اپنی تقریر ختم کرنے گے فوراً شاہ عثمان نے جو ذرا دور بیٹھے تھے اپنی مشہور بلند آواز کے لہجہ میں کہا مولوی صاحب تقریر بہت اچھی ہے سلسلہ جاری رکھئے اس شاہی حکم پر مزید چند منٹ تک اور آپ نے تقریر فرمائی اور جلد تقریر ختم کردی، اسکے بعد مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم کی باری آئی، آپ نے اپنے خاص انداز خطابت میں سیرۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کے عنوان پر تقریر فرمائی جو مطول تھی اور جسے حاضرین نے بہت پسند فرمایا، اختتام جلسہ کے بعد حاضرین میں راہ چلتے ہوئے چہ میگوئیاں شروع ہوگئیں، ایک فریق کہتا تھا کہ علامہ ندوی پر رُعب شاہانہ غالب آگیا جسکی وجہ سے وہ زیادہ دیر تک تقریر نہ کرسکے، دُوسرا فریق کچھ اور توجیہ کرتا تھا کوئی کچھ کہتا اور کوئی کچھ۔ لیکن اصل وجہ یہ تھی کہ علامہ ندوی کی طبیعت اس روز کچھ بے لطف تھی صرف اپنی ذاتی مروت اور بانی محفل کے اصرار سے شرکت محفل میلاد اور خطابت پر رضامند ہوئے تھے دوسرے یہ کہ آپ بادشاہوں کی نفسیات سے واقف تھے کہ وہ لمبی تقریروں کو پسند نہیں کرتے ہیں جیسا کہ عثمان علی پاشا کی عادت ہے کہ وہ نماز جمعہ میں بھی امام کو قُل جیسی سورتوں اور آیتوں کے پڑھنے کی ہدایت کرتے ہیں، ان وجوہ کی بنا پر اس روز آپکی تقریر مختصر مگر جامع اور مانع تھی اور خیر الکلام ما قَلَّ وَدَلَّ کے اُصول پر مبنی تھی۔

علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم کو حیدرآباد دکن کے علمی و عربی محکمہ دائرۃ المعارف سے (جہاں عربی کے نوادر مخطوطات طبع ہوتے ہیں۔) والہانہ محبت تھی، جب محکمہ سے کوئی کتاب طبع ہوکے شائع ہوتی تو فوراً اس پر سیر حاصل تبصرہ لکھ کے اپنے رسالہ "معارف" میں شائع فرماتے اور جب کبھی حیدرآباد دکن تشریف لے جاتے تو بہ نفس نفیس اس محکمہ میں زحمت گوارا فرما کر قدم رنجہ فرماتے اور کارکنان دائرہ کی دلجوئی فرماتے اور اپنے مفید معلومات سے اہل دائرہ کو مستفید فرماتے دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن سے آپ کو محبت کیوں نہ ہوتی جبکہ اسی کی مطبوعات تہذیب التہذیب لسان المیزان، تذکرۃ الحفاظ، تاریخ کبیر وغیرہ رجال کی کتابوں نے آپ کو فن رجال کا نا قد بنایا، حاکم کی المستدرک، اور امام بیہقی کی السنن الکبریٰ کے مطالعہ نے آپ کو فن حدیث کا مبصر بنایا، جب آپ کسی عنوان پر قلم اُٹھاتے تو اسکے مواد حاصل کرنے کیلئے جسقدر اور جہاں بھی کتابیں ملتی تھیں اُنکا مطالعہ فرماتے اور اپنے عنوان کیلئے چھوٹے سے چھوٹا واقعہ بھی نوٹ کرلیتے تھے، یہی وجہ ہے کہ آپکی تمام تالیفات اور تصنیفات میں حوالہ کا بہت بڑا ذخیرہ (جو عیب اور لفاظی) سے مُبرّا، آپ جس ملک اور شہر میں جاتے وہاں کا کتبخانہ ضرور دیکھتے اور اس کتبخانے کی مشرقی نادر کتابوں کی ایک فہرست ضروری معلومات کیساتھ بروقت قلمبند فرماتے اور پھر بعد ازاں ان کتابوں پر تفصیلی تبصرہ لکھ کے ایک خاص مقالہ تیار کرتے

اور اپنے رسالہ معارف میں شایع فرما دیتے، ساتھ ہی ساتھ عمارتوں کے کتبوں کی عبارتیں نقل فرماتے اور وقت ضرورت اس سے کام لیتے۔

ایکدفعہ میں نے شہر متھرا کے تذکرہ کے سلسلے میں آپ سے کہا کہ جامع مسجد کے کتبے میں یہ اشعار میں نے لکھے ہوئے دیکھے ہیں آپ نے فرمایا ہاں میری یادداشت میں وہ اشعار لکھے ہوئے ہیں۔

آپ ملت اسلامیہ کے کسی مسئلہ کو طبقاتی یا وطنی نظریہ سے دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے بلکہ وہی نظریہ پسند فرماتے تھے جسمیں مجموعی حیثیت سے پوری ملت کو فائدہ پہونچتا ہو چنانچہ جناب معالی وزیر عبدالوہاب عزام پاشا سفیر مصر برائے پاکستان کے اعزاز میں جمعیتہ علمائے اسلام کیطرف سے نگار ہوٹل میں جلسۂ عصرانہ منعقد کیا گیا جسکی صدارت علامہ مرحوم نے کی اسوقت آپ نے عربی زبان میں تقریر کی، اثنائے تقریر میں ارشاد فرمایا کہ لندن جاتے ہوئے جب میں فرانس پہونچا اور پیرس کے ایک ہوٹل میں ٹھہرا اتفاق سے اسی ہوٹل میں مصر کے زعیم وقت (غالباً مولانا نے سعد زغلول پاشا کا نام لیا) بھی تشریف فرما تھے عندالملاقات میں نے اُن سے کہا کہ اس دور میں پوری ملت اسلامیہ یکساں مشکلات میں مُبتلا ہے، متحدہ قوت سے ملت کو ان مشکلات کا مقابلہ کرنا چاہئے اور اسے صرف ایک مُلک کے مسلمانوں کا مسئلہ نہ سمجھنا چاہئے، موجودہ مشکلات سے گلوخلاصی کی ضرورت جسطرح مصر کو ہے اسی طرح ہندوستان، ایران، انڈونیشیا، ٹرکی تمام عرب ممالک اور شمالی افریقہ کو بھی ہے، مصر کو یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ صرف وطنی نعرہ بلند کر کے وہ استقلال نہیں حاصل کر سکتا ہے اُسے بھی پورے عالم اسلام سے تعاون حاصل کرنیکی ضرورت ہے۔

ایکدفعہ علامہ مرحوم نے مولانا شاہ سلیمان پھلواری کی وفات کے تذکرہ کے سلسلے میں فرمایا کہ ضلع عظیم آباد پٹنہ کے تین سُلیمان دین کی خدمت انجام دے رہے تھے، مولانا سلیمان اشرف علیگڑھ کالج میں دینیات کے پروفیسر اور محلہ میرداد بہار شریف کے رہنے والے تھے، مولانا قاری شاہ سلیمان ندوہ کے پُرانے رکن اور پھلواری شریف کے باشندہ تھے۔ یہ دونوں بزرگ دُنیا سے رُخصت ہو چکے اب اس سُلیمان (اپنی طرف اشارہ کر کے) کی باری ہے، اللہ تعالےٰ نے آپ کو اس تذکرہ کے بعد بھی کافی عرصہ تک دینی خدمت کے انجام دینے کا موقع عطا فرمایا۔

علامہ مرحوم کو اپنی نرینہ اولاد کے تسمیہ میں حرف س کی خاص دلچسپی تھی چنانچہ محل اولی کے صاحبزادے کا نام سہیل اور محل ثانیہ کے صاحبزادے کا نام سلمان رکھا، اللہ تعالےٰ ان دونوں صاحبزادوں کی عمریں دراز کرے اور دینی خدمت کا اہل بنائے۔

دینی مسائل کے سمجھنے میں جب مجھے اُلجھنیں ہوئیں، تو دو ایک دفعہ علامہ مرحوم کی طرف بھی رجوع کیا۔ ایکدفعہ قرآن کی دو آیتوں میں تطبیق دینے میں مجھے اشکال پیدا ہوا ایک آیت میں انسان کی تخلیق مٹی سے بتائی گئی ہے، اور دوسری آیت میں ہر جاندار کی تخلیق پانی سے ظاہر کی گئی ہے انسان میں بھی جان ہے اسلئے وہ بھی پانی سے پیدا کیا گیا ہوگا۔ اس اشکال کو دور کرنے کیلئے میں نے علامہ کیطرف رجوع کیا آپ نے ارشاد فرمایا پانی سے مُراد نطفہ ہے اس جواب سے مجھے اطمینان ہوگیا۔

یوں تو ہم مدرسہ ہونیکی وجہ سے علامہ مرحوم سے میرے تعلقات تھے ہی اور جب سے آپکے بھانجے مولوی فخرالملک ندوی ام اے کی شادی میری بھتیجی سے ہوئی یہ تعلقات اور شگفتہ تر ہو گئے تھے اسی رشتہ کی وجہ سے کبھی کبھی مجھ سے آپ ظرافت کے لہجے میں باتیں کرتے تھے۔

موجودہ دور میں علامہ مرحوم دینی علوم کے جبل تھے افسوس ہے کہ یہ کوہ زخار سرزمین پاکستان کے دارالحکومت کراچی میں اپنے رفیق علم حدیث مولانا شبیر احمد عثمانی کے پہلو بہ پہلو زیر زمین ہمیشہ کیلئے متمکن ہوگیا، ایک رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کتاب مسلم شریف کے شارح تھے اور دوسرے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث حیات سیرۃ نبوی کے شارح تھے۔

جنازہ کی مشایعت میں مہمانان کراچی کے کثیر مجمع کے علاوہ معالی سفیر مصر عبدالوہاب عزام پاشا معالی سفیر سعودی عرب [illegible] اور [illegible] مولانا ابوالخیر العرقسوسی بھی شریک تھے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان دونوں محدثوں کو فردوس بریں میں جگہ عطا فرمائے اور ان دونوں کے مرقد مبارک کو اپنی رحمت کے انوار سے منور فرمائے۔ آمین۔

آہ سیّد العلماء

حکیم نصیر الدین ندوی

حضرت مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات پر، درحقیقت ہمارے قدیم علوم ختم ہوگئے، گزشتہ صدی کے مختلف مکاتبِ خیال کے فقید المثال علماء کے علمی کمالات، صحت و اعتدال کے ساتھ، قدرت نے سید العلماء کی ذاتِ گرامی میں جلوہ گر کر دئے تھے۔

ولیس علی اللہ بمستنکر

ان یجمع العالم، فی واحدٍ

مولانا سید سلیمان صاحب ندوی کے علمی کمالات، اور ان کی بلند پایہ ادبی و تاریخی تصنیفات پر مستقل، مفصل، اور جامع مقالہ لکھنے کے لئے جمعیتِ خاطر کے علاوہ مکروہات روزگار سے بھی نجات کی ضرورت ہے، اور بدقسمتی سے میں جمعیت خاطر سے بھی محروم ہوں اور مکروہات روزگار میں بھی گرفتار ہوں، مولانائے مرحوم کی جنابِ اقدس میں، مجھے گوناگوں خصوصیات حاصل رہی ہیں، اور اُن کا اقتضا یہ ہے کہ بطورِ ادائے حقوقِ بزرگانہ، میں اُن کے متعلق، دل کھول کر، بہت کچھ لکھوں، مگر افسوس کہ فقدانِ فرصت، اور دل کی عدمِ جمعیت کی بناء پر، اپنے اس فریضہ کی ادائیگی سے محروم ہوں، اور بر سرِ دست، حضرت مولانا مرحوم کے باطنی کمالات اور اخلاقی تعلقات کے متعلق اپنے ذاتی مشاہدات، عرض کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

آج اکنافِ عالم میں کوئی ملک ایسا نہیں ہے جہاں کے اربابِ فضل و کمال نے مولانا مرحوم کی محققانہ علمی تصنیفات سے استفادہ نہ کیا ہو، اور کسی نہ کسی اعتبار سے ان کو مولانا کی بارگاہِ قدس میں شرفِ تلمّذ نہ ہو، مگر میرے نزدیک، مولانا کی شخصیت کو جو مزیت اور شرف حاصل ہے، وہ اُن کے باطنی کمالات، اور خلقِ محمدی کا مظہرِ اتم ہونے کے اعتبار سے ہے، اور یہ ایسا شرف ہے جو پوری اسلامی تاریخ میں چند نفوسِ قدسیہ کے علاوہ کسی کو حاصل نہیں ہوا، یہی وجہ ہے کہ قلمِ قدرت نے موصوف کے مبارک ہاتھوں سے سلسلۂ کائنات اور فخرِ موجودات کی ایسی گراں مایہ "سیرت" لکھوا دی، جس کی نظیر آج تاریخ عالم میں موجود نہیں، سیرۃ النبی کے عالم وجود میں آجانے سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح ثابت ہو گئی ہے کہ سیرت نگاری کا حق اُس وقت تک ادا ہو ہی نہیں سکتا، جب تک تائیدِ ایزدی کے ساتھ ساتھ سیرت نگار خلقِ محمدی کا مظہرِ اتم نہ ہو، زورِ بازو، اور وفورِ علم اس کے لئے کافی نہیں، یہ سعادتِ عظمیٰ اور محبوبیتِ کبریٰ صرف عطیۂ الٰہی ہے،

این سعادت بزورِ بازو نیست

تا نہ بخشد خدائے بخشندہ!

میری زندگی کے جو چند دن و سال اُن کے سایۂ عاطفت میں بسر ہوئے ہیں انہیں میں اپنی زندگی کا حاصل سمجھتا ہوں، اور اُن کی وفات کے بعد جو لمحاتِ حیات باقی ہیں، وہ میرے نزدیک بالکل رائیگاں اور عبث ہیں،

ایام ہماں بود، کہ باشیخ بسر رفت

باقی ہمہ بے حاصلی و بے خبری بود!

وہ جب میرے کاشانۂ ویراں میں جلوہ افروز ہوتے تھے، تو میں اپنے ویران کدے کو رشکِ گلستاں سمجھنے لگتا تھا، متبسم اور پُرنور چہرے کے ساتھ تشریف لاتے تھے، مسندِ مطب پر متمکن ہوجاتے تھے، اور ایک طبیب اجسام کے روحانی اسقام کا ازالہ اپنے کلماتِ طیبات سے گھنٹوں فرماتے رہتے تھے، کبھی الماری سے اپنے ذوق کی کتاب نکال کر مطالعہ فرمانے لگتے، کبھی میری میز پر رکھے ہوئے جرائد صدق و معارف کے مطالعہ میں مصروف ہوجاتے، اور اگر کبھی اتفاقاً انہیں لمحاتِ فرصت میں کھانے کا وقت آجاتا تو میری عرض و التجا پر برادر محترم عالم میاں، اور برادر عزیز سلمان میاں کے اصرارِ مراجعت کے باوجود کر، توقف فرماتے اور ماحضر تناول فرماکر مجھے کلاہِ گوشۂ دہقاں بآفتاب رسید کا مصداق بنا دیتے،

وہ طبیبِ ارواح اور معالجِ نفوس تھے، مجھے اُن کی ذاتِ اقدس کے ساتھ جتنی بھی نیازمندانہ نسبتیں حاصل تھیں، اُن میں سب سے اہم نسبت یہی تھی، اور وہ ہمیشہ درپردہ میرے باطنی احوال کی نگرانی فرماتے رہے، گزشتہ سے پیوستہ سال جب اجمیر سے میرے والد ماجد قبلہ مدظلہ العالی کی شدید علالت کی مبہم خبریں مختلف ذرائع سے آنے لگیں تو میں سراسیمہ و پریشان ہوکر ان کی خدمتِ گرامی میں حاضر ہوا، اور عرض کیا کہ خود والد ماجد قبلہ اپنے مکاتیبِ گرامی میں علالت کی شدت کا اظہار نہیں فرماتے ہیں، اور مجھے آنے سے روکتے ہیں، مگر اجمیر کے دوسرے مخلص بزرگ اُن کی صحت کو انتہائی نازک مرحلہ میں بتاتے ہیں، ایسے حالات میں، میں کیا کروں،--- ارشاد فرمایا کہ انشاءاللہ اُنہیں اس بیماری سے صحت حاصل ہوگی، مگر تمہارے اجمیر نہ جانے میں خطرہ ہے، اپنے مرشد کے اس ارشاد سے جہاں مجھے اپنے والد ماجد قبلہ کی صحت کی طرف سے طمانیت ہوئی، وہاں سفر کے لئے بھی میرا اضطراب بڑھ گیا، اور میں دو ہی دن میں سفر کا اہتمام کرکے، اور ویزا حاصل کرکے عازمِ اجمیر ہوگیا، جب میں اجمیر پہنچا، اور والد ماجد قبلہ کو دیکھا تو شدتِ علالت کی وجہ سے اُن میں آثارِ زندگی تقریباً معدوم تھے، مگر باوجود فقدانِ آثارِ صحت، میرے دل پر اُن کی صحت کی جانب سے جذبۂ یاس طاری نہ ہوا، اجمیر کے چند روزہ قیام میں مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہوگئی، کہ اگر میں وقت پر اجمیر نہ پہنچتا تو خطرہ ظہور پذیر ہوکے رہتا، اس لئے کہ میرے والد ماجد قبلہ کے ایک رفیقِ خاص، باوجود ادعائے دوستی کے، اپنی دانست میں، والد ماجد کے سفرِ آخرت کا مکمل اہتمام کرچکے تھے اُن کی متروکہ متاعِ دنیوی پر متصرف ہونے کے لئے ___ جو کچھ حضرت کی نگاہِ باطن نے کراچی میں دیکھا تھا اُس کا مجھے اجمیر میں مادی آنکھوں سے مشاہدہ کرادیا، اس واقعہ کو جس کا دل چاہے جیسی روشنی میں دیکھے، مگر میرا اعتقاد اپنی جگہ سے تزلزل نہیں کرسکتا۔

وہ اپنے خدام کے مربی و سرپرست تھے، اور بلا اُن کی خواہش کے اُن کے درد کا درماں بن جاتے تھے، ایکبار میرا مالکِ مکان میرے درپئے آزار ہوگیا، اور محض مادی منفعت کی خاطر مجھ سے تخلیۂ مکان کا مطالبہ کردیا، اس کے پاس دولت بھی تھی، اور زور و قوت بھی، حضرت کو جب میری پریشانی کا حال معلوم ہوا تو مضطرب ہوگئے، بنفسِ نفیس تشریف لائے، اور ارشاد فرمایا کہ اس سلسلے میں کچھ جد و جہد کروں، میں نے عرض کیا کہ حضور صرف دُعا فرمائیں، حضور کی ذاتِ گرامی ایسے چھوٹے کاموں سے کہیں ارفع و اعلیٰ ہے، ارشاد فرمایا کہ نہیں میں دعا کے ساتھ دوا بھی کرنا چاہتا ہوں، دوسرے روز جب تحقیقِ احوال کے لئے میں نے اپنے محترم خان بہادر سید رضا حسین صاحب کو کلکٹر کے آفس میں بھیجا، تو انہوں نے واپس آکر ارشاد فرمایا کہ اب اس سلسلے میں نہ کسی جد و جہد کی ضرورت ہے نہ سفارش کی، اس لئے کہ جب میں کلکٹر کے آفس میں گیا تو وہاں ایک ہنگامہ برپا تھا اور افسروں سے لیکر کلرکوں تک کی زبان پر یہی تھا کہ حکیم صاحب کے معاملہ میں خود مولانا سید سلیمان صاحب ندوی سفارش کے لئے تشریف لائے تھے، اور یہ کام بہت جلد ہوجانا چاہئے، مجھے چند ہی دن میں مکان کا الاٹمنٹ مل گیا، اور میرا مالک مکان آج تک خائب و خاسر ہے، اور لطف یہ کہ مکان بھی اس کے تصرف سے باہر ہے، اللہ اللہ، اپنے خدام کی یہ عزت افزائیاں، اور چارہ سازیاں، ایسے آقا کسے نصیب ہوتے ہیں۔

گرچہ خوردیم نسبتیست بزرگ
ذرہ آفتاب تابانیم

میرے عزیز دوست مولانا محمد ناظم صاحب ندوی، اپنی میعادِ ملازمت ختم کرنے کے بعد جب سعودی سفارت خانے سے بے تعلق ہوئے، تو بے روزگاری کی وجہ سے اُن کے اوقات پریشان ہوگئے، تعلق خاطر کی وجہ سے اُن کے احوال پریشاں سے میری طبیعت بھی اثر پذیر ہوئی، اتفاقاً انہیں ایام میں جامعہ عباسیہ بہاولپور میں شیخ الجامعہ کی جگہ خالی ہوئی، اور شیخ الجامعہ کا انتخاب جو کمیٹی کرنے والی تھی، اس میں سب سے اہم شخصیت حضرت مولانا سید سلیمان ندوی ہی کی تھی، ایک دن، حسبِ عادت جب حضرتِ اقدس، میرے ظلمت کدے پر جلوہ بار ہوئے، تو میں نے بکمال ادب، مولانا محمد ناظم صاحب ندوی کی پریشاں روزگاری کا ذکر کرتے ہوئے اُن سے درخواست کی کہ جب شیخ الجامعہ کے انتخاب کا موقع آئے تو قرعۂ فال، مولانا محمد ناظم ندوی ہی کے نام پر نکلے، جب میں گفتگو حضورِ اقدس سے کر رہا تھا، تو میرے پہلو میں عزیز محترم سلمان میاں کھڑے ہوئے تھے انہوں نے اپنے معصومانہ انداز میں بکمال بے تکلفی حضرت سے عرض کیا، کہ ابّا آپ کو تو معلوم ہے کہ جب آپ نے ندوہ کا اہتمام مولانا محمد ناظم ندوی کے سپرد کیا تھا، تو وہ فرائض اہتمام کی انجام دہی میں کسی صلاحیت کا ثبوت نہ دے سکے تھے، سلمان میاں کا یہ جملہ سنکر حضور متبسم ہوئے، اور سکوت اختیار فرمایا، میں بھی اپنی جگہ سہم کر خاموش ہوگیا، اور بات آئی گئی ہوگئی، مگر اللہ رے بندہ پروری، کہ جب جامعہ میں شیخ الجامعہ کے انتخاب کا وقت آیا تو اپنے فرزندِ دلبند کی رائے سے متاثر ہوئے بغیر اپنے ایک ادنیٰ خادم کی درخواست کو شرفِ قبول بخشتے ہوئے، مولانا محمد ناظم ندوی کو شیخ الجامعہ کے عہدۂ جلیلہ پر فائز کردیا، اور اپنے کرمِ بے نہایت سے، اپنے ایک بندۂ بے دام کو حضیضِ ارض سے اوجِ ثریا تک پہنچا دیا۔

وہ سرچشمِ اولیا تھے، اور اُن کے ہم عصر دراج اعہاد لیا اُن کی نگر تسخیر سے خالی نہ رہے، اس موقعہ پر میں ایک خاص واقعہ بیان کرنا چاہتا ہوں۔

ایک دن اپنی عادت شریفہ کے مطابق حضرت اقدس رحمۃ اللہ علیہ مسند مطب پر جلوہ فرما تھے، انہیں ایام میں برادرِ محترم حضرت مولانا محمد ہاشم صاحب مجددی بھی میرے غریب خانہ پر اقامت گزیں تھے، مکان کے اندرونی حصہ سے جب برادر موصوف مطب میں تشریف فرما ہوئے تو حضور اقدس کو جلوہ افروز دیکھا حضور اقدس بھی برادر موصوف کو دیکھتے ہی سروقد کھڑے ہوگئے، اور بلا کسی سابق شاہدہ کے ارشاد فرمایا کہ یہ صورت تو جانی پہچانی معلوم ہوتی ہے، کیا آپ مولانا محمد ہاشم مجددی ہیں، برادر موصوف نے اثبات میں جواب دیا، اور اُسی مجلس میں برادر موصوف نے اپنے علم و یقین کی مجھ سے تصدیق کی، یعنی حضور کی ذاتِ گرامی کے متعلق ارشاد فرمایا کہ کیا حضرت مولانا سید سلیمان ندوی ہیں؟ دنیائے باطن کے یہ دونوں شہسوار جب بغلگیر ہوکر بیٹھے تو حضرتِ اقدس رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مولانا محمد ہاشم صاحب مجددی کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ مجھے تو ابتدا ہی سے آپ کے خانوادے سے عقیدت ہے، اور میرے برادر معظم کو حضرت شاہ ابو احمد صاحب مجددی سے شرفِ بیعت حاصل تھا، مرید بھی تھے، اور ان کے خلیفۂ مجاز بھی تھے، اسی ضمن میں حضرت اقدس نے مولانائے موصوف کو اپنا ایک خاص واقعہ سنایا، جو حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار اقدس پر پیش آیا تھا، حضور نے فرمایا کہ میں اپنے چند رفقاء کی معیت میں پنجاب سے دہلی کی سمت آرہا تھا، میرے رفقا نے حضرت مجدد الف ثانی کے مزار پر حاضری کا عزم ظاہر کیا، اور سرہند شریف کے

اسٹیشن پر اتر گئے، اور میں بھی اپنے رفقاء کے ساتھ حضرت مجدد الف ثانی کے روضۂ اقدس کی طرف روانہ ہوا، میرے رفقاء تو حضرت مجدد الف ثانی کے مزار مبارک تک گئے مگر میں نے مزار سے باہر توقف کیا، اور ایک جگہ بیٹھ گیا، میں اپنے عالم خیال میں غرق تھا کہ دفعتہً بیہوش ہو کر گر گیا، عالم بیہوشی میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک نورانی شکل و صورت کے بزرگ میرے پاس تشریف لائے، اور ارشاد فرمایا کہ مکتوبات ما را خواندہ؟ میں نے جواباً عرض کیا کہ بلے خواندہ ام مگر اکثرے نفہمیدہ ام، اسی سوال کے اعادہ و جواب میں میرے رفقاء مزار اطہر سے واپس آئے، تو مجھے بیہوش پایا، جب میں اپنے رفقاء کی پیہم جد و جہد سے عالم ہوش میں آیا تو میرے رفقاء نے مجھ سے اسباب بیہوشی دریافت کئے، مگر میں نے سکوت اختیار کیا، اور کسی سے کچھ نہ کہا، اثنائے سفر میں صرف اپنے ایک رفیق خاص سے اس واقعہ کا ذکر کیا،

اسی سلسلے میں حضرت اقدس نے، مولانائے موصوف سے ارشاد فرمایا کہ میں حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کی خدمت اقدس میں صرف ملاقات و حصول نیاز کی غرض سے گیا تھا، مگر انہوں نے مجھے از راہ کرم مرید بھی کر لیا، اور خلیفہ بھی بنا دیا،

یہ دونوں واقعے اس امر کا ثبوت کامل ہیں کہ حضرت اقدس بزم اولیاء میں ایک مقام خاص کے مالک تھے اور حقیقۃً سرمۂ چشم اولیاء، جس شہباز معرفت پر قطب ملک معرفت حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی نگاہ انتخاب پڑ چکی ہو اسے حضرت مرشد تھانوی اپنے دام محبت میں کیونکر نہ اسیر کرتے۔

نہ من براں گل عارض غزل سرایم و بس
کہ عندلیب تو از ہر طرف ہزار انند!

بقیہ بزم ریاض:-

از مجیرا ۱۵ ر فروری ۱۹۵۴ء

برادرم رئیس احمد صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

آپ کا عنایت نامہ ماہنامہ ریاض کے علاوہ سلیمان نمبر کے لئے ملا، حالات یہ ہیں کہ دو برس ہو چکے کہ مجھ پر فالج کا حملہ ہوا، جس سے مفلوج اعضا اور ماؤف دماغ لئے ہوئے بستر مرگ پر پڑا ہوا ہوں، نقل و حرکت سے بالکل معذور و مجبور ہوں، خط بھی دوسروں سے لکھوانا پڑتا ہے، پھر بھی میں تیار ہوں کہ ریاض کے سلیمان نمبر کے لئے جو کچھ بھی بن پڑے لکھوں، اگر میں کچھ لکھ سکا تو اس کو میں اپنی خوش نصیبی سمجھوں گا، میرے لکھنے کی شرط یہ ہے کہ آپ براہ کرم فوراً جو کچھ آپ کو لکھوانا ہو اس کے ابواب اور عنوانات لکھ کر میرے پاس بھیج دیجئے تاکہ میں جو کچھ لکھوانا ہو لکھوا کر آپ کی خدمت میں روانہ کر دوں، مجھے افسوس ہے کہ ایسا خوشگوار کام میرے ذمہ کیا جا رہا ہے جبکہ میں بالکل مجبور و ناچار ہو رہا ہوں، پھر بھی اس ناچاری میں جو کچھ بھی لکھ سکوں گا لکھوا کر آپ کی خدمت میں روانہ کر دوں گا۔ آپ بہت جلد اس کے ابواب اور کچھ عنوانات روانہ فرمائیے۔ والسلام

آپ کا دعا گو [illegible]

ایں منزلت بہ تختِ سُلیمانؑ برابر است

حسن مثنیٰ ندوی

قدرت کی ستم ظریفی اور قدرت کی جدت طرازی وغیرہ فقرے تو اُردو ادب میں بہت رائج ہیں، لیکن ایک چیز کی طرف آپ کا دھیان شاید کبھی نہ گیا ہو گا، یعنی "قدرت کی نام پسندی" —— کیونکہ بعض نام اسے پسند آجاتے ہیں، البتہ یہ فیصلہ کرنا ذرا مشکل ہے کہ قدرت کسی خاص مقصد کے لئے جب کسی کو منتخب کرتی ہے، تو اس کا کوئی خاص نام اس کے والدین سے رکھوا دیتی ہے، یا نام رکھنے والے جو نام رکھ دیتے ہیں اس کی رعایت سے وہ اس مسمیٰ کو کسی بلند مقصد کے لئے چن لیتی ہے؟ ——
میرا خیال ہے کہ دونوں ہی باتیں ایک ساتھ ہوتی ہیں۔ —— احادیث میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کریہہ و قبیح ناموں کو تبدیل فرما دیا کرتے تھے، یہ تو ہوا ذوق سلیم جو حضورؐ سے بڑھ کر اور کس کو ہو سکتا تھا، لیکن ایک دلچسپ روایت یہ بھی ہے کہ ایک صحابی سے حضورؐ نے نام پوچھا، انھوں نے کہا حَزَن (بمعنی سخت زمین سنگلاخ) حضورؐ نے فرمایا اَنْتَ سَهْل، تمہارا نام سہل (بمعنی نرم اور ہموار زمین) ہونا چاہئے۔ انہوں نے عرض کیا کہ یہ نام میرے باپ (یا دادا) کا رکھا ہوا ہے، حضورؐ خاموش ہو گئے، مگر جناب حزن کہتے ہیں کہ اس کے بعد ساری عمر میرے گھر میں سختیاں ہی سختیاں آتی رہیں۔

دُنیا میں اس قسم کے ادبی لطیفے اکثر حقیقت بن کر بھی سامنے آجایا کرتے ہیں، ہمیشہ نہ سہی لیکن کبھی کبھی ناموں کی بھی کچھ تاثیر ہوتی ہے اور اسم و مسمیٰ میں کچھ ربط ہوا کرتا ہے، آخر وَلِلّٰهِ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰى فرمانے کی کوئی وجہ تو ہوگی، جب خدا کے لئے اسمائے حسنیٰ ہیں تو بندوں کے اسمائے حسنیٰ سے اسے کیوں دلچسپی نہ ہو؟

قدرت صرف "نام پسند" ہی نہیں کچھ "لطیفہ پسند" بھی معلوم ہوتی ہے، دُور کیوں جاتے ہیں! صحابۂ کرام کے ایک ہی دور میں چار عبداللہ کو کون نہیں جانتا ہے —— عبداللہ بن عمر بن الخطاب، عبداللہ بن عمرو بن العاص، عبداللہ بن عباس بن عبدالمطلب، اور عبداللہ بن زبیر بن العوام —— یہ چار "عبداللہ" ہیں جن کے لئے "عبادلۂ اربعہ" کا مخصوص لغت اہل فقہ اور اہل رجال نے ایجاد کیا ہے، ان میں سے اول الذکر دو عبداللہ محدث ہیں، تیسرے فقیہ، اور چوتھے صاحب سیاست بہادر سپہ سالار اور اوّل مولود فی الاسلام بعد الهجرہ، ان چار ہم ناموں کو ایک ہی دور میں خاص قسم کی شہرت کے لئے منتخب کر لینا قدرت کی نام پسندی نہیں تو اور کیا ہے؟ ایک ہی بستی میں اور ایک ہی زمانے میں ابن جریر طبری جیسے دو دو نامور مصنفوں کا وجود کہ دونوں کے باپ بھی ہمنام ہوں، یا مثلاً آزادیٔ ہند کی جد و جہد میں دو زبردست اور نڈر سیاست دانوں یعنی جوہر و جناح جیسے دو دو محمد علیوں کے وجود کو قدرت کی لطیفہ پسندی کا نام نہ دیا جائے تو اور کیا کہا جائے؟ نام پسندی تو یہ ہے کہ کئی ہمناموں کو بلند شخصیت بننے کے لئے چن لیا جائے، لیکن لطیفہ پسندی یہ ہے کہ ایک ہی لائن اور ایک ہی مقصد کے لئے چند ہمناموں کا انتخاب کر لیا جائے۔

نام پسندی ۱۸۵۷ء کا انقلاب رونما ہوا، اور برعظیم ہند کی قسمت کا رُخ مڑا، تو عین اثنائے جنگ آزادی و حریت

میں ایک "سلیمان" پیدا ہوتا ہے، اور پھر ۱۸۸۶ء تک کے دوران میں چار اور "سلیمان" پیدا ہو جاتے ہیں، تین بہار میں، ایک یو۔پی میں، ایک پنجاب میں۔ اور قدرت ان سب کو غیر معمولی عالم دین بننے کے لئے، لازوال شہرت حاصل کرنے کے لئے، اور مخصوص خدمات ملت کے لئے منتخب کر لیتی ہے۔ ایک شاہ سلیمان پھلواروی ہیں، دوسرے مولانا سلیمان اشرف بہاری ہیں، تیسرے قاضی سلیمان منصورپوری ہیں، چوتھے سید سلیمان ندوی ہیں، پانچویں سر شاہ سلیمان جونپوری ہیں، اور پانچوں اسلام کے علم بردار۔

لطیفہ پسندی یہ تو ہوئی قدرت کی "نام پسندی" اب "لطیفہ پسندی" ملاحظہ فرمایئے، بلکہ "لطیفہ پسندیاں" کہ ان میں سے دو سلیمانوں کو ندوۃ العلماء سے اس طرح وابستہ کر دیتی ہے، کہ ایک ندوۃ العلماء کا بانی و مربی بنتا ہے، اور دوسرا اس کی ایسی آبرو ثابت ہوتا ہے کہ "ندوی" کا لفظ ہمیشہ کے لئے اس کے نام کا جزو بن کر رہ جاتا ہے، ایک مولانا شاہ سلیمان پھلواروی جو تحریک ندوۃ العلماء کے بانی اور مربی تھے، اور دوسرے سید سلیمان ندوی کہ جب "ندوی" کہئے علامہ سید سلیمان کا نام ذہن میں آئے بغیر نہیں رہ سکتا ——— پھر دو اور سلیمانوں کو قدرت نے علی گڑھ کی علمی و روحانی خدمت و نگرانی و نگہبانی کے لئے چن لیا، ایک سلیمان اشرف بہاری، جو برسہا برس تک اس کے ناظم دینیات رہے، بلکہ "قطب" کہئے کہ وہاں جا کر بیٹھے تو پھر مر کر ہی اٹھے، دوسرے سر شاہ سلیمان جو اپنی بیشمار ادبی، قانونی، اور طبیعیاتی مصروفیتوں کے باوجود علی گڑھ کو سنبھالنے اور راہ پر لگانے کے لئے اس کے ناخدا بنے۔

خصوصی انتخاب لیکن قدرت کی یہ لطیفہ پسندیاں یہیں ختم نہیں ہو گئیں، بلکہ ایک "انتخاب" اور عمل میں آیا اور نہایت ہی عجیب! ——— آپ اس داستان و تاریخ کو پڑھئے تو سہی، یہ انتخاب یوں ہوا کہ ان میں سے بھی تین سلیمانوں کو ایک ہی مخصوص خدمت کے لئے چن لیا گیا، وہ مخصوص خدمت کیا تھی؟ ——— "قرعۂ فال" جس "بار امانت" کے اٹھانے کے لئے ان ناموں پر پڑا، وہ "امانت" کیا تھی؟ ——— سیرت رسول ص کی لازوال ترویج و اشاعت" ——— ایک ہی خدمت کے لئے سُلَیمانِ ثلٰثہ کا یہ قدرتی انتخاب، بالکل ایسا ہی ہے جیسے ایک ہی خدمت تفسیر کے لئے جلالَین (دو جلال الدین) کا اور حواشی کے لئے کمالَین (دو کمال الدین) کا انتخاب۔ ضرورت ہے کہ ان تینوں کی خدمات سیرت کو اسی ترتیب اور خصوصی نوعیت کے ساتھ پیش نظر رکھا جائے جو تاریخی اعتبار سے ان کی ہے، جبھی صحیح طور پر یہ اندازہ بھی کیا جا سکتا ہے کہ نقش اول کیا تھا، پھر نقش ثانی میں کیا حسن پیدا ہوا، اور نقش ثانی کے بعد نقش ثالث میں کیسی ہمہ گیری اور جامعیت پیدا ہوئی۔

پس منظر ۱۸۵۷ء کے بعد کا دور صرف پراگندہ حالی ہی کا نہیں تھا، بلکہ پراگندہ خیالی کا بھی تھا، برعظیم ہند میں علماء و مشائخ کی تو کمی نہیں تھی، مگر علمیت و روحانیت کے اعتبار سے بالعموم حالت خراب سے خراب تر تھی، رسوم باقی تھے، مگر روح سے خالی۔ علوم موجود تھے مگر عمل سے محروم، باہمی جنگ و جدل، مناقشے، مناظرے، اور رسالہ بازیوں کی بھرمار تھی، خود کچھ نہیں تھے، مگر بزرگوں کے سبحہ و سجادہ کے تذکرے، اور جبہ و دستار کے حوالے ضرور تھے، علمی اور تحقیقی ترقی اگر کچھ ہوئی بھی تو اس کی معراج اس سے زیادہ اور کچھ نہیں تھی کہ فلاں صحابی افضل ہے، اور فلاں صحابی مفضول، اُس وقت مولانائے روم کے یہ اشعار سنانے والا کوئی نہ تھا کہ ؎

تو برائے وصل کردن آمدی نے برائے فصل کردن آمدی

ما بروں را ننگریم و قال را — ما دروں را بنگریم و حال را

سرِ حق کے بر تو باشد منجلی — تو گرفتار ابو بکرؓ و علیؓ

محبت رسول ؐ کا ثبوت بھی یا تو "مولود" کی محفلوں میں منحصر تھا، یا "رسمی مشغلۂ درود" میں ـــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آل و اصحاب کی سیرت کا تو کہیں نام و نشان بھی نہ تھا...

سلیمان اوّل

ارتقا کے اٹل قانون کے مطابق فطرت اندر سے مطالبہ کر رہی تھی کہ اس جمود و خمود اور پستی کو دور کرنے والی کوئی ہستی نمودار ہو، اس مقصد کی تکمیل کے لئے قدرت نے سب سے پہلے "پھلواری کے سلیمان" کو منتخب کیا۔ پستی و جہالت کے "جنوں" کی تسخیر کے لئے کسی "سلیمان بن داؤد" ہی کی ضرورت بھی تھی، انہوں نے آج سے کوئی ستر بہتر سال پہلے، ـــــ گویا ٹھیک چودھویں صدی کے آغاز میں ـــــ "بیان سیرت" کی ایک مجلس پھلواری شریف میں قائم کی۔ پھلواری دوسری مشہور درگاہوں کی طرح شروع سے مرجع خواص و عوام تھی، اور آج بھی ہے، جہاں ربیع الاول کے عرس میں صرف صوبے ہی کے نہیں ہندوستان کے دور دراز گوشوں سے لوگ ہزارہا کی تعداد میں کھنچ کھنچ کر آتے تھے۔ شاہ صاحب نے یہ اہتمام کیا کہ چاند رات سے شب دوازدہم تک ہر شب بیان سیرت کا باقاعدہ سلسلہ شروع کیا، وہ ان گیارہ بارہ راتوں میں قبل از ولادت کے حالات عرب سے لیکر وفات تک کے تمام اہم واقعات تاریخی تسلسل کے ساتھ بیان کرتے، اور آخری رات کی مجلس میں بحیثیت مجموعی پوری سیرت اور پیغام رسالت پر روحانی سوز و گداز کے ساتھ تبصرہ کرتے، خصوصیات یہ تھیں:۔

(۱) تمام اسماء، مقامات، اور سنین کی پوری تعیین ہوتی،

(۲) رسول اللہ صلعم کی تبلیغ، غزوات، نزول وحی، اور دوسرے اہم واقعات کا بیان زمانی تسلسل کے ساتھ ہوتا، اور تفصیل سے ہوتا۔

(۳) تاریخی روایات کے محض حوالے پر اکتفا نہ ہوتی، بلکہ جا بجا ان پر قرآن، عقل و درایت، رجال، اور اصول جرح و تعدیل، اور معیار سیرت کے نقطۂ نگاہ سے تنقید بھی ہوتی۔

(۴) جہاں سیرت کی تفصیل پیش کی جاتی وہیں قدم قدم پر اپنی سیرتوں کو اس مقدس سیرت کے آئینے میں دیکھ دیکھ کر سنبھالنے اور سنوارنے کی تلقین بھی ہوتی۔

(۵) سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ یہ بیان محض علمی تحقیق اور خشک لکچر نہ ہوتے بلکہ محققانہ اور متکلمانہ انداز کے ساتھ ساتھ صوفیانہ شگفتگی اور برمحل اشعار مثنوی کی آمیزش سے پورا بیان روحانی تاثیر کا عجیب غیر معمولی مرقع بن جاتا تھا، گویا بیک وقت وہ دماغ اور دل دونوں سے اپیل کرتے تھے، شاہ صاحب کا علم و فضل، ان کی سحر بیانی، اور روحانی سوز و گداز تو آج تک ضرب المثل ہے۔

یہ برعظیم ہند میں ذوق سیرت پیدا کرنے کی پہلی بنیاد تھی، غالباً اس سے زیادہ قدیم کوئی محفل سیرت اور کہیں موجود نہیں، جہاں جہاں بھی آج سیرت کی محفلیں یا کمیٹیاں قائم ہیں وہ اسی قدیم ترین محفل سیرت کے برگ و بار ہیں بلکہ اس سلسلے کی تمام تصانیف سیرت کی محرک اول بھی یہی ہے، یہ ایک تحریک تھی، انہوں نے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، ندوۃ العلما، انجمن حمایت اسلام لاہور کے پلیٹ فارموں سے بھی اور اپنی انفرادی سیر و سیاحت کی صورت میں بھی جتنی تقریریں کیں سب میں یہی روح جلوہ گر تھی، پھلواری میں جب سے یہ مجلس قائم ہوئی آج تک پھر کبھی ناغہ نہ ہوئی، یہ بھی ایک عجیب تاریخ ہے، وہ شاہ صاحب کے بعد بھی بدستور باقی ہے۔

اس مجلس کے اثرات پشاور سے رنگون تک اور شمال سے جنوب تک پھیلے، اور برابر پھیلتے رہے۔

حسن میاںؒ

اس وقت تک اردو زبان میں کوئی معقول و مستند کتاب سیرت پر نہیں لکھی گئی تھی، اس لئے شاہ صاحب کو خیال ہوا کہ جو کچھ ہم بیان کرتے ہیں اس کے نوٹ متفرق اجزا کی شکل میں موجود ہی ہیں کیوں، نہ ایک جامع سیرت النبی مرتب کردی جائے، چنانچہ انہوں نے اپنے بڑے صاحبزادے مولانا شاہ حسن میاںؒ کو اس کام پر مامور کیا۔۔۔ لیکن قدرت نے تو اس مقصد کے لئے صرف "سلیمانوں" کو منتخب کیا تھا، کوئی دوسرا اس کام کو کیونکر پورا کرلیتا، حسن میاںؒ نے محفل میلادؐ کے لئے صحت واقعات کے ساتھ چھوٹی چھوٹی کتابیں، حُبِ رسول، خُلقِ حسن، اور میلاد الرسول، تو لکھدیں اور وہ رائج بھی ہوگئیں مگر "سیرت النبی" کے لئے باوجود سارا مواد اکٹھا کرلینے کے، وقت کے دوسرے متنازع فیہ مسائل اور علمی واعتقادی تجزیے کے مباحث نے ان کو الجھائے رکھا۔

سلیمان ثانی

اسی اثنا میں "دوسرے سلیمان" کا نام فضا میں گونجا، یعنی منصور پور پٹیالہ کے سلیمان کا۔ گویا اب ایک قاضیؒ درج کی ضرورت تھی، قدرت نے اُن کو آگے بڑھایا، ان کی کتاب "رحمۃ للعلمین" کی پہلی جلد شائع ہوئی، یہ سیرت رسولؐ پر پہلی قابل اعتنا کتاب تھی، جو برعظیم ہند میں بزبان اردو منظر عام پر آئی، اور قاضی صاحب نے سب سے پہلے اپنی یہ کتاب تبصرے کے لئے پھلواری شریف بھیجی، قاضی صاحب بیان سیرت کی اس محفل اور تحریک سیرت کے اس مرکز سے واقف ہی نہیں بلکہ گہرا ربط رکھتے تھے، حسن میاں نے قاضی صاحب کو اپنے تنقیدی تبصرے کے ساتھ یہ لکھا کہ "اس کتاب کے بعد مجھے یہ کام کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی" قاضی صاحب نے جب دوسری جلد شائع کی تو اس خط کا تذکرہ اس میں یوں کیا:۔

'پہلی جلد شائع ہونے کے بعد حسن میاں ولد شاہ سلیمان صاحب پھلواروی مدظلہ العالی کا خط آیا جس میں لکھا تھا کہ غزوۂ خیبر کا پورا واقعہ اس کتاب سے غائب ہے، مجھے یہ دیکھ کر سخت تعجب ہوا، میں نے اپنا مسودہ دیکھا تو اس میں غزوۂ خیبر پورا موجود تھا، لیکن مطبوعہ کتاب دیکھی تو معلوم ہوا، کہ جو کچھ انہوں نے لکھا تھا صحیح تھا، کاتب کی غلطی سے یہ پورا واقعہ درج ہونے سے رہ گیا، اس لئے اب میں دوسری جلد میں اس فتح سراپا ظفر کو بالتفصیل لکھتا ہوں۔"

اور یہی سبب تھا کہ تسلسل کے اعتبار سے غزوۂ خیبر جلد اول کی بجائے جلد ثانی میں شامل تھا، مگر اب جدید ایڈیشن میں اسے جلد اول ہی میں اس کے صحیح محل پر درج کردیا گیا ہے۔

قاضی صاحب کی یہ کتاب "رحمۃ للعلمین" تین جلدوں پر مشتمل ہے، اور ملک کے ہر گوشہ میں بےحد مقبول ہوئی، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اس کی مقبولیت بڑھتی ہی جاتی ہے، مختصراً اس کی خصوصیتیں یہ ہیں کہ:۔

(۱) پوری عالمانہ تحقیق سے لکھی گئی ہے، جو روایت جہاں سے لی ہے وہاں حاشئے میں اس کا حوالہ بھی درج ہے۔

(۲) تمام واقعات، جو سیرت سے متعلق ہیں سنہ وار ترتیب سے لکھے گئے ہیں۔

(۳) جہاں کوئی عمدہ نتیجہ مستنبط ہوسکتا ہے، اور عملی زندگی سے اس کا کوئی تعلق ہے تو وہ بھی لکھدیا گیا ہے۔

(۴) بائبل سے ہر جگہ استناد کرکے اہل کتاب پر حجت قائم کی گئی ہے، اور اس معاملہ میں سرسید احمد خاں کے بعد قاضی صاحب منفرد ہیں۔

(۵) زبان اردو ہر جگہ معیاری تو نہیں لیکن لب و لہجہ اتنا متین، سنجیدہ، اور پُر اثر ہے کہ مخالف سے مخالف پڑھنے والا بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، کسی جگہ ایسا مناظرانہ اور متشددانہ انداز نہیں ہے جس سے کسی فرقے کی دل آزاری ہو۔

(۶) مصنف نے اس کے صفحات پر دماغ ہی نہیں بلکہ دل کے ٹکڑے بھی رکھدئے ہیں، ایک ایک لفظ سے عشق نبوی اور حبّ

انسانیت ٹپکتا ہے۔

(۷) مصنف اپنے دور کی تمام جدید تحریکات اور علمی و تحقیقی اقدار سے بھی واقف ہے اور جا بجا اسلامی اقدار و احکام سے ان کا مقابلہ کرتا ہے، نبوی غزوات، نظام زکوٰۃ، قانون طلاق وغیرہ کا ذکر آتا ہے، تو وہ صرف ان کا ذکر کر کے آگے نہیں بڑھ جاتا، بلکہ وہیں متن میں یا حاشئے پر ایسے اسلوب سے بحث کرتا ہے کہ پڑھنے والے کے تمام شکوک رفع ہو جائیں خواہ وہ کسی قوم اور کسی فرقے سے تعلق رکھتا ہو۔

(۸) تفحص و جستجو کا یہ عالم ہے کہ غزوۂ اُحد میں جس انصاری خاتون کے چار رشتے دار (شوہر، فرزند، باپ، اور بھائی) شہید ہوئے اور اس نے کوئی پروانہ کی، اس کا نام تلاش کرنے کے لئے انصار کے تمام انساب کو دیکھ ڈالا، اور بالآخر اس خاتون کا نام (ھند) تلاش کر ہی لیا، کسی سیرت نگار نے قاضی صاحب سے پہلے اس خاتون کا نام دریافت نہیں کیا تھا۔

(۹) دوسری جلد میں حضورؐ، حضور کے اصحاب، ازواج، اور اولاد وغیرہ کے انساب کا جس طرح تفحص و تجسس کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کو فن انساب پر بھی عبور حاصل ہے۔

(۱۰) تیسری جلد میں حضورؐ کے خصائص اور اسلام کی خصوصیات کو جس طرح پیش کیا ہے، وہ بھی مصنف کا لازوال کارنامہ ہے دوسری جلد میں سنین کی جو تحقیقات آخر کتاب میں درج ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ ریاضی کے اس فن میں بھی مصنف کا بڑا پایہ تھا۔

شبلی نعمانی

زبان و قلم کی ان دو گراں قدر خدمات سیرت کے بعد تو بظاہر ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ اس میدان میں کسی کے لئے کوئی جگہ باقی نہیں رہی تھی، لیکن یہ واقعہ ہے کہ اسی زمانہ میں دوسری طرف علامہ شبلی نعمانی بھی سیرت النبی مرتب کرنے کے لئے پوری تیاری کر رہے تھے، بلکہ کام شروع بھی کر دیا تھا، مگر پھر وہی بات کہ اس خدمت کے لئے تو قدرت کی نگہ انتخاب سلیمانوں کے لئے وقف تھی، کوئی دوسرا کیا کرتا، پہلے حسن میاں نے ہمت کی اور ساز و سامان مہیا کر کے بیٹھے تو ایک سلیمان" نے بڑھ کر" اپنی تقریبی کا پروانۂ خصوصی پیش کر دیا، اور وہ اپنے کاغذات لپیٹ کے پیچھے ہٹ گئے، (کچھ ہی عرصہ بعد ان کا انتقال ہو گیا) پھر علامہ شبلی نے آغاز کیا تو ان کی عمر نے بھی وفا نہ کی، کہ وہ اس خدمت کو پوری طرح انجام دیتے، سیرت نگاری کے حقدار نے ان کے بستر مرگ پر پہنچ کر یہ "امانت" اپنی تحویل میں لے لی، اور شبلی نے یہ امانت سونپ کر اطمینان کے ساتھ اپنی آنکھیں موندلیں۔

جب پہلی بار لوگوں کو معلوم ہوا تھا کہ مولانا شبلی نعمانی بھی سیرت النبی لکھ رہے ہیں اور وہ منصۂ شہود پر آنے والی ہے تو ایک اخبار (وطن لاہور) نے لکھا کہ "جناب قاضی سلیمان صاحب منصور پوری تو سیرت لکھ ہی چکے ہیں اب اس کی کیا ضرورت ہے، اور اس سے زیادہ کیا کچھ لکھا جا سکتا ہے۔"

(رحمۃ للعٰلمین کی تیسری جلد کا مقدمہ علامہ سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے، اخبار کی یہ عبارت اسی سے ماخوذ ہے)

ہزار پہل نگینہ

لیکن اخبار مذکور کو یہ علم نہ تھا کہ رسول اللہ صلعم کی سیرت پاک ایک ایسا نگینہ ہے، جس کے ہزاروں پہل ہیں اور لکھتے وقت انسان کی محدود نگاہ ایک یا چند پہلوؤں سے آگے نہیں جاتی، خود یورپ میں حضورؐ کی سیرت پر بے شمار چھوٹی بڑی کتابیں لکھی جا چکی ہیں، بعضوں کا خیال تو یہ ہے کہ ڈھائی ہزار سے کم نہیں لکھی گئیں، اس بیان کو انتہائی مبالغہ بھی قرار دیا جائے جب بھی ان کی تعداد کچھ معمولی نہیں رہتی، مشہور سیرت نگاروں میں ایڈورڈ گبن، جان ڈیون پورٹ، لینپرڈ، کارلائل، ولیم میور وغیرہم کو کون نہیں جانتا؟ انہوں نے یہ کبھی نہ سوچا کہ ایک متقدم مورخ سیرت لکھ چکا ہے تو اب ہمارے لئے

کوئی گنجائش کیا باقی رہی؟ یا اب ہمیں قلم اٹھانے کی کیا ضرورت ہے؟ سر سید احمد خاں کی خطبات احمدی، اور مولانا محمد علی مونگیری و مولوی چراغ علی وغیرہ کی تحریروں سے لے کر (جو معترضین کے جواب میں تھیں) اکبر شاہ خاں نجیب آبادی، اور مولانا عبد الرؤف دانا پوری کی تصنیفات، سید اولاد حیدر بلگرامی کی اسوۃ الرسول، مولانا مناظر احسن کی النبی الخاتم، مولانا مولانا شاہ جعفر میاں پھلواروی کی سیرت رسول تک (جو بارہ مجلسوں میں منقسم ہے) سیرت النبی سے پہلے اور بعد مختلف چھوٹی بڑی کتابیں مختلف حضرات کے قلم سے نکلتی ہی رہیں، حتیٰ کہ خالد لطیف گابا نے بھی "پرافٹ آف دی ڈیزرٹ" لکھنے سے پہلے یہ ہرگز نہ سوچا کہ دنیا میں ہزاروں کتب سیرت ہر زبان میں لکھی جا چکی ہیں، اب اگر میں لکھوں تو کیا لکھوں گا؛ اصل یہ ہے کہ ہر لکھنے والے کا ایک خاص زاویۂ نگاہ ہوتا ہے، اور وہ ان ہی خطوط پر لکھتا ہے، بلکہ ایک نقطۂ نگاہ میں بھی بیسیوں پہلو نئے نئے نکلتے چلے آتے ہیں، جس طرح قرآن پاک کی تفسیریں سینکڑوں لکھی گئیں اور آئندہ لکھی جاتی رہیں گی، اسی طرح محمد رسول اللہ صلعم کی سیرت بھی نئے نئے زاویۂ نظر سے قیامت تک لکھی جاتی رہے گی، اور اس کا دروازہ کبھی بند نہ ہوگا، بقول سعدیؒ ؎

دفتر تمام گشت و بہ پایاں رسید عمر
ماہمچناں در اول وصفِ تو ماندہ ایم

البتہ ہر سیرت نگار کی کتاب میں ایک یا چند خاص باتیں ایسی ضرور ہوں گی جو دوسری میں نہ پائی جائیں گی۔

سیرت رسولؐ کے اس پھیلاؤ اور تعدد تصانیف میں (بقول قاضی صاحب) ایک خاص الٰہی رمز ہے، اور وہ ہے وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ کے فرمان خداوندی کی تکمیل۔ مسلم ہو یا غیر مسلم، جب وہ سیرت نگاری کا شوق کرتا ہے تو اس کے سامنے سب سے پہلے محمد رسول اللہؐ ہی کی سیرت آتی ہے، بڑے بڑے عیسائی مورخ بھی سیرت لکھنے بیٹھتے ہیں تو حضرت عیسیٰ مسیحؑ یا حضرت موسیٰؑ کی تاریخ و سیرت کی طرف ان کی توجہ نہیں ہوتی، بلکہ سب کی نظر ایک ہی شخصیت پر پڑتی ہے، خواہ رداً ہو یا قبولاً۔

پھر ایک دوسری عجیب چیز اس باب میں آور آپ کو نظر آئے گی، یعنی جب کوئی غیر مسلم سیرت نگار حضورؐ کی سیرت کے کسی پہلو پر شدید نکتہ چینی کرتا ہے تو اس کا جواب تلاش کرنے کے لئے آپ کو کسی مسلمان سیرت نگار سے استمداد و استغاثہ کرنے کی شاید ہی کوئی ضرورت پڑے گی، خود اُسی کے بھائی بندوں میں کسی دوسرے سیرت نگار کی کتاب سیرت دیکھ لیجئے، وہیں اس کا جواب موجود ہوگا، حضورؐ کی سیرت کے جس پہلو کو ایک اپنے خیال میں قابل اعتراض سمجھتا ہے، اس کا دوسرا بھائی اسی پہلو کو دلائل حضورؐ کا کمال تصور کرتا ہے، گویا غیر شعوری طور پر یہ تمام مغربی سیرت نگار ایک دوسرے کی نکتہ چینیوں کا خود ہی جواب بھی ہیں۔

بہر حال ہر ایک کا اپنا زاویۂ نظر اور اپنا انداز فکر ہوتا ہے، اور سیرت رسولؐ کے باب میں یہ کبھی ختم نہ ہونے والا چشمۂ فیض ہے پھر یہ کیسے تسلیم کیا جا سکتا تھا کہ اب کسی اور کی ضرورت باقی نہیں رہی؟

سلیمان ثالث

فضا میں پھر ایک نام گونجا، یہ نام دیسنہ (بہار) کے سلیمان کا تھا۔ علامہ سید سلیمان ندوی کا ——— لیکن ذرا ٹھہرئیے، قدرت کی لطیفہ پسندی کا تذکرہ ہے تو پھر اسے بھی نظر میں رکھیں، کہ اس لطیفہ پسندی نے یہاں کچھ اور ہی پہلو اختیار کیا ہے، کیونکہ سلیمان ندوی کا نام ان کے والدین نے سلیمان نہیں رکھا تھا، ابو نجیب رکھا تھا، گویا قدرت نے ان نہ تو ماں باپ ہی سے یہ نام رکھوایا، نہ رکھے ہوئے نام کو اپنی پسندیدگی عطا کی، بلکہ ایک تیسری صورت یہ نکالی (؟)، کہ مشہور کر دیا سلیمان کے نام سے۔ بلفظ دیگر یہاں نام پسندی میں کچھ "تخلص پسندی" کے آثار بھی جھلک رہے ہیں؟

سید صاحب نے سیرت النبی لکھی اور پھر اس کی جلدوں پر جلدیں منظر عام پر آنی شروع ہوگئیں، اور دُنیائے علم و فضل میں

ی دھوم مچ گئی، یہ حقیقت ہے کہ سید صاحب نے اس خدمت کو ایک زندۂ جاوید کارنامہ، لازوال یادگار، اور غیرفانی توشۂ
آخرت بنادیا، حالانکہ یہ کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ سیرت کی کونسی کمی باقی رہ گئی ہے جسے یہ تلمیذ سلیمان پورا کرے گا۔ سیرت النبی
کی سب جلدیں آپ کے سامنے ہیں اور اس کی عالمگیر مقبولیت کا اندازہ بھی کچھ دشوار نہیں،

ایک سرسری نظر اس کی خصوصیات پر ڈالئے:۔

(۱) اس کی زبان ایسی معیاری اور اتنی بلند پایہ ہے کہ اردو ادب بہت کچھ ترقیاں کرنے کے باوجود ابھی تک اس سے آگے
نہیں بڑھ سکی۔

(۲) سیرت نگاری میں جذبات کا عنصر اتنا ہی رکھا گیا ہے جتنی اس کی ضرورت ہے، دل سے زیادہ دماغ کو پیش کیا گیا ہے، جو
اس دور عقلیت کے عقلیت پسندوں، جدید تعلیم یافتوں، اور روشن خیالوں کے لئے بجد مؤثر، اپیلنگ، اور مفید ہے

(۳) روایات کو صرف مرتب صورت میں پیش کر دینے ہی پر اکتفا نہیں کی گئی، بلکہ محققانہ، اور ناقدانہ انداز ہر جگہ نمایاں ہے،
جس روایت کو رد کرنا مقصود ہو، اس کے لئے عمدہ عقلی توجیہ پیش کی گئی ہے، اور ایسے نازک مواقع پر پوری علمی سنجیدگی
باقی رکھی گئی ہے، غیر ضروری اور مبالغہ آمیز روایات سے کام نہیں لیا گیا ہے۔

(۴) مغربی مورخین کی متعصبانہ نکتہ چینیوں کا معقول جواب دیا گیا ہے، اور عموماً ان ہی کے ہتھیاروں سے ان کے خلاف
کام لیا گیا ہے۔

(۵) قوم کو عقلی ارتقا کی طرف لیجانے کی غرض سے قدیم انداز کو جدید اقدار کے قالب میں ڈھالنے کا ایک عمدہ نمونہ پیش
کیا گیا ہے۔

(۶) رسول ؐ کو اس حیثیت سے پیش نہیں کیا ہے وہ صرف ایک مقدس مجموعۂ معجزات ہو، بلکہ اس کی سیرت کو ہر جگہ انسانی نقطۂ
نگاہ سے پرکھا گیا ہے، اور پڑھنے والا یہ محسوس کرتا ہے کہ انسانیت کا ہمدرد، بلند اقدار کا محافظ، اعلیٰ کیرکٹر کا حامل،
سعی پیہم کا پیکر، افکار عالیہ کا مخزن، بن کر اس دنیا سے زندگی بسر کرنے کے لئے اگر کوئی واحد نمونہ ہے تو وہ محمد رسول اللہ
کی پاک سیرت ہی ہے، و لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ، مسلمانوں ہی کے لئے نہیں ساری دنیا کے
کافۃ للناس بشیرا ونذیرا۔

(۷) سیرت رسول ؐ کے علاوہ ان جلدوں میں جس قدر دوسرے مواد اور معلومات ہیں وہ علامہ سید سلیمان ندوی کا اتنا بڑا کارنامہ
ہیں کہ اس مجموعۂ مجلدات کو اسلامی معلومات کی بیش بہا انسائیکلو پیڈیا کہنا بالکل بجا ہے۔

(۸) معجزات نبوی کے لئے پوری ایک ضخیم جلد وقف کی ہے، اور اس میں معجزے کی حقیقت اور مقام پر عقلی حیثیت سے
ایسی پر مغز بحث کی ہے کہ اردو میں تو کیا دوسری زبانوں میں بھی ایک جگہ اتنا بڑا ذخیرہ نہیں ملے گا، پھر تمام صحیح معجزات
کو ایک ایک کرکے اس طرح سمیٹا ہے کہ دوسری کتابوں سے قطعاً بے نیاز کر دیا ہے، پھر ان سب باتوں پر عقلی، اور سائنٹفک
انداز استدلال سونے پر سہاگہ ہے۔

(۹) ایک جلد صرف اخلاق کے لئے مخصوص کی ہے، یہ بھی ایک ایسا انمول مجموعہ ہے کہ اس سے زیادہ جامع کتاب اس فن
میں آپ کو اور کہیں نہ ملے گی، اخلاقیات کی چھوٹی سی چھوٹی جزئیات اور بڑے سے بڑے اصول کو اس طرح سمیٹا
ہے کہ اب اس سے باہر کسی چیز کو تلاش کرنا مشکل ہے، اخلاقی زندگی کے جو اصول و فروع آپ کو پورے اسلامی

لٹریچر میں بکھرے ہوئے ملیں گے، وہ یہاں سب ایک ہی جگہ مرتب اور واضح صورت میں مل جائیں گے، اخلاقیات ایک ایسی ہمہ گیر حقیقت ہے کہ زندگی کا کوئی گوشہ بھی اس سے باہر نہیں، ان سب کو سمیٹنے اور موتیوں کی طرح ایک سلک میں پرونے کا کام سید صاحب ہی کی تلاش و جستجو اور دقتِ نظر انجام دے سکتی تھی، اور اس کی اہمیت کا اندازہ کچھ اہل نظر ہی کر سکتے ہیں۔

(۱۰) ایک جلد میں اسلامی عبادات کو سمیٹا گیا ہے، بظاہر یہ سمجھ میں آنا دشوار ہے کہ صرف عبادات کے احکام اتنی ضخیم جلد میں کس طرح چھپ سکتے ہیں، لیکن پڑھنے کے بعد حیرت ہوتی ہے کہ کس کس طرح ایک ایک چیز کا احاطہ کر لیا ہے، پھر ہر جگہ عبادت کا فلسفہ اور اس پر عقلی و عملی بحثیں، ایک ایک جزیئے کے لئے کتابوں کی تلاش اور مضامین کا تفحص، یہ ساری جامعیت ایسی ہے جو بہت کم لوگوں کے حصے میں آتی ہے۔

یوں تو سید صاحب کی زندگی کے کارنامے بے شمار ہیں، اور سب ہی اپنی اپنی جگہ پر گراں قدر اور انمول ہیں، مگر سیرۃ النبی کا یہ کارنامہ اہل اسلام اور اہل علم پر اتنا بڑا احسان ہے جو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا، یہی وجہ ہے کہ یہ کارنامہ ہی زندۂ جاوید نہیں ہوا، بلکہ اس نے سید صاحب کی شخصیت کو بھی اور خود اس فن کو بھی زندۂ جاوید بنا دیا ہے۔

نیا تصور

سیرت رسول ﷺ کے معاملے میں سید صاحب کا ایک بہت بڑا، اور اہم کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے "سیرت" کا ایک نیا تصور بخشا ہے، اور ایک جامع قدر عطا کی ہے، عام طور پر یہی خیال کیا جاتا تھا کہ سیرت کا تعلق صرف ان "واقعات" سے ہے جو ولادت سے وفات تک زندگی میں پیش آئے ہوں، اس لئے حضورؐ کی سیرت یہی ہے کہ ولادت سے وفات تک کے واقعات مرتب کر دیئے جائیں، لیکن سید صاحب نے "سیرت" کے اس محدود تصور میں بڑی وسعت پیدا کی ہے، اور اسے ہمہ گیر بنا دیا ہے، سیرۃ النبی کی یہ مسلسل جلدیں پیش کر کے انہوں نے دراصل یہ حقیقت واضح کی ہے کہ رسول ﷺ کی زندگی کے چند واقعات ہی کا نام سیرت نہیں ہے بلکہ "رسالت" اس پوری انسانی زندگی، اور اس کے ایک ایک گوشے سے تعلق رکھتی ہے، اس دائرے میں فقط چند تاریخی واقعات ہی نہیں آتے، بلکہ حضورؐ کی تعلیمات، فرامین، انداز زیست، عقائد، معاملات، عبادات، اخلاق، حتیٰ کہ حضور سے کچھ نسبت رکھنے والے ان رفقاء کے سوانح حیات بھی آ جاتے ہیں جو حضور کے زیر تربیت رہے، غرض وہ ساری اسلامی زندگی اور فکر زندگی، اور اس سے تعلق رکھنے والی ہر ہر بات، جو حضورؐ سے کچھ بھی واسطہ رکھتی ہو — انفرادی، اور اجتماعی دونوں حیثیتوں سے — سیرتِ رسول ﷺ کے احاطے کے اندر ہے، سیرت کے اسی نئے تصور اور اسی جامع قدر نے "سیرۃ النبی" کی جلدوں میں اتنا اضافہ کیا ہے، اگر زندگی ہوتی تو خدا جانے وہ اسے اور کہاں تک لے جاتے، ہم اتنا جانتے ہیں کہ ساتویں جلد بھی زیر تصنیف تھی، یہ ساتواں سمندر یقیناً عصر حاضر کے مسائل و امور اور انسان کی جدید تر فکری و عملی زندگی پر محیط ہوتا، اور عالمگیر پیغام محمدیؐ کی میزان پر یہ سارے مسائل و افکار ایک مرتبہ اچھی طرح تلتے، پرکھے جاتے، اور اس حقیقت کی روشنی میں سامنے آتے کہ "اس کائنات میں سب سے بلند درجہ انسانیت کا ہے، کیونکہ یہی توحید کی جڑ ہے" مگر وہ اس کی تکمیل سے پہلے ہی ہم سے جدا ہو گئے، علمی و تحقیقی ماحول کی نایابی نے ان کی زندگی مختصر کر دی۔

ارتقائی کڑیاں

بہر حال قانون ارتقا کے مطابق شاہ سلیمان پھلواروی، قاضی سلیمان منصور پوری، اور

علامہ سید سلیمان ندوی بسلسلۂ ارتقا کی ترقی پذیر کڑیاں ہیں، ان "علم برداران سیرت و پیغام محمدی" کی کیفیت کچھ ایسی نظر آتی ہے جیسے ایک دَور مکّی زندگی کا ہو جبکہ دعوت دی جا رہی تھی، اور قبول دعوت کے لئے دلوں کو گداز کیا جا رہا تھا، دوسرا دَور مدنی زندگی (قبل فتح مکہ) کا ہو جبکہ اہل کتاب کو آواز دی جا رہی تھی، اور اُن ہی کے مسلّمات سے اُن کو قائل کیا جا رہا تھا، اور تیسرا دور فتح مکہ کے بعد کا ہو، جبکہ "اکمال دین" اور اتمام نعمت "ہوا۔ "تجلیاں" تو کچھ اسی انداز کی ہیں — فالکلّ واحدٌ یتجلی بکل شان۔

سلیمان ثالث کی اس بیش بہا خدمت سیرت پر تبصرہ کرنے کے لئے سچی بات تو یہ ہے کہ ایک مستقل تصنیف درکار ہے۔

لازم نبود قطرہ بہ عمّاں بروں خار و خس سحرا بگلستان بروں
لکن چہ کنم عادت موران این است پائے ملخے نزد سلیمان بروں

سیرۃ النبی کے اس بسیط و وسیط اور ہمہ گیر نمونۂ کمال کے علاوہ ان کی کتاب خطبات مدراس بھی ایک لاجواب مجموعۂ سیرت ہے، جس کو جامعیت و ایجاز کے لحاظ سے سہل ممتنع کی مثال سمجھنا چاہیئے، کہ دریا کو انہوں نے کوزے میں بند کر دیا ہے، اور اسی رعایت سے ان کی اس خدمت عالیہ کے متعلق ہمارا مختصر تبصرہ یہاں صرف ایک جملے میں ختم ہو جاتا ہے کہ "غلط نہ ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ سیرت رسول ﷺ کی خدمت میں یہ سلیمان اپنے دو متقدم سلیمانوں سے، اور اپنے استاد سے، سب سے آگے نکل گیا۔" وذٰلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء — زمانہ جوں جوں گذرتا جائے گا، اس کی قدر اور بڑھتی جائے گی، آج بھی اس خدمت عالیہ کی قدر و منزلت صرف ہندوستان اور پاکستان ہی میں نہیں کی جا رہی ہے بلکہ دنیائے اسلام اور اس کے علاوہ یورپ میں بھی اس کا چرچا ہے، ورفعنا لک ذکرک کا الٰہی فرمان پورا کرنے میں جس نے بھی حصہ لے گا رفعت ذکر کے انعام سے خود اسے بھی سرفراز کیا جائے گا!

کیں منزلت بہ تخت سلیماں برابر است

بقیہ بزم ریاض از صـ ۴۳

ڈاکخانہ دسنہ ضلع پٹنہ
۱۱ر جنوری ۱۹۵۴ء

عزیز محترم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

اخبار صدق میں آپکا تعزیتی مضمون سید سلیمان علیہ الرحمۃ کی رحلت پر پڑھ کر دل بہت متاثر ہوا، آپکا اس قدر اُنکی وفات پر آنسو بہانا لازمی تھا، اس لئے کہ آپکو اُنکی شاگردی کا فخر حاصل ہے، اور اُنسے آپکو بڑی عقیدت تھی آپسے مجھکو نیازِ غائبانہ آپکی تصانیف کے ذریعہ نیز عزیزم مصطفےٰ کریم کی زبانی حاصل ہے، اور سید صاحب علیہ الرحمۃ میرے عزیز خاص میں تھے، اور مجھ سے مثل بیٹے کے محبت رکھتے تھے، اسی بنا پر میں آپکو یہ خط بے تکلفانہ لکھ رہا ہوں جسمیں ایک غرض یہ بھی شامل ہے کہ آپ ماہنامہ ریاض کے وہ نمبر جن میں ڈھاکہ کا خطبۂ صدارت شائع ہوا ہے اور سید صاحب علیہ الرحمۃ کے تعزیت میں اور حالات میں آپنے مضامین لکھے ہیں ان کو مندرجہ بالا پتہ پر بذریعہ رجسٹرڈ بک پوسٹ ارسال فرما کر ممنون منت فرمائیں، ان پرچوں کی جتنی قیمت ہو اس سے مجھ کو مطلع کر دیں، تاکہ میں ڈھاکہ سے اپنے ایک عزیز کو لکھ کر بذریعہ منی آرڈر آپکے پاس بھجوا دوں۔ دعاگو
(مولانا) سید عبدالحکیم رحمانی

آئی جو اُن کی یاد تو آتی چلی گئی

محمد اویس نگرامی ندوی

سید صاحب کا کسی نے نام لیا، یا ان کا خیال آگیا تو ان کی علمی مجلسوں بے تکلف صحبتوں، اور اخلاقی عظمتوں کے اس قدر مناظر یکے بعد دیگرے، نگاہوں کے سامنے آتے ہیں کہ ان کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا، قوتِ حافظہ مسلسل اپنے واقعات یاد دلاتی ہے کہ مختصر صفحات میں انکو سمیٹنا آسان نہیں ہے تاہم برادر محترم جعفری صاحب نے اس مجسمۂ حسن و خوبی، اور اس پیکرِ محبوبی، کی یاد میں جو مجلس عزا منعقد فرمائی ہے اسمیں عقیدت کے چند آنسو ضرور بہانا ہے۔

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں
تو ہائے گل پکار، میں چلاؤں ہائے دل

سید صاحب کے علمی کمالات کے بعد سب سے زیادہ جس چیز نے مجھ کو ان سے متاثر کیا وہ انکی بے داغ زندگی ہے قرآن مجید کے درس میں وہ جو کچھ فرماتے تھے، یا سیرت کے صفحات میں جو کچھ لکھتے تھے، بہ قدر طاقت و ہمت ان کی زندگی، اس کے مطابق تھی سید صاحب کے وطن دیسنہ ضلع پٹنہ میں غالباً ڈیڑھ ماہ اور دار المصنفین میں تقریباً چھ سال میں نے سید صاحب کو خوب دیکھا، ان کی عبادات ان کے اخلاق اور ان کے معاملات میری نگاہوں کے سامنے ہیں، اس تجربہ کے بعد میرے قلب میں یہ اثر پیدا ہوا کہ ایک مسلمان کی زندگی ایسی شان کی گزرنی چاہئے، اس پوری مدت میں عذر شرعی کے بغیر میں نے سید صاحب کی جماعت چھوٹتے نہیں دیکھا، دار المصنفین میں تو خیر مسجد گھر سے ملی ہوئی تھی، البتہ دیسنہ کی مسجد سید صاحب کے دولت خانہ سے اچھے خاصے فاصلہ پر تھی، لیکن مئی اور جون کی تپتی ہوئی دھوپ میں بھی سید صاحب ضعف اور پیری کے باوجود بقیہ اوقات کیطرح ظہر کی نماز کیلئے برابر مسجد تشریف لاتے تھے، اور نماز کے بعد اسی مسجد میں عصر تک قرآن کا درس دیا کرتے تھے۔

حضرت مولانا تھانوی رحمتہ اللہ علیہ سے بیعت ہونے سے پہلے نوافل کیطرف زیادہ توجہ تو نہ تھی مگر فرائض و سنن اسوقت بھی بڑے سکون و طمانیت سے ادا فرماتے تھے، تراویح میں حتی الامکان میں ان کے پاس کھڑا ہوتا تھا اچھی طرح معلوم ہے کہ جب امام صاحب قرأت فرماتے تھے اسوقت سید صاحب کی پوری توجہ قرآن مجید کے الفاظ اور معانی کی طرف ہوتی تھی، لیکن مولانا تھانوی رحمتہ اللہ علیہ سے بیعت ہونے اور اذکار کی کثرت کے بعد تہجد اور دوسرے نوافل کا خاص اہتمام ہو گیا تھا، اور نماز کے اندر ذوق و شوق خشوع و خضوع اور حضورِ حق کی کیفیت ہی دوسری ہو گئی تھی، نعبد اللہ کانک تراہ کا سماں کھنچ جاتا تھا، کئی بار ارشاد فرمایا کہ مولوی صاحب، آجکل امام پیچھے کا (یعنی مقتدیوں کا) خیال کرتے ہیں کہ ہماری قرأت سے ان پر کیا اثر پڑتا ہے۔ آگے کا (یعنی حق تعالےٰ کا) خیال نہیں کرتے ہیں۔

جب میری حاضری دار المصنفین میں ہوئی اس وقت سے میری درخواست پر روزانہ قرآن مجید کا درس ہوتا تھا۔ در نہ ماہ رمضان میں سید صاحب کا سب سے محبوب شغل درسِ قرآن تھا۔ یہ درس ظہر کی نماز کے بعد سے عصر تک جاری رہتا۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے اساتذہ اور طلباء میں سے جن کو دلچسپی ہوتی تھی وہ اس میں شرکت کے لئے اعظم گڑھ آتے تھے۔

سید صاحب کو اللہ تعالےٰ نے بہ قدر ضرورت دنیا کی دولت بھی دی تھی۔ اس لئے وہ باقاعدہ اپنے مال کی زکوٰۃ نکالتے تھے۔ اور مجھ کو خوب معلوم ہے کہ بہت ہی مخفی طور پر وہ امور خیر میں چھوٹی اور بڑی رقمیں برابر خرچ کرتے رہتے تھے۔

سید صاحب کی مجلس میں کبھی کسی کی غیبت نہیں سُنی گئی، زبان سے متانت کیخلاف کوئی لفظ نہیں ادا ہوا، حلم اور وقار انکا فطری جوہر تھا اور صبر و تحمل کے تو وہ پہاڑ تھے۔

ایک مرتبہ دارالمصنفین کے زمانہ قیام میں بعض معاملات کی وجہ سے میں بیحد شکستہ خاطر تھا سید صاحب کو اس کا اندازہ تھا۔ ایک دن مجھ کو اپنے کمرے میں بُلایا اور فرمایا کہ انسان کا اپنا ضمیر مطمئن اور معاملہ صاف ہونا چاہئے، کسی کے کہنے سُننے سے کیا ہوتا ہے؟ پھر کچھ خطوط نکال کر مرحمت فرمائے اور فرمایا کہ دیکھئے ان خطوط میں مجھ پر کیسے الزامات لگائے گئے ہیں؟ لیکن ان سب کے جواب میں میں نے صبر اور خاموشی کو اختیار کیا ہے، میں نے ان خطوط کو دیکھا، سید صاحب کی قوت برداشت پر رشک آگیا، اور دل نے بڑی تسکین پائی۔ تواضع اور فروتنی میں سید صاحب آپ اپنی مثال تھے، چنانچہ، قصد السبیل مولانا تھانوی رح کا ایک رسالہ ہے جس میں مولانا نے تعلیم سلوک کے سلسلے میں عالم مشغول، عالم غیر مشغول، عامی مشغول، عامی غیر مشغول کیلئے الگ معمولات متعین فرمائے ہیں۔ مولانا تھانوی رح نے سید صاحب کو تحریر فرمایا کہ اس رسالہ میں سے آپ اپنے لئے کوئی معمول متعین فرمالیں، سید صاحب نے عامی مشغول کے معمولات کو اپنے لئے تجویز فرمایا، اور مولانا کو اطلاع دی، مولانا نے ملاحظہ فرمایا کہ سید صاحب نے اپنے لئے عالم کے بجائے عامی کے معمولات تجویز فرمائے ہیں تو تحریر فرمایا کہ اس تواضع سے جی بہت خوش ہوا اب میں اپنی طرف سے آپ کیلئے عالم مشغول کے معمولات تجویز کرتا ہوں۔

جب سید صاحب مولانا تھانوی رح سے بیعت ہوئے تو ملک کے بعض حلقوں میں بڑا برہمی ظاہر کی گئی، یہ وہ لوگ تھے جو سید صاحب کے علوم و کمالات سے تو محبت کرتے تھے مگر نہ تو ان کے مزاج شناس تھے، اور نہ اس راہ کے واقف کار تھے، روزانہ کی ڈاک سے بیسیوں خطوط اس سلسلہ میں شکوہ و شکایت سے بھرے ہوئے آتے تھے۔ ایک دن سید صاحب کہنے لگے کہ دیکھئے یہ لوگ زبان سے مجھکو فاضل اور محقق کہتے ہیں مگر در حقیقت مجھ کو بے عقل جانتے ہیں، آخر یہ لوگ اس بات پر کیوں نہیں غور کرتے ہیں کہ اگر ان کے خیال کے مطابق میں واقعی محقق اور علامہ دہر ہوں تو کیا بے وجہ میں نے مولانا تھانوی رح کا دامن تھاما؟ ان لوگوں کو سمجھنا چاہئے کہ میں نے اپنے اندر کوئی تو کمی پائی جسکی تکمیل کیلئے وہاں گیا۔

اسی سلسلہ میں ایک دن ارشاد فرمایا کہ مولوی صاحب میں نے سیرت میں نماز، روزہ اور حج کے اسرار، حکم اور مصالح، بہت بیان کئے تھے مگر اب تک نماز پڑھنا نہ آیا تھا، روزہ کا لطف نہ حاصل ہوا تھا، یہی وجہ تھی کہ غالباً دو حج کر لینے کے باوجود سید صاحب نے بھوپال کے زمانہ قیام میں پھر حج کیلئے سفر فرمایا تاکہ یہ حج پورے ذوق و شوق اور صحیح کیفیات کیساتھ ادا ہو۔

دارالمصنفین کی مسجد میں سید صاحب کے ایک شاگرد مغرب کے بعد یا فجر کے بعد ذکر کیا کرتے تھے، بیعت ہونے سے پیشتر ایک مرتبہ سید صاحب نے ان سے ہنس کر فرمایا کہ آپ اپنا سینہ کیوں خراب کرتے ہیں؟ وہ شاگرد ادب کی بنا پر خاموش رہے، مگر چند دنوں بعد جب خود سید صاحب پر یہ رنگ آیا پھر تو یہ کیفیت تھی کہ صبح و شام، ظہر کے بعد، یہاں تک کہ تصنیف و تالیف کے کمرے سے بھی سید صاحب کے ذکر کی آوازیں آتی رہتی تھیں۔

سید صاحب کے حلم و وقار اور کثرت ذکر کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ وہ سب سے بے تعلق ہو کر بالکل زاہد متقشف ہو گئے تھے، یہ بات بالکل نہ تھی وہ بیحد شگفتہ مزاج تھے۔ ایک واقعہ خود سید صاحب نے نقل فرمایا کہ تھانہ بھون میں قیام تھا مولانا تھانوی رح نے سید صاحب کو بطور تحفے کے ایک تسبیح عنایت فرمایا، سید صاحب نے اس سلسلہ میں دو شعر کہے اور خواجہ عزیز الحسن صاحب مرحوم کو سنائے خواجہ صاحب نے یہ اشعار مولانا کو سنائے اس پر مولانا نے فرمایا کہ "اچھا ماشاء اللہ خشک نہیں ہیں، تر ہیں"۔

سید صاحب کے یہاں ریڈیو خریدا گیا اور اس کے لئے عمدہ قسم کا غلاف تیار کیا گیا، خیال ہوا کہ اس غلاف پر کوئی عبارت کاڑھ دی جائے اب سید صاحب کے حسن مذاق کی داد دیجئے۔ اس کیلئے آیت ذیل کا انتخاب فرماتے ہیں۔

اَنْطَقَنَا اللّٰہُ الَّذِیْ اَنْطَقَ کُلَّ شَیْءٍ

ایک مرتبہ خطوط کیلئے پیڈ تیار کرائے گئے۔ سرنام پر چھاپنے کیلئے یہ آیت تجویز فرمائی۔

اِنَّہٗ مِنْ سُلَیْمَانَ وَاِنَّہٗ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سید صاحب لطف و مزاح کی باتیں بھی خوب کرتے تھے، ایک دن قرآن مجید کے درس میں سید صاحب کی نظر ہم لوگوں کے قرآن مجید کے جزدانوں پر پڑی۔ برادر مکرم شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی اڈیٹر معارف کا قرآن مجید بغیر جزدان کے تھا۔ غالباً ایک تولیہ میں لپٹا ہوا تھا، برادرم سید صباح الدین صاحب کے قرآن مجید کے جزدان پر کچھ پھول بنے ہوئے تھے، میرا قرآن شریف دو جزدانوں میں تھا اور اندر کا جزدان ذرا اچھا خاصا پر تکلف تھا، سید صاحب نے فرمایا دیکھئے آپ تینوں کے جزدان آپ کے موجودہ احوال کی ترجمانی کر رہے ہیں، ہمارے شاہ صاحب بے چارے بغیر بیوی کے ہیں (ان کی اہلیہ کا انتقال ہو چکا تھا) اس لئے قرآن بھی بغیر جزدان کے ہے۔ صباح الدین صاحب کی شادی کو ذرا عرصہ ہو چکا ہے، اس لئے جزدان تو ہے مگر سادگی ہے۔ میری طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ مولوی صاحب ابھی نو گرفتاروں میں ہیں اس لئے ماشاء اللہ جزدان بھی رشک چمن بنا ہوا ہے۔ ہم سب ہنس پڑے۔

مخدومی مولانا عبدالسلام صاحب ندوی (دارالمصنفین) سید صاحب کے عمر بھر کے رفیق ہیں، کبھی کبھی انکی زندگی میں خاص کیفیتیں پیدا ہو جاتی ہیں، یہ مولانا کے جوش و خروش کے دن ہوتے ہیں۔ ہر وقت باغ و بہار بنے رہتے ہیں، سید صاحب جب مولانا کو ان حالات میں دیکھتے تو زیر لب تبسم فرماتے اور یہ مصرع پڑھتے۔

ان دنوں جوشِ جنوں ہے مرے دیوانے کو

سید صاحب کو دارالعلوم ندوۃ العلماء اور دارالمصنفین سے جو وابستگی تھی وہ ظاہر ہے، ایک دن ارشاد فرمایا کہ میں ہر فرض نماز کے بعد اپنے ان دونوں اداروں کے لئے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالےٰ ان دونوں اداروں کے کارکنوں کو یکجہتی سے کام کرنے کی توفیق دے۔

آخر دور میں سید صاحب کی بڑی خواہش تھی کہ یہ دونوں ادارے اپنے بنیادی مقاصد کے سوا کسی اور چیز میں نہ الجھنے پائیں ایک ندوی عالم جن کو سید صاحب عزیز بھی رکھتے تھے، انھوں نے سید صاحب کی خدمت میں ایک خط لکھا، جس میں انھوں نے اپنے سیاسی ذوق کو ظاہر کیا، سید صاحب نے انکو بڑے درد کیساتھ لکھا کہ آپ سیاست کیلئے جان دینا چاہتے ہیں اور افسوس کہ مذہب کیلئے جینا بھی نہیں چاہتے؟

موجودہ دور کے علمی انحطاط سے سید صاحب بیحد رنجیدہ رہا کرتے تھے، ہم لوگوں کو برابر نصیحت فرماتے تھے کہ صرف الفاظ کی بندش

کوئی چیز نہیں ہے، اصل چیز مغز اور مفویت ہے جس کو حسن ترتیب سادہ ترکیب اور سہل الفاظ میں پیش کر دیا جائے، مولانا شبلی مرحوم کی یہ بات اکثر سنایا کرتے تھے کہ میں تحریر و تقریر میں مخاطب کے سامنے اسقدر مواد رکھدیتا ہوں کہ اس کو الفاظ کی طرف متوجہ ہونیکا موقع ہی نہیں دیتا۔

سید صاحب مضامین یا تصنیف و تالیف میں متقدمین کی کتابوں کے حوالوں کا مشورہ ہمیشہ دیا کرتے تھے، سیرۃ النبی جلد اول پر جب نظر ثانی کی خدمت میرے سپرد فرمائی تو ایک موقع پر سیرت حلبیہ کے حوالہ کے بغیر چارہ نظر نہ آیا۔ سید صاحب نے بہت تردد کے بعد اسکو قبول فرمایا۔

پیرانہ سالی کے باوجود سید صاحب اپنے علمی کاموں میں بیحد محنت کرتے تھے، ہم لوگ تصنیف و تالیف کے اوقات میں تھک کر اپنے کمروں سے باہر نکل جایا کرتے تھے، مگر سید صاحب جس وقت سے تشریف لاتے مسلسل کام کرتے رہتے، تحقیق و تلاش کے سلسلے میں نئے رفقا کو (برادرم شاہ معین الدین صاحب کی اصطلاح ہیں) سید صاحب کی بیٹھکی میں رہنا پڑتا، مجھ کو اچھی طرح یاد ہے کہ جب یہ سعادت میرے نصیب میں آئی تو یک تخت پانچ پانچ گھنٹے کھڑے کھڑے گزر جاتے تھے مگر پاس ادب سے اشارہ پائے بغیر بیٹھنے کی ہمت نہ ہوتی تھی، اس صورت حال کا ایکایک سید صاحب کو احساس ہوتا تھا اور چپراسی کو آواز دیتے کہ خالق رضا مولوی صاحب کیلئے کرسی لا دو۔

سید صاحب کے ضعف و اضمحلال طبع کے باعث سب کی خواہش تھی کہ سید صاحب اب بہت کم کام کریں، ایک بار اس کا خاص اہتمام بھی کیا گیا، موقع پا کر سید صاحب کتب خانہ تشریف لائے، اور میز پر پڑے ہوئے کاغذات کو الٹنے پلٹنے لگے فوراً زنانخانہ سے آدمی آیا کہ اندر بلایا جا رہا ہے۔ سید صاحب صورت واقعہ کو سمجھ گئے، ہنس دیئے، اور فرمایا کہ چور چوری سے گیا، کیا ہیرا پھیری سے بھی گیا؟

اوپر کے واقعہ میں سید صاحب کی اس میز کا ذکر آ گیا جس پر وہ تصنیف و تالیف کا کام کیا کرتے تھے، اس تقریب سے ایک خاص واقعہ یاد آ گیا۔

اعظم گڑھ میں مسلم لیگ کا جلسہ تھا، مولانا ظفر علی خاں صاحب اس میں شرکت کے لئے تشریف لائے تھے۔ شہر میں ان کا قیام تھا، سید صاحب کی ملاقات کی غرض سے وہ دار المصنفین تشریف لائے مگر سید صاحب اعظم گڑھ سے باہر تشریف لے گئے تھے، مولانا ظفر علی صاحب سید صاحب کی میز کے پاس تشریف لے گئے۔ میز پر رکھے ہوئے سید صاحب کے مضامین و تصنیفی مسودات دیکھ کر وہ بے حد متاثر ہوئے اور کاغذ پر ایک شعر لکھا اور اس کو میز پر اس طرح رکھ دیا کہ آتے ہی سید صاحب کی نظر اس پر پڑے، شعر یہ تھا۔

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے   کہے دیتی ہے شوخی نقش پا کی

اس عہد کے تمام ممتاز علماء، صلحاء اور قومی رہنماؤں سے سید صاحب کے بڑے مخلصانہ تعلقات تھے، بالخصوص وہ اہل علم کا بے حد اکرام فرمایا کرتے تھے، میرے دلیسنہ کے زمانہ قیام میں مولانا ابوبکر شیث صاحب مرحوم (ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی) سید صاحب کی ملاقات کی غرض سے دلیسنہ تشریف لائے، اہل دلیسنہ کو مولانا ابوبکر شیث مرحوم کے خاندان سے کچھ شاگردی کا تعلق بھی تھا جس کو سید صاحب نے اس وقت بتلایا تھا مگر اب یاد نہیں ہے۔ سید صاحب نے مولانا کے اعزاز و اکرام میں پوری بستی کی بہت پر تکلف دعوت فرمائی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شا

کی کوئی تقریب منائی گئی ہے!

اہل علم اور صلحاء سے تو سید صاحب بہت تواضع کے ساتھ ملتے تھے مگر ان کے سوا امراء یا قومی رہنماؤں سے ملاقات میں وہ عالمانہ وقار کا بہت خیال رکھتے تھے۔

اکتوبر سنہ ۱۹۳۷ء میں لکھنؤ میں مسلم لیگ کا وہ تاریخی اجلاس ہوا تھا جس میں اس وقت کے شیر بنگال سر فضل الحق کی گرج اور چمک نے دل ہلا دیئے تھے۔ لکھنؤ کے ایک مشہور تعلیمی ادارہ نے سر فضل الحق کو اپنے یہاں اس نیت سے مدعو کیا کہ آئندہ کسی موقع پر بنگال میں انکی وزارت عظمیٰ کے ذریعہ سے اس ادارہ کیلئے روپیہ حاصل کیا جائے۔ سر فضل الحق آئے۔ اعیان شہر کے سوا، صوبہ کے ممتاز لوگ استقبال کیلئے موجود تھے مگر میں نے دیکھا کہ سید صاحب اس مجمع سے ہٹ گئے تھے، سر فضل الحق کی نگاہوں نے خود ہی سید صاحب کو تلاش کر لیا اور انھوں نے آگے بڑھکر بڑے عقیدتمندانہ لہجہ میں شکوہ کیا کہ مولانا آپ تو مجھکو بھول گئے؟۔

علم و عمل کی ان بلندیوں کے باوجود سید صاحب میں قبول حق کا سامان بہت تھا۔ اپنی پوری تصنیفی زندگی میں انھوں نے غالباً چار پانچ مسئلوں میں جمہور امت سے اختلاف کیا تھا (۱) معراج جسمانی (۲) فنائے نار (۳) تصویر، ایک دو مسئلے اور تھے مگر جب اللہ تعالیٰ نے ان پر امر حق کو منکشف فرما دیا تو کسی تامل کے بغیر سید صاحب نے ان مسائل سے رجوع فرمایا اور معارف میں باقاعدہ اسکا اعلان فرما دیا۔

سیرۃ النبی کی پہلی جلد میں غزوہ بدر کے سلسلہ میں ایک صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق سید صاحب کے قلم سے ایسے الفاظ نکل گئے تھے جو نامناسب تھے۔ سید صاحب نے اس جلد کے موجودہ ایڈیشن میں جسطرح اس پر اظہار معذرت فرمایا ہے وہ دیکھنے کی چیز ہے۔

دار المصنفین میں جب صاحب حیات شبلی لکھ رہے تھے، اتفاق سے اس زمانہ میں مولانا شبلی مرحوم کے مضمون (مسلمانوں کو غیر مذہب حکومت کا محکوم ہو کر کیونکر رہنا چاہیئے) پر میری نظر پڑی، محسوس ہوا کہ مولانا نے شامی کے جس فقرے پر اپنے اس مضمون کی بنیاد رکھی ہے اسکے صحیح پڑھنے میں ان سے سہو ہو گیا ہے، میں نے سید صاحب کی خدمت میں اپنا خیال ظاہر کیا، سید صاحب نے شامی کو ملاحظہ فرمایا اور جب خود بھی مطمئن ہوگئے تو حیات شبلی میں اس مضمون کی تصحیح کے لئے ایک نوٹ لکھ دیا، جو صفحہ ۱۳۱ و ۱۳۲ پر موجود ہے۔

سید صاحب کے احتیاط کا یہ حال تھا کہ جب حیات شبلی کا مسودہ تیار ہو چکا تو پریس میں دینے سے پہلے نواب صدر یار جنگ مرحوم اور مخدومی مولانا مسعود علی صاحب مدظلہ اور نیز دوسرے متعلق حضرات کو دکھلایا کہ شاید کہیں کوئی غلطی ہو گئی تو اصلاح ہو جائے!

سید صاحب نے بچوں کے لئے رحمت عالم تصنیف فرمایا، مگر طباعت سے پہلے اس کو اپنے شاگردوں کے سپرد فرمایا، اور لفظی و معنوی ہر گرفت کے لئے ان کو پوری آزادی دی لیکن ظاہر ہے کہ سہو اور سبقت قلم کی اور بات تھی ورنہ عمداً غلطی کا امکان ہی کیا تھا؟

افسوس کہ وقت کم ہے اور سلسلۂ سخن دراز ہوتا جا رہا ہے اور بات پر بات یاد پڑتی جا رہی ہے، اسلئے اب قصداً قلم کو روکنا پڑتا ہے، باقی پھر کبھی انشاء اللہ!

یگانۂ عصر صوفی

مولانا شاہ غلام حسنین ندوی پھلواری شریف

علامہ سید سلیمان ندوی کی وفات سے جہاں یہ غم ہے کہ عصر حاضر کا بہت بڑا صاحب نظر عالم اور اہل قلم رخصت ہو گیا، وہاں مجھے یہ غم بھی ہے کہ ہمارے خاندان تصوف کا ایک بڑا صاحب دل سالک اور بزرگ اٹھ گیا، سید مرحوم کے والد ماجد حضرت مولانا حکیم شاہ ابوالحسن اسلام پوری اپنے وقت کے بڑے صوفی بزرگ تھے، میرے والد ماجد حضرت قبلہ مولانا شاہ سلیمان پھلواروی اور میرے نانا حضرت قبلہ مولانا شاہ بدرالدین پھلواروی اور حضرت حکیم صاحب قبلہ، تینوں مرید و مسترشد اور خلفاء تھے میرے نانا حضرت مولانا شاہ محمد علی حبیب نصر پھلواروی کے۔ اور ان تینوں بزرگوں کے درمیان بڑے خصوصی تعلقات اور گہرے برادرانہ روابط تھے، سید مرحوم اور ہم لوگوں کے درمیان جو اخلاص اور محبت تھی، وہ وراثت خاندانی بھی تھی، اور ذاتی بھی، سید مرحوم نے اپنی نوجوانی کا زمانہ پھلواری شریف میں بسر کیا تھا، اور ابتدائی تعلیم و تربیت یہیں مدرسہ خانقاہ میں حاصل کی تھی، میرے بڑے بھائی مولانا شاہ حسن میاں مرحوم، ان کے ہم عمر اور ہم سبق تھے، ہم لوگ سید مرحوم کو اپنا بڑا اور بزرگ بھائی سمجھتے تھے، اور حضرت قبلہ والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ ان کو بیٹے کی طرح عزیز رکھتے تھے، یہ رشتہ آخر دم تک قائم رہا، وہ جب کبھی پھلواری سے گزرتے، اپنی مصروفیتوں کے باوجود خاص طور پر ملنے آتے، اور اگر ملاقات کسی وجہ سے نہ ہوتی تو جا کر خط لکھتے، اور افسوس کرتے۔

سید مرحوم غالباً ۱۸۹۹ء میں پھلواری تشریف لائے تھے اور یہیں سے ۱۹۰۱ء میں وہ اور بھائی جان دارالعلوم ندوہ بھیجے گئے تھے، یہ دونوں ابتدا ہی سے بڑے صوفی منش تھے، کسی شخص کی سیرت و مزاج کی تعمیر میں اگر ابتدائی تعلیم و تربیت کا کوئی دخل ہوتا ہے اور یقیناً ہوتا ہے تو پھر سید مرحوم کا جو اپنے وقت کے ایک بڑے قومی رہبر، بڑے اہل قلم، بڑے مورخ، اور بڑے عالم دین ہوئے، ایک بڑا صوفی صافی ہو جانا کوئی حیرت انگیز بات نہیں ہے، بلکہ حق تو یہ ہے کہ یہی ان کی منزل اعلیٰ تھی، انہوں نے تصوف کی گود میں پرورش پائی تھی، پھلواری کے مخصوص صوفیانہ ماحول میں تعلیم و تربیت حاصل کی تھی، اور اس کے بعد دارالعلوم ندوہ میں تکمیل علوم کی تھی، وہ مجلس ندوۃ العلماء جس کے بانی صوفی تھے، سرپرست صوفی تھے، اور وہ دارالعلوم جس کے ناظم صوفی تھے، معتمد تعلیم صوفی تھے، اور جس کے بارے میں مؤلف رحمۃ للعالمین مولانا قاضی محمد سلیمان منصور پوری نے اپنے خطبۂ صدارت میں بجا طور پر کہا تھا کہ "جس ندوہ کے بانیان قدیم جناب مولانا مولوی محمد علی صاحب مونگیری اور جناب شاہ سلیمان صاحب پھلواری جیسے مالک سجادہ و صاحب وسادہ ہوں وہ مجلس کیوں تصوف کا تحفظ نہ کرے" یہ ندوۃ العلماء اگر ایک خواب تھا تو سید مرحوم اسی خواب کی صوفیانہ تعبیر تھے اور سچی تعبیر تھے۔

سید مرحوم کی شخصیت پر، علم و فضل پر، اور ان خدمات جلیلہ پر، جو انہوں نے قومی زندگی میں علمی زندگی میں اور فکری زندگی میں انجام دی ہیں، طرح طرح سے روشنی ڈالی جائے گی، اور مزید ڈالی جانی چاہئے، مگر اس کو نہ فراموش کیجئے کہ اس مادی عہد میں سید مرحوم نے اپنی زندگی سے ایک اعلیٰ نمونہ دنیا کے سامنے اس کا بھی تازہ کیا ہے، کہ سچا اسلامی تصوف کیا ہے؟ اور اصلی سالک و صوفی

کیا ہوتا ہے؟

صحیح تصوف کے جاننے اور ماننے والے جیسے جیسے اُٹھتے جاتے ہیں ویسے ویسے تصوف کے بارے میں بے خبری، اور غلط فہمی بڑھتی جاتی ہے، عوام رہبانیت، گوشہ نشینی، اور ترک دنیا میں ہی دین و عرفان کو منحصر سمجھتے ہیں، حالانکہ ایسا نہیں ہے، بلکہ تعلقاتِ دنیا کیساتھ ساتھ یادِ خدا قائم رہے، اور اس سے غفلت نہ ہو، صحابہؓ کرام کی عموماً یہی حالت تھی کہ لا تلهيهم تجارة ولا بيع عن ذكر الله، وہ دن کو حکمرانی و فرماں روائی کرتے تھے، اور رات کو ذکر الٰہی و تذلل و ابتہال میں گزارتے تھے۔

در کفے جام شریعت در کفے سندان عشق!

خواص، یعنی پڑھے لکھے لوگ بھی جو دنیا کے ہر فلسفے پر سر دھنتے ہیں، یہ نہیں جانتے کہ تصوف بھی ایک فلسفہ ہے، اور عام فلسفہ اور تصوف کے درمیان فرق، علم اور عمل کا ہے، فلسفی جانتا ہے، اور صوفی دیکھتا ہے، فلسفی دلائل سے ثابت کرتا ہے، کہ سچ اچھی چیز ہے، گرچہ خود بے تکلف جھوٹ بول جاتا ہے، مگر صوفی کی زبان سے، بلا قصد بھی سچ ہی نکلتا ہے، اسی طرح صوفی اور زاہد کے درمیان بھی بڑا فرق ہے، اور یہاں بھی یہ فرق زاویۂ نگاہ کا ہے، عبادت دونوں کرتے ہیں مگر ایک ڈر سے کرتا ہے، یا اجر پانے کے لئے کرتا ہے، دوسرا اس لئے کرتا ہے کہ عشق و محبت کا تقاضا یہی ہے، اسی لئے اس راہ میں اگر اسے تکلیفیں بھی پہنچتی ہیں تو اس کو ان تکلیفوں میں بھی ایک راحت ملتی ہے، مزہ آتا ہے، صوفیہ اسی مقام کو مقام رضا کہتے ہیں، تصوف کی اصل بنیاد عشق ہے، یہی عشق جب تلاش شاہد حقیقی میں کائنات پیمائی کرنے لگتا ہے تو صوفی کو فلسفی کے دوش بدوش کھڑا کر دیتا ہے، فلسفی اپنے فلسفے کی عقل سے جانتا ہے، کہ خدا ایک ہے، اور صوفی اپنے تصوف کی آنکھ سے دیکھتا ہے، کہ خدا ایک ہے، مگر صوفی کہتا ہے کہ صرف جاننا ہی کافی نہیں اسے دیکھنا بھی ضروری ہے۔

مغرور مشو کہ توحید خدائے
واحد دیدن بود، نہ واحد گفتن

سید مرحوم اسی "واحد دیدن" کی منزل عرفان میں تھے، چوتھی صدی میں جب علم و فضل کا زمانۂ شباب تھا، شیخ بو علی سینا بڑا فلسفی گذرا ہے، اسی کے ہم عصر سلطان ابو سعید ابو الخیر بڑے صوفی بزرگ تھے، دونوں میں مراسلت رہتی تھی، اور خطوط میں بڑے دقیق مسائل پر بحث ہوتی تھی، (وہ خطوط آج بھی تاریخ کے خزانے میں محفوظ ہیں) اور "واحد دیدن" اور "واحد گفتن" کے زندہ نمونے ہیں، شیخ بو علی سینا اپنی فلسفیانہ تحقیق و دریافت ان کے سامنے پیش کرتا تھا، اور مشکل مسائل میں ان کی رائے پوچھا کرتا تھا، اور وہ اپنی صوفیانہ بصیرت کے جواب اس کو دیا کرتے تھے، وہ کہتے تھے "او می گوید من می بینم"۔

تصوف اصل میں وہی ہے جو علم دین کے ساتھ ہو متفق علیہ احادیث میں ہے کہ حضرت جبریل نے رسول اللہ صلعم کی خدمت میں حاضر ہو کر سوال کیا کہ "ما الاحسان یا رسول اللہ؟"۔ "احسان کیا چیز ہے؟" آپ نے فرمایا ان تعبد اللّٰہ کانك تراہ فان لم تكن تراہ فانه یراك یعنی اللہ کی عبادت یوں کرو، گویا تم اسے دیکھ رہے ہو، اور اگر یہ نہ ہو سکے تو یوں سمجھو کہ وہ تم کو دیکھ رہا ہے۔" صوفیہ کے یہاں ان ہی دونوں کیفیات کا نام "مراقبہ" ہے۔ پہلی کیفیت مراقبۂ استغراق و مشاہدہ کی ہے، اور دوسری کیفیت "اللہ حاضری، اللہ ناظری" کا ملاحظہ ہے، یہ مراقبات مومن کو احسان کے درجے میں لاتے ہیں اور زمرہ محسنین میں داخل کرتے ہیں، اور محسنین کیلئے چونکہ معیت الٰہی لازمی ہے (ان اللہ مع المحسنین)۔ پس محسنین کی شان سے ہے کہ ھو معکم اینما کنتم کے مراقبات میں مستغرق رہیں اور قرب و معیت کی تجلیات سے نور ہی نور ہو جائیں، شریعت و طریقت و حقیقت ایسے مسلسل اور وابستہ ہیں کہ ان میں جدائی ہو ہی نہیں سکتی، شریعت،

زاد راہ وساز وسامان کا نام ہے۔ طریقت، راستہ چلنا اور منازل طے کرنا ہے، اور حقیقت، منزل مقصود پر پہنچنا ہے۔
حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رح فرماتے ہیں، لیس لنا نبیٌ غیرہ فنتبعہ، ولا کتاب غیر القرآن فنعمل بہ، تخرج عنہما فتھلک، والسلامۃ مع الکتاب والسنۃ، والھلاک مع غیرھما، وبھما یرتقی العبد الی حالۃ الولایۃ والبدلیۃ والغوثیۃ، ینبغی للمومن ان یشتغل اولاً بالفرائض، فاذا فرغ منھا اشتغل بالسنن ثم اشتغل بالنوافل والفضائل، فلالم یفرغ من الفرائض فالاشتغال بالسنن حمق ورعونۃ، فان اشتغل بالسنن والنوافل قبل الفرائض لم یقبل منہ۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا ہمارے لئے کوئی نبی وہادی نہیں ہے جس کی ہم پیروی کریں، اور نہ قرآن کے سوا کوئی کتاب وقانون ہے جس پر ہم عمل کریں، ان دونوں سے نکلے تو ہلاک ہوئے سلامتی صرف کتاب وسنت ہیں ہے، ان کے سوا ہر دوسری راہ ہلاکت کی راہ ہے، یہ قرآن وسنت ہی ہے جس کے ذریعے بندہ، ولایت اور ابدالیت اور غوثیت کے مدارج تک پہنچتا ہے، مومن کو چاہئے کہ پہلے فرائض ادا کرے، جب ان سے فارغ ہو تو سنن ہیں مشغول ہو، پھر نوافل وفضائل کا درجہ ہے، اگر کسی نے فرائض سے فراغت نہیں کی تو سنن ہیں مشغول ہونا حماقت ورعونت ہے، فرائض سے پہلے سنن ونوافل کی مشغولیت کبھی مقبول نہ ہوگی۔

اور حضرت مخدوم شرف الدین بہاری فرماتے ہیں کہ "واجب است کہ راہ طریقت بموافقت شریعت برود، ہر کرا بینی در طریقت موافق شریعت نبود اورا از طریقت ہیچ فائدہ نہ بود، وآں مذہب ملحدان است کہ قیام یکے بر دیگرے روا دارند وگویند کہ چوں حقیقت کشف شد شریعت برخیزد، برآں اعتقاد لعنت باد، ظاہرے باطن، نفاق است، وباطن بے ظاہر زندقہ است، ظاہر شریعت بے باطن نفس است وباطن بے ظاہر ہوس، ظاہر با باطن پیوستہ است، در اصل کہ ہیچ کس جدا نہ کردہ است لا الٰہ الا اللہ حقیقت است ومحمد رسول اللہ شریعت است، اگر کسے خواہد در حال صحت ایمان یکے را از دیگرے جدا کند نتواند وخواہش باطل شود۔"

تصوف اسلامی کی اصلی میزان ومعیار یہی ہے، سید مرحوم کی پوری زندگی اسی میزان ومعیار کے مطابق بسر ہوئی، اور اس ترتیب واصول میں کبھی مطلق کوئی فرق نہیں آیا، جس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ امام غزالی نظامیہ بغداد میں مدرس اعلیٰ ہیں اور درس دے رہے ہیں، یا شیخ ابوالنجیب عبدالقادر سہروردی نظامیہ یونیورسٹی کے پرنسپل ہیں اور ادارۂ تعلیم کی رہنمائی کر رہے ہیں، یا جس طرح امام ابوحنیفہ اپنی مجلس البرکہ کی صدارت فرما رہے ہیں اور فقہ اسلامی کی تحقیق وتدوین ہو رہی ہے، یا جس طرح ہمیں تاریخ بتاتی ہے، کہ بغداد کی چڑھائی کے وقت شیخ شہاب الدین سہروردی ملک وملت کو اس خونریزی وتباہی سے بچانے کے لئے بیتابانہ جدوجہد کرتے پھرتے ہیں، یا بغداد کی تباہی اور انقراض خلافت پر شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی اپنے گوشۂ عزلت سے بے اختیار نکل پڑتے ہیں اور آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں کہ ؎

آسماں راحق بود گر خوں ببارد بر زمیں
بر زوال ملک مستعصم امیر المومنیں

اسی طرح سید مرحوم بھی اپنے بزرگان صوفیہ کے نقش قدم پر کبھی پونا کالج میں لکچر دیتے نظر آتے ہیں، کبھی دارالعلوم ندوۃ العلماء کے معتمد تعلیمات، رہبر ورہنما اور دارالمصنفین کی مجلس تحقیق وتدوین میں میر مجلس دکھائی دیتے ہیں جب خلافت عثمانیہ پر نازک وقت آپڑتا ہے اور تباہی وبربادی کے طوفان اٹھنے لگتے ہیں تو وہ شیخ شہاب الدین سہروردی بن جاتے ہیں،

اور ہندوستان سے لندن اور یورپ تک کا دورہ کرتے پھرتے ہیں، خلافت اسلامیہ کو جانکنی کے عالم میں دیکھتے ہیں تو تڑپ اُٹھتے ہیں، اور شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی کی طرح بے اختیار ہو جاتے ہیں۔ خلافت اسلامیہ پر اُس عہد میں جو کتاب سید مرحوم کے قلم سے نکلی تھی وہ گویا سعدی کے اسی لخت دل کی تفسیر تھی، کہ آسماں راحق بود گر خوں ببارد بر زمیں۔

میں بیمار ہوں، ناتواں ہوں، بستر علالت پر پڑا رہتا ہوں، اگر صحت و توانائی ہوتی، تو پھر تفصیل سے بتاتا کہ سید مرحوم کیا تھے، اور کس مرتبہ و مقام کے حامل تھے۔ مختصر یہ ہے کہ والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا کا فرمان الٰہی پیش نظر تھا، اور وہ سرتاپا مصروف مجاہدہ تھے، ان کی خلوت بھی مجاہدہ تھی، اور جلوت بھی مجاہدہ تھی، کہیں علم الیقین کا جلوہ تھا تو کہیں عین الیقین کا۔ اور کہیں حق الیقین کا۔ ان کی ساری زندگی، ان ہی منازل و مقامات کی سیر و سلوک میں تمام ہوئی۔ اور بالآخر یہ سفر تمام کر کے وہ اپنی منزل مقصود پر پہنچ گئے، یعنی

دریا سے یہ موتی نکلا تھا دریا ہی میں جا کر ڈوب گیا

اب سے کوئی تیس سال پہلے سید مرحوم نے ایک بار مجھ سے فرمایا کہ "جو صوفیہ سماع سے پرہیز کرتے ہیں ان کو ذوق و وجد سے عاری نہ سمجھو، ان کو نماز میں جو حلاوت و وجدان حاصل ہوتا ہے اس کو تمہاری مجالس سماع نہیں پا سکتیں"۔ اب عمر کے تیس سال اور گزر جانے اور ضعیفی کے دائرے میں پہنچ جانے کے بعد نماز میں کبھی کسی وقت حلاوت و ذوق کی نعمت نصیب ہو جاتی ہے تو میں خود اپنے آپ سے پوچھتا ہوں کہ نماز کو چھوڑ کر سماع سے کیوں ذوق حاصل کیا جائے، اوران لمبے لمبے اوراد و وظائف کی تعداد و مقدار کو کیوں نہیں مختصر کر کے قرۃ عینی فی الصلوٰۃ کو سمجھنے اور محسوس کرنے کی کوشش کی جائے۔ جب میں ان باتوں کو سوچنے لگتا ہوں تو علامۂ مرحوم کا یہ قول یاد آجاتا ہے، اور میں محسوس کرنے لگتا ہوں کہ اب سے تیس [30] برس پہلے ہی جبکہ میں ان کو ایک خشک ملا سمجھتا تھا در اصل وہ صاحب ذوق و وجدان صوفی ہو چکے تھے، اور مجھ سے جو کچھ ارشاد فرما رہے تھے وہ ان کی اپنی آپ بیتی تھی۔

حضرت قبلہ والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کی وفات پر ۱۹ اگست ۱۹۳۵ء کو انہوں نے یہ محبت بھرا خط لکھا تھا۔

"برادر عزیز گرامی۔ السلام علیکم۔ آپ کا محبت نامہ ملا۔ آپ کی پرخلوص یادگار کا میرے دل پر بڑا اثر ہوا۔ خدا ہم دونوں کو یہ قوت اور سعادت بخشے کہ قدیم روابط کو تاحیات بہ احسن وجوہ نباہ دیں۔ میرے لیے یہ سکون و طمانینت کا باعث ہوا کہ آپ نے میرے تعزیت نامہ کو اس طرح تحسین کے ساتھ قبول کیا۔

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو مجھ ذرۂ بے مقدار کے ساتھ جو شفقت تھی وہ مجھے ہمیشہ یاد رہی۔ ابھی مجھے کئی واقعے اور لکھنے تھے مگر طول بیان کے ڈر سے میں نے قلم روک لیا۔ بنارس کے جلسۂ ندوہ میں شاہ صاحب نے مولانا شبلی کی تحریک پر اپنی عبا بطور استحسان و انعام دینا منظور فرمایا تھا۔ میں ہمیشہ اس کا تقاضا کرتا، اور اس تقاضے میں اب بھی اور اس عمر میں بھی مجھے کیا لطف آتا تھا۔

ایک مرتبہ میں نے جب ہنوز عمر کی پختگی اور عقل کی تکمیل نہیں ہوئی تھی، ایک عریضہ لکھا، اس میں جدید انشا پردازی کی پیروی میں السلام علیکم نہیں لکھا تھا، اس پر ان کی بزرگانہ ڈانٹ مجھے اب تک یاد ہے"۔ ..... دوسرا خط بھی پڑھ لیجئے اپنی بیٹی اہلیہ کی وفات کے بعد انہوں نے لکھا تھا "پھلواری شریف اسی بے چینی میں حاضر ہوا تھا لیکن آپ لوگوں سے ملاقات نہ ہو سکی۔ بھائی میری مصیبت کا احساس آپکا خاندان اچھی طرح کر سکتا ہے پھلواری کو دیکھ کر اس دفعہ حسرت برستی کہ جن دوستوں سے یہ چمن آباد تھا وہ کیسے چمن گئے۔ حضرت قبلہ کی خدمت میں سلام نیاز فرما دیجئے اور مرحومہ کے لیے دعائے خیر کی استدعا کیجئے۔ میں بڑی مصیبت میں ہوں۔ فرّج اللہ عنّا ذا الاسف"۔ یہ خط [illegible] کا ہے رحمۃ اللہ

سید سلیمان مسندِ قضا پر!

(ارشد تھانوی)

ہندوستان میں مسلمان فرمانروا اوّل کی ریاستوں پر دھاندلی سے قبضہ کرنے کے بعد بھارت کی لادینی جمہوریت کا ادعا کرنے والی ہندو نواز حکومت نے وہاں کے مسلم اداروں کو جس متعصبانہ سختی کے ساتھ ختم کیا ہے، اور اس کے عمال شعائر اسلامی کے ضیاع میں سرگرم ہیں۔ اُس کی مثال اندلس کے مسلمانوں کی تاریخ استیصال میں بھی شاذ و نادر ہی ملے گی۔

میں آغاز ۱۹۰۵ء سے اختتام ۱۹۵۰ء تک ریاست بھوپال میں رہا۔ ملازمت اختیار کرکے مختلف ذمہ دارانہ عہدوں پر شہر و مفصلات میں کام کیا۔ ۲۲ برس سرکاری سروس میں رہنے کے بعد تقریباً ۱۸-۱۹ سال ہائی کورٹ میں وکالت کی، وہاں مسلمانوں کے ان تمدنی، معاشرتی مسائل کے تصفیہ کے لئے مذہبی حدود میں آتے تھے محکمہ قضا قائم تھا۔ اور ہندوؤں کے مسائل طے کرنے کے واسطے دھرم شاستری کا عہدہ، مجھے بحیثیت وکیل کے دھرم شاستری صاحب کے یہاں تو کام کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ کبھی ہندو خاندان کے مقدمہ میں ان سے پیوستہ یعنی ہندو مذہب کا فتویٰ ضرور لینا پڑا، جو فریقین مقدمہ ہی خود حاصل کرلیتے تھے، مگر محکمہ قضا میں زن و شو کے نزاعات میں بیشتر وکالت کی، محکمۂ قضا کا وقار بہت تھا اور قاضی ریاست کو قانوناً وہی درجہ حاصل تھا جو ہائیکورٹ کے جج کا ہوتا ہے۔ وہ اور بہت سے معاملات کے نکاح طلاق، خلع اور زوجین کے تمام تر تنازعات کا تصفیہ و تکمیل محکمہ قضا ہی سے ہوتی تھی؛ اور اس کے لئے ضابطہ تحفظ حقوق زوجین کے نام سے ایک ایکٹ بھی نافذ تھا جس میں عصر حاضر کے اسلامی مقتضیات کو ملحوظ رکھ کر فصل خصومات کی شرعی حدود منضبط کی گئی تھیں، اور ہندوستان کے تمام سر برآوردہ علماء کی نمائندگی حاالتفاق سے یہ مجموعہ مرتب ہوا تھا، اور مذاہب اربعہ، حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی پر غور و فکر کے بعد اس کی ایک ایک دفعہ مرتب کی گئی تھی۔ کیونکہ حنفی مذہب میں جو عام طور پر اس برصغیر کے اہل سنت والجماعت میں رائج ہے۔ یہ اجازت دی گئی ہے کہ باقتضائے ضرورت حکم حاکم کے مطابق دوسرے ائمہ حنفی کرام کا مسلک اختیار کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ اس ضابطہ اجراء سے بڑی آسانیاں پیدا ہوگئیں، اور بہت سے ان فتنوں کا انسداد ہوگیا۔ جو مسلم خواتین کی عیرت و آبرو اور زندگی کی تباہی کا باعث تھے۔ فرمانروایان بھوپال نے اس کا بھی لحاظ رکھا کہ ان اہم فرائض کی انجام دہی کیلئے مسند قضا پر وہی علماء متمکن ہوں، جو دینی علوم اور فقہی مسائل میں بصیرت کامل رکھتے ہوں، اور دلوں میں خشیت الٰہی کا جذبہ بھی کارفرما ہو۔ ان ہی منتخب روزگار علماء میں علامہ سید سلیمان ندوی بھی تھے، جو گذشتہ ماہ کراچی میں وفات پاگئے۔

اس غمناک واقعہ پر ایک عزیز از جان مدیر رسالہ نے اپنے ترقی پسند ماہنامہ کیلئے مجھے بھی کچھ تحریری آگاہیاں حاصل کرکے شریک اشاعت کیں تو میں نے لکھا تھا کہ علامہ سید سلیمان ندوی نہ صرف ایک بلند پایہ مصنف اور دنیائے اسلام کے ایک وسیع النظر عالم تھے، بلکہ ان کی ذات گرامی علمی زندگی میں اور بہت سی خصوصیات کی حامل تھی۔ منجملہ ان کے فقہی مسائل میں صحیح نتائج کا استخراج اور مقتضیات حاضرہ کے مطابق ان کا جرأت مندانہ نفاذ بھی ان کا بڑا وصف تھا۔ اس کا اندازہ مجھے اس زمانہ میں ہوا، جب وہ ریاست کے صدر دارالقضا مقرر ہوئے۔ ان کے اجلاس پر بحیثیت وکیل کے مجھے اکثر حاضر ہونا پڑا، سید صاحب بڑے ٹھنڈے دل سے وکلاء کے دلائل سنتے اور قانونی موشگافیوں پر توجہ دیتے تھے، مگر درمیان میں ایسے ایسے سوال ہلکے انداز میں کرتے جاتے تھے، جو پرجوش فریق کے استدلالات کی راہ میں سنگ آمد و سخت آمد کی حرارت پیدا کر دیتے تھے؛ سماعت مقدمات کے سلسلے میں قاضی ریاست کو ضابطہ دیوانی اور ضابطہ فوجداری کے ضروری اختیارات دیدیئے

گئے تھے۔ جن کو سید سلیمان صاحب ہمیشہ ان حدود تک استعمال فرماتے تھے، جو ایک محتاط قاضی شرع برت سکتا ہے۔ انھوں نے کبھی اجرائے وارنٹ یا کسی شخص کی گرفتاری کی نوبت نہیں آنے دی۔ بایں ہمہ کسی فریق کو حصول انصاف میں کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئی۔ اور پیچیدہ سے پیچیدہ معاملات میں بہت آسانی کے ساتھ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیتے تھے۔ اور کبھی کسی ناکام فریق نے یہ شکایت نہیں کی کہ وہ بے انصافی کا شکار ہو گیا۔ مجلس العلماء میں اُن کا اپیل ہو سکتا ہے۔ مگر میرے علم میں کبھی اس کی نوبت نہیں آئی۔ اور نہ کبھی ان کا فیصلہ منسوخ ہوا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوا کہ انھیں کے اجلاس پر نظر ثانی کی درخواست پیش ہو کر معاملہ اور تبین گیا۔ کئی برس تک سید صاحب مسند قضا پر متمکن رہے) اور انقلاب حکومت کے بعد مستقل طور سے پاکستان تشریف لے آئے۔

دو چیز آدمی را کشد بہ زور
یکے آب و دانہ دگر خاک گور

ان کا حادثہ وفات قطعی غیر متوقع ہے۔ ابھی عمر کچھ ایسی زیادہ نہ تھی۔ اور پاکستان میں ان کی علمی وادبی و مذہبی صلاحیتوں سے فائدہ حاصل کرنے کا وقت آ رہا تھا۔ اسلامی دستور بننے کے بعد اگر کوئی اعلیٰ شرعی عدالت یہاں قائم ہو گئی، اس وقت علامہ مرحوم کی ذات و صفات کی اہمیت کا اندازہ ہو گا۔ ایک دفعہ بہت ہی الجھا ہوا مقدمہ ان کے اجلاس پر پیش تھا۔ اور سابق قاضی صاحب کے زمانہ سے مثل مرتب ہوتے ہوتے اتنی ضخیم ہو گئی تھی کہ اسکو پڑھنے کے لیے کئی ہفتوں کی ضرورت ہوتی۔ فریقین کے وکلا اور تھے۔ میں کسی دوسری ضرورت سے بیٹھا ہوا تھا۔ مثل پیش ہوئی۔ سید صاحب نے پیشکار سے کہا، عرضی دعویٰ نکالیے۔ اُسے پڑھا۔ جواب دعویٰ نکلوا کر دیکھا۔ ہر دو فریق سے چند سوالات کر کے جواب میں تتمہ بیان قلمبند کیا۔ اور یہ کہکر کہ اس صورت میں شہادتوں کی ضرورت نہیں، ایک صفحہ کا فیصلہ لکھ کر سنا دیا۔ عجیب بات یہ ہے کہ فیصلہ سنکر فریقین آپس میں صاف ہو گئے۔ اور ساتھ ساتھ مسکراتے ہوئے باہر چلے گئے۔ میں نے سید صاحب سے کہا، اس صنعت کا نام فن شعر میں "سہل ممتنع" ہے۔ مسکرا کر فرمایا، کبھی کبھی شعر بھی تو کہتا ہوں۔

میری اُن کی پہلی ملاقات بھی ایک مخصوص مشاعرہ میں ہوئی تھی، یہ ۱۹۴۶ء کا ذکر ہے جب سید صاحب مغفور بھوپال کے قاضی القضاۃ مقرر ہو کر آئے۔ اور ذاتی زندگی میں، وہاں کے علماء، ادباء، شعراء اور ارباب ذوق سے ربط پیدا کیا۔ ماہنامہ افکار کے نوجوان مدیران صہبا و رشدی نے حکیم قمر الحسن اڈیٹر روزنامہ ندیم کے مکان پر جہاں افکار تھا ایک شعری اجتماع کیا، جس میں گنے چنے ارباب سخن مدعو کئے گئے، اذن عام مطلق نہ تھا۔ میں نے پہلی مرتبہ وہاں علامہ موصوف اور سید نواب علی بنشنر وزیر معارف جونا گڈھ کو مصروف تکلم دیکھا صہبا صاحب نے مجھے ہر دو اصحاب سے متعارف کرایا۔ اور دونوں محترمین نے ازراہ خلوص مجھے اپنے وسط میں بٹھالیا میں نے نواب علی صاحب سے عرض کیا کہ آپ سے غائبانہ تعارف اس وقت سے ہے جب آپ کی یہ غزل آگرہ کے ماہنامہ نقاد میں نکلی تھی

حسن کب شیفتہ لذت اظہار نہ تھا
شعلۂ طور نہ تھا، گرمیٔ بازار نہ تھا

فرمانے لگے ۲۵ - ۳۰ برس پہلے کی بات ہے آپنے یاد دلا دی، میرے حافظہ میں اب اس کا کوئی شعر محفوظ نہیں، سید سلیمان صاحب نے فرمایا۔ آپ کے یاد رکھنے کو اور باتیں کیا کم ہیں۔ میں نے عرض کیا، مولانا شعری ذوق تو آپ کا بھی بہت سلجھا ہوا ہے۔ رسالہ معارف کا حصہ نظم بہت معیاری ہوتا ہے۔ آپ تو ایسا نہ فرمائیں، مسکرا کر بولے، میں شاعر نہیں ہوں۔ اس لیئے میرے کہنے کا آپ بُرا نہ مانیں۔ میں نے کہا: جناب والا شاعر تو آپ ضرور ہیں، اسی صحبت شعر میں آپ کو زحمت دی جائے گی، پہلے سے دفع دخل نہ فرمائیے۔ صہبا و رشدی نے بھی میری تائید کی اور نتیجہ میں اختتام مشاعرہ کے قریب علامہ کو سنانا ہی پڑا، مگر وہ نظم کچھ نیم مذہبی سی تھی مجھ سے فرمایا کہ میں جب

حکیم الامت (مولانا اشرف علی رحمۃ اللہ علیہ) کی خدمت میں تھانہ بھون گیا تھا۔ اس وقت وہاں کی روحانی فضا سے متاثر ہو کر یہ نظم لکھی تھی۔

سید صاحب مولانا تھانوی کو پیر مرشد کہتے تھے۔ مجھے ٹھیک معلوم نہیں، آیا بیعت ہو چکے تھے۔ مگر بھوپال میں حضرت مولانا تھانوی کے ایک خلیفہ رہتے تھے، مولوی مظہر (احمد ادہمی) بی۔ اے وہ میرے بھی دوست اور ہم وطن تھے۔ سید صاحب ان سے بہت خلا ملا رکھتے تھے۔ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ ضرور مرید ہو چکے تھے۔

میں جب کراچی میں آکر سید صاحب سے بلا تولیت کرتے۔ جس کو ان کی عالمانہ حیثیت کے اعتبار سے معانقہ کہنا چاہیے۔ میں یہاں ریڈیو اسٹیشن سے متعلق ہو کر فکر روزی میں سر کھپاتا ہوں۔

ایک روز میرے عزیز دوست فضل صدیقی جو "نونہال سیکشن" کے انچارج ہیں، کہنے لگے، کیا یہ ممکن ہے کہ حضرت سید سلیمان ندوی نونہالان پاکستان کے لئے براڈ کاسٹنگ ہاؤس تشریف لا کر دعا فرما دیں؟ میں نے کہا، استمزاج کر لوں گا۔ کہنے لگے، نہیں، آمادہ کر لیجیے آپ کی خاطر سے ضرور رضامند ہو جائیں گے۔ میں کنٹریکٹ کا سمی فارم لے کر گیا۔ اور یہ استدعا پیش کر دی، فرمانے لگے، میں ریڈیو پر نہیں بولتا۔ لاہور میں تو آپ کے چھوٹے بھائی شوکت تھانوی کی خاطر سے کچھ کہہ آیا تھا۔ اب دوبارہ یہ ہمت نہیں، میں نے اور میں جو شوکت کا بڑا بھائی ہوں، میری خاطر کچھ نہیں، سید صاحب یہ سن کر عادت کے خلاف مسکراہٹ سے زیادہ مسکرائے جو کچھ نہ کچھ ہنسی کی حد تک پہونچ گئی تھی، پھر فرمایا، آپ فارم چھوڑ جائیے کل دستخط کر کے مع دعا کے مسودہ کے آپ کے پاس بھیج دوں گا میں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا، میں خود گھر سے ریڈیو اسٹیشن جاتے ہوئے لے لوں گا، میرا راستہ یہی ہے۔ آپ کہاں بھیجتے پھریں گے دوسرے روز جو گیا۔ تو مزاج کچھ نادرست تھا۔ پھر بھی میری آمد کی اطلاع پا کر بیرونی کمرہ میں آگئے۔ اور کہنے لگے۔ دماغ حاضر نہیں، آپ کی فرمائش پوری کرنا بھی ضروری ہے۔ ریڈیو والوں نے پانچ منٹ کا وقت دعا کے لئے نوٹ کیا ہے، آپ میری طرف سے مسودہ لکھ کر دیدیجیے۔ میں مقررہ دن اس کو پڑھ دوں گا۔ میں نے عرض کیا، مولانا، جو برکت آپ کے الفاظ میں ہوگی، وہ میں کہاں سے لا سکتا ہوں، آپ کے دل سے نکلی ہوئی دعا، وہ دعا ہوگی۔ جس کو سن کر معلوم ہوگا کہ

اجابت از در حق بہر استقبال می آید

بڑے اضمحلال سے فرمایا تو فی الحال ملتوی رکھیے۔ اور میرے نام کے مراسلہ پر افضل صاحب کو کوئی مناسب جواب لکھ دیجیے۔ میں نے آدھی سطر معذرت کی لکھ دی، بمشکل دستخط کیے، یہ تھی میری علامہ سے آخری ملاقات۔ اس کے تھوڑے دنوں بعد میں نے ان کی خبر وفات سنی انا للہ وانا الیہ راجعون

لوگ ان کو ایک بردست عالم دین، مفکر، مدبر، مصنف، مؤلف، واعظ، مقرر، شاعر، ادیب اور بہت کچھ جانتے ہیں، لیکن ان کے منصب قضا کی طرف کسی کا دھیان نہیں گیا۔ میں مرحوم و مغفور کی اس حیثیت کو بھی ان سطور کے ذریعہ خراج عقیدت ادا کرتا ہوں

چند مُلاقاتیں

(مولانا شاہ محمد جعفر صاحب ندوی رفیق ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور)

وہ کب پیدا ہوئے؟ کہاں کہاں رہے؟ کیا کیا اور کس کس سے پڑھا؟ کیا کیا علمی اور قومی خدمات ہیں؟ کب وفات ہوئی؟ اور ان کی وفات سے عالم اسلام کتنی اہم شخصیت سے محروم ہوگیا؟ مجھے سر دست ان سوالات سے بحث نہیں۔ یہ تمام باتیں کسی مختصر مضمون میں سما بھی نہیں سکتیں۔ ان کی زندگی ابتدا سے انتہا تک بے شمار اہم واقعات وسوانح اور خدمات کا مجموعہ رہی ہے جنکا احاطہ کسی طویل مضمون یا مستقل کتاب ہی کی صورت میں ہو سکتا ہے اور صرف اسی صورت میں اس کا حق بھی ادا ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ان باتوں کی کچھ جھلک آپ کو زیر نظر نمبر کے "سماہیا صنف" میں جا بجا ملیں گی۔ مجھے اس وقت چند ملاقاتوں کا ذکر کرنا ہے۔ ان ملاقاتوں میں خصوصیت پیدا ہونے کی کئی وجوہ ہیں

(۱) علامہ سید سلیمانؒ ندویؒ تھے اور میں بھی "ندوی" ہوں۔

(۲) میرے والد ماجد مولانا شاہ سلیمان پھلواروی اور ان کے والد ماجد مولانا شاہ ابوالحسن دیسنوی "پیر بھائی" تھے اور دونوں میں بڑے گہرے مراسم تھے۔

(۳) علامہ موصوف کی ابتدائی تعلیمی زندگی پھلواری شریف میں گذری ہے

(۴) علامہ موصوف اور میرے سب سے بڑے بھائی مولانا شاہ حسن میاں مرحوم بچپن کے ساتھی، دوست اور ہمدرس تھے، پھلواری میں بھی اور ندوہ میں بھی جبکہ ندوہ گولہ گنج لکھنؤ میں تھا۔

(۵) علامہ موصوف نے کچھ اسباق میرے والد ماجد سے اور کچھ میرے خالہ زاد بزرگ بھائی مولانا شاہ محی الدین قادریؒ سے پڑھے ہیں۔

(۶) عموماً جب کبھی علامہ موصوف کو حوالۂ کتب کی ضرورت پڑتی تھی یا یہ دریافت کرنا ہوتا تھا کہ فلاں مسئلہ کس کس عہد میں زیر بحث آیا اور اس کے ماخذ کیا کیا ہیں، یا کسی مسئلہ پر کسی مخصوص نقطۂ نظر کی تفصیل مطلوب ہوتی تو وہ حضرت قبلہ والد ماجدؒ کے پاس تشریف لایا کرتے تھے یا خط لکھا کرتے تھے۔ ایسی کئی بیش بہا صحبتوں میں مجھے خود بھی شرکت کرنے اور واسطہ بننے کا اتفاق ہوا ہے۔

(۷) پھر ایک شرف مجھے یہ بھی حاصل ہے کہ بعض اساتذہ سے ہم دونوں نے پڑھا ہے،

غرض بہت سی خصوصیات میں سے یہ چند ہیں جن کی وجہ سے علامہ موصوف مجھ پر خصوصی شفقت فرماتے تھے اور ان ہی وجوہ سے میری ملاقاتیں بھی کچھ خصوصیت رکھتی ہیں۔



ندوے میں آتے ہوئے مجھے غالباً تیسرا سال تھا۔ میں اور علامہ ممدوح ندوے سے ایک تانگے پر نواب سید علی حسن خاں مرحوم کی کوٹھی (بھوپال ہاؤس) جا رہے تھے۔ راستے میں ادھر ادھر کی بہت سی باتیں ہوتی رہیں۔ اثنائے گفتگو میں انہوں نے پوچھا،

"آپ کو شعر وسخن سے بھی، سنا ہے، ذوق ہے"

"بہت تھوڑا"

"کچھ سنائیے"

"عربی کے دو تازہ شعر بہ نظر اصلاح حاضر ہیں عشرت لکھنوی کا ایک شعر ہے ؎

حکما کہتے ہیں ہوتی ہے غذا جزو بدن
ہم تو تحلیل ہوئے جاتے ہیں غم کھانے سے

میں نے اس شعر کو "عربیایا" ہے۔"

"کیا عربیایا ہے؟ ذرا سنائیے"

"عرض ہے"

لاشك في كذب الاطبة انهم — قالوا الغذاء مضاعف لجسومهم
لكنني في كل آنٍ ذائبٌ — بغذاء حزنٍ موجعٍ وغموم

"طبیب کی جمع اطباء تو آتی ہے، کیا اطبۃ بھی ہے؟"

"جی ہاں"

"محض قیاساً کہہ رہے ہیں یا۔۔۔"

"ہر عربی لغت میں موجود ہے"

دوسری بیت کے پہلے مصرعے میں کوئی عروضی سقم بھی تھا اور ایک ضرورت شعری پر بھی عمل کیا گیا تھا۔ میرا اصل مصرعہ کیا تھا اس وقت یاد نہیں صرف ممدوح کا اصلاح کردہ مصرعہ یاد رہ گیا جو یہاں درج کر دیا ہے۔

ضرورت شعری کے متعلق جواز کو تسلیم کرتے ہوئے انہوں نے ایک خدا لگتی بات کہی کہ "ضرورت شعری پر عمل کرنا جواز کے دائرے میں تو آتا ہے لیکن ہے بہر حال ایک کمزوری۔ اس لئے اس سے حتی الامکان بچنا ہی بہتر ہے۔" اور انہوں نے مصرعہ یوں بتا دیا
یہ مصرعہ انہیں کا عطیہ ہے



غالباً ۱۹۲۴ء میں ندوۃ العلماء کا سالانہ اجلاس۔ جو ترک موالات کے ہنگاموں میں کئی سال سے دبا ہوا تھا۔ لکھنؤ میں زیر صدارت مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی ہونا قرار پایا۔ اس موقع پر چند طلبا کو بھی تقریروں کے لئے منتخب کیا گیا۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے مجھ سے پوچھا،

"کیا آپ بھی اس موقع پر تقریر کریں گے؟"

"ہاں اگر موضوع اور زبان پہلے سے بتا دیں"

"زبان؟"

"یعنی اردو میں تقریر ہوگی یا عربی میں یا فارسی میں یا انگریزی میں؟"

میری اس جرأت رندانہ کو انہوں نے قدرے تعجب اور مسرت سے دیکھتے ہوئے فرمایا "انگریزی میں"

"موضوع کیا ہوگا؟"

"ضرورت رسالت"

یہ تقریر میں نے لکھ کر پڑھی تھی۔ چند دنوں پہلے آکر سید صاحب نے اس کا "ریہرسل" بھی کرایا اور کچھ ترمیمات بھی فرمائیں۔

اس عظیم الشان اجلاس میں میرا حلیہ بھی دیکھنے کے قابل تھا۔ سر پر عربی عمامہ، بدن پر عراقی چوغا، کمر میں پٹکا۔ غرض دور سے ہر دیکھنے والا

عرب سمجھے۔ اور تقریر انگریزی میں ہو رہی تھی۔ اس تقریر کی سب سے زیادہ داد شفاء الملک حکیم عبد الحمید صاحب لکھنوی نے دی۔ مجھے اب تک معلوم نہ ہو سکا کہ انہوں نے یہ داد کس چیز کی دی تھی؟ میری ایکٹنگ کی؟ یا تقریر کی؟

اس کے بعد ہی اینٹی نجدی تحریک زور شور سے شروع ہوئی۔ سید صاحب اس وقت نجدیوں کے حامی تھے اور میری یہ کیفیت تھی کہ معقولیت اور غیر معقولیت پر غور کرنے سے پہلے میں یہ دیکھا کرتا تھا کہ فلاں بات نجدیوں کے خلاف جاتی ہے یا نہیں؟ اگر جاتی ہے تو اس کا ساتھ دینا "تصوف" کی ایک خدمت ہے۔ اس وقت جو مسائل اخباروں میں خاص طور پر زیر بحث تھے ان میں بناء علی القبور اور ہدم بناء علی القبور کا مسئلہ خاصی اہمیت کا حامل ہو گیا تھا۔ سید صاحب کے نام سے ایک مضمون چھپا جس میں لکھا تھا کہ ———————————————

——————— "بناء علی القبور پانچویں صدی ہجری کی ایجاد ہے" اور اسی مضمون میں ایک جگہ کتاب الاُم (للامام الشافعی) کی یہ عبارت بھی درج تھی "وقد رأیتُ من الولاۃ من یھدم بمکۃ ما یُبنٰی فیھا ولم ار الفقہاء یعیبون ذلک" یعنی میں نے بعض حکام کو مکے میں بناء علی القبور کو منہدم کرتے دیکھا ہے اور فقہاء کو اس پر نکیر و نکتہ چینی کرتے نہیں دیکھا۔

اب تو خیر میرے نزدیک یہ کوئی اہم مسئلہ ہی نہیں لیکن اس وقت نجدیوں کی مخالفت کا بھوت سوار تھا۔ اتفاق سے نواب سید علی حسن خاں صاحب کی کوٹھی پر سید صاحب سے ملاقات ہو گئی اور ان کے مضمون کا ذکر نواب صاحب نے چھیڑ دیا۔ میں نے سید صاحب سے نہایت مودبانہ لہجے میں عرض کیا کہ:

"اس مضمون میں دو باتیں نظر ثانی کی محتاج ہیں، پہلی تو یہ ہے کہ بناء علی القبور پانچویں صدی ہجری کا ایجاد ہے مگر دلیل میں دوسری صدی ہجری کا (بزبان) امام شافعی درج ہو گیا ہے کہ مکے میں بعض حکام بناء علی القبور کو توڑتے رہے اور کسی فقیہ نے اس (فعل) پر نکتہ چینی نہ کی۔ دوسری بات یہ کہ یہ عبارت کتاب الاُم کی پوری عبارت نہیں ہے بلکہ اس کا ایک ٹکڑا ہے جو نووی نے نقل کیا ہے۔"

انہوں نے فرمایا کہ میں نے تو کتاب الاُم ہی سے عبارت نقل کی تھی۔ میں نے عرض کیا کہ وہ عبارت پوری نہیں ہے۔ چنانچہ میں نواب صاحب کے کتب خانے سے کتاب الاُم نکال لایا جس میں اس عبارت کے آگے یہ عبارت تھی:

"فان کان البناء فی ارض یملکھا الموتیٰ فی حیاتھم او ورثتھم بعدھم فلا یھدم شیٔ منھا ان یبنیٰ"

یعنی اگر میت یا اس کے وارثوں کی زمین پر وہ بناء ہو تو اسے بالکل منہدم نہیں کیا جائیگا" یہ عبارت سننے کے بعد نواب صاحب نے کتاب ہاتھ میں لیکر یہ عبارت بغور دیکھی۔ اور سید صاحب نے بھی دیکھی مگر مسکرائے اور پھر اپنے مخصوص حوصلہ افزا انداز میں مجھ پر کئی صرفی و نحوی جرحیں بھی کیں۔ اور پھر دیر تک اس موضوع پر بہت ہی دلچسپ قسم کی باتیں ہوتی رہیں۔

اس پورے واقعے میں جو چیز ذکر کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کتاب کی عبارت میں یا کسی مسئلہ کی نوعیت میں کوئی قابل توجہ پہلو نکال دیتا تھا یا اس کا کوئی دوسرا رخ نمایاں کر دیتا تھا تو سید صاحب کی طبیعت کچھ اور شگفتہ ہو جاتی تھی، اور اختلاف رائے کے معاملے میں تو وہ بیحد وسیع الخیال تھے۔ اختلاف رائے کی بنیاد اگر فکر و فہم اور دلائل و براہین پر ہو تو وہ ہر اختلاف کو بڑی توجہ کے ساتھ سنتے تھے۔ اور اکثر فرمایا کرتے تھے کہ سیاسیات و قومیات یا بعض مسائل میں راہیں مختلف ہو سکتی ہیں مگر ذاتی تعلقات علیٰ حالہا قائم رہ سکتے ہیں۔

اسی سلسلے میں مولانا عبد السلام ندوی نے بھی ایک مضمون لکھا تھا جس میں طبقات ابن سعد کے حوالے سے یہ واقعہ لکھا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے شجرۃ الرضوان کی تعظیم و تکریم کرتے لوگوں کو دیکھا تو اس درخت کو کٹوا دیا۔ مجھے یہ روایت بھی اپنے اس وقت کے مسلک کے خلاف معلوم ہوئی اور

میں نے ایک طویل مضمون اس کے رد میں لکھا جس کا مفاد یہ تھا کہ ابن سعد کی روایت کو بخاری کی روایت پر ترجیح نہیں دی جا سکتی۔ بخاری کی روایت میں ہے کہ یہ درخت دوسرے ہی سال غائب ہو گیا تھا اور باوجود تلاش کے لوگوں کو نہ مل سکا۔ ابن جریر کے بیان کے مطابق یا تو سیلاب میں بہہ گیا تھا یا کسی وجہ سے اوجھل ہو گیا۔ لوگوں نے ایک دوسرے درخت کو شجرۃ الرضوان سمجھ کر اس کی تعظیم و تکریم شروع کر دی تھی اور حضرت عمر نے عرصۂ دراز کے بعد اسی کو کٹوایا تھا۔ اس پر میں نے اتنے شواہد جمع کیے کہ حقیقت نکھر کر سامنے آ گئی۔ اس مقالے کو ایک الگ کتاب کی صورت میں بھی شائع کیا اور "غریب نواز" (پھلواری شریف) اور "سچ" (لکھنؤ) نے بھی اسے شائع کیا اور کتنے دوسرے اخبارات نے بھی اس کی اشاعت کی۔

علامہ سید سلیمان ندوی سے جب ندوہ میں ملاقات ہوئی تو انہوں نے فرمایا کہ "آپ کی تحقیق درست ہے مگر اس کی جو لِم ہے اس میں تو ہم آپ دونوں ہی متفق ہیں۔ وہ درخت جعلی ہو یا اصلی، اس سے بحث نہیں۔ دیکھنا تو یہ ہے کہ حضرت عمر نے ایک غلط قسم کے غلوئے تعظیم کو رد کا تھا۔ اسی تعظیم و تکریم خواہ اصلی درخت کی ہو یا جعلی کی، اس میں کچھ زیادہ فرق نہیں پڑتا"۔

میں نے عرض کیا کہ "میرا مقصد تو صرف یہ تھا کہ حضرت عمر پر آثار رسول صلعم کو مٹانے کا الزام صحیح نہیں۔ اگر اُن کو اس درخت کے اصلی ہونے کا یقین ہوتا تو وہ اس یادگار کو مٹانے کی بجائے صرف غلوئے تعظیم کو رد کرتے۔ کہنے لگے کہ ہاں اس نقطۂ نظر سے تو ہمیں بھی کچھ زیادہ اختلاف نہیں"۔



ممدوح کے کراچی تشریف لانے کے چند ہی دنوں بعد مجھے بھی کراچی جانے کا اتفاق ہوا۔ ان کی خدمت میں بھی حاضری دی۔ یہ ملاقات اچانک اور بہت عرصے کے بعد ہوئی تھی اس لئے وہ مجھے پہچان نہ سکے۔ تعارف کے بعد تپاک سے ملے۔ اس دن یوم آزادی منایا جا رہا تھا اور بالائی منزل سے ریڈیو میں مرحوم لیاقت علی خاں کی تقریر پوری گرج کے ساتھ ہو رہی تھی۔ قریب بہ مغرب تقریر ختم ہوئی اور نماز کے لئے کمرے کے اندر صفیں بچھائی گئیں۔ کچھ لوگ پہلے سے موجود تھے اور کچھ میرے ساتھ گئے تھے۔ سب کے ساتھ میں بھی کھڑا ہو گیا، تو علامہ موصوف نے فرمایا "آپ قرآن بہت اچھا پڑھتے ہیں نماز پڑھائیے"۔ میں نے عرض کیا "حضرت یہ میرا منصب نہیں کہ آپ کی موجودگی میں، میں امامت کروں" مگر انہوں نے باصرار مجھے آگے بڑھایا۔ میں مصلے پر آگے ہوا تو انہوں نے فوراً فرمایا "ذرا پاجامہ اونچا کر لیجئے"۔ میں نے تعمیل ارشاد کی اور نماز پڑھا کر فارغ ہوا اور سب لوگ ایک دوسرے کمرے میں بیٹھ گئے۔ سید صاحب نے ایک تبسم کے ساتھ فرمایا "آپ کو پھلواری کے کچھ تبرکات دکھاؤں؟"۔ میں نے بھی مسکرا کر کہا "وہاں کا ایک تبرک تو میں خود ہی ہوں لیکن آپ کے پاس جو تبرک ہوگا وہ بہر حال مجھ سے بہتر ہوگا"۔

انہوں نے سامنے کی الماری میں سے ایک چھوٹا سا بکس نکلوایا اور اس میں چند خطوط نکال کر مجھے دکھائے۔ یہ خطوط میرے نانا حضرت مولانا شاہ علی حبیب نصر پھلواریؒ کے ہاتھ کے لکھے ہوئے تھے اور سب علامہ موصوف کے والد محترم مولانا حکیم سید ابوالحسن صاحبؒ کے نام تھے تخاطب بہت ہی مشفقانہ انداز کا تھا۔ اور ان خطوط میں بہت سی باتیں تھیں زیادہ تر مضامین تعلیم تصوف اور اوراد و وظائف پر مشتمل تھے۔

اس کے بعد وہ دیر تک کچھ تصوف اور کچھ فقہ پر باتیں کرتے رہے، اسی دوران میں میں نے پوچھا:

"آپ نے کراچی میں رہ جانے کا مستقل ارادہ کر لیا؟"

"ابھی تک سوچ رہا ہوں"

"یوں تو آپ اپنے معاملات کو زیادہ بہتر سمجھ سکتے ہیں لیکن میری ناقص رائے ہے کہ آپ یہیں رہ جائیے۔ ضرورت ہندوستان میں بھی آپ کی ضرور ہوگی لیکن میرا خیال ہے کہ آپ وہاں کی بہ نسبت یہاں کے اہل اسلام کے لئے زیادہ مفید ہو سکیں گے"

اس پر وہ کچھ دیر خاموش رہے اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ وہ اس وقت ایک شدید کشمکش میں مبتلا ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں ہی جگہوں کی کشش انہیں اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔ دونوں کے اندر انہیں کچھ روشن اور امید افزا پہلو بھی نظر آ رہے ہیں اور ساتھ ہی دونوں نے تاریک

اور قنوط آمیز رخ بھی دکھائی دے رہے ہیں۔



کچھ دنوں بعد ایک محترم بھائی نے میری اور ان کی ایک پر تکلف دعوت کی اور بھی کئی حضرات موجود تھے۔ یہاں کی گفتگو میں انہوں نے کئی مواقع پر زندہ دلی اور بذلہ سنجی سے بھی کام لیا۔ میں نے کہا کہ دیکھئے اس تقسیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ درائی فروٹس، سردا، انگور، بگوشہ، میٹھا اور مالٹا وغیرہ تو ادھر رہ گیا اور ادھر ملیح آبادی آم، لکھنؤ خربوزے، مظفر پوری لیچی اور حاجی پوری کیلے وغیرہ رہ گئے۔ ممدوح نے فوراً کہا "جی ہاں کٹھل بھی ادھر ہی رہ گیا" (یہ پھل نفاست پسند لوگ نہیں کھایا کرتے)

غرض اس مجلس میں بہت سے لطائف ہوتے رہے۔ موصوف نے اس وقت تک پاکستان میں رہ جانے کا کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔ کراچی سے روانہ ہوتے وقت میں ٹھیک دوپہر کو ان کے ہاں پہونچا اور کہا کہ اتنے عرصے میں میں نے دونوں پہلوؤں پر جہاں تک غور کر سکتا تھا غور کیا ہے بہر صورت مجھے تو یہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ اب یہیں اقامت پذیر ہو جانے کا فیصلہ فرمالیں۔ ہندوستان میں آپ کی جگہ بہت سے لوگ آپ کا کام کرنے کے لئے موجود ہیں۔ میں تو آج لاہور واپس جا رہا ہوں اور یہاں تھوڑی دیر کے لئے صرف اپنا آخری مشورہ پیش کرنے کے لئے حاضر ہو گیا ہوں —— اس کا جواب موصوف نے نہ اثبات میں دیا نہ نفی میں۔ اور میں چلا آیا۔

یہ سینکڑوں ملاقاتوں میں میری اُن کی آخری ملاقات تھی۔ جب وہ لاہور کسی کام سے آئے تو مجھے بہت تلاش کرتے رہے لیکن میں نہ مل سکا کیونکہ ان سے کراچی کی آخری ملاقات کے بعد پھر کوئی ملاقات میرے نصیب میں نہ تھی۔



ان کی زندگی کے پہلے دور اور پچھلے دور کے انداز میں بڑا فرق پیدا ہو گیا تھا۔ آخری دور میں ان پر انکسار کا غلبہ زیادہ ہو گیا تھا۔ اپنے ہاتھ سے اپنے کام کر لیا کرتے تھے۔ لباس و پوشاک میں بھی خاصی سادگی آگئی تھی۔ کم سخنی تو بعض اوقات تکلیف دہ حد تک پہونچ جاتی تھی۔ لیکن جو لوگ ان کو جانتے تھے ان کے لئے یہ کوئی شکایت کی بات نہ تھی۔ میں نے پہلے پہل انہیں اُس وقت دیکھا تھا جب داڑھی بالکل سیاہ تھی۔ پھر کراچی میں دیکھا تو سفید داڑھی اور نورانی چہرہ تھا۔ جسم جتنا پہلے تھا اتنا ہی آخر تک رہا۔ چہرے پر جھریاں نہیں آئی تھیں۔ آخری بار جب میں دوپہر کے وقت پہونچا تھا تو اس وقت تلاوت کر رہے تھے۔ ان کا زیادہ تر وظیفہ اب یہی تھا ؎ صد سال می تواں بہ تمنا گریستن



بقیہ بزم ریاض از صفحہ ۵۲ :-

برادر گرامی سلام رحمت

ایک مفصل لفافہ ہوائی ڈاک سے روانہ کر چکا ہوں، مل گیا ہوگا، آج مضمون رجسٹرڈ بھیج رہا ہوں، بڑی جلدی میں رات بھر جاگ کر لکھا ہے، آپ کے لئے اور سید صاحب کی روح کی خوشی کے لئے میرا یہ فرض تھا کہ میں پوری تکلیف اٹھاؤں، سو میں نے کیا، الفاظ کہیں چھوٹ چھاٹ گئے ہوں تو انہیں درست کر لیجئے گا، خدا سے دعا ہے، ریاض کا سلیمان نمبر پوری آب تاب کے ساتھ نکلے، اور مقبول ہو، مضمون پہنچ جانے کی رسید سے مطلع کیجئے،

میں پھر خانقاہ سلیمانیہ کی ضرورت سے باہر جا رہا ہوں اور جلد واپس آؤں گا، اللہ تعالیٰ کی ذات سے قوی امید ہے آپ اچھے اور خوش ہوں گے۔ والسلام

سید عز الدین ندوی
پھلواری شریف، پٹنہ

(باقی بر صـ۷۸)

مور و سلیمانؒ

سید عقیل احمد جعفری

مجھے علامہ ندوی رح کی ملاقات اور زیارت کا شرف صرف دو مرتبہ حاصل ہوا، اور یہی میرے اور مرحوم کے تعلقات کی ابتدا و انتہا ہے۔

اب سے کوئی پندرہ برس قبل ایک مرتبہ آپ خیرآباد تشریف لائے تھے، اور رئیس سلمہٗ کے شاگردانہ اور حضرت ریاضؔ مغفور سے بزرگانہ نسبت سے بغیر میری اطلاع خود مجھ سے آکر ملے تھے ——— اس کے بعد ہوتے ہوتے اب بازدید ہوئی تو کب! جب میں سفر ہجرت ختم کر چکا تھا، اور آپ سفر آخرت کر رہے تھے!

چودھری خلیق الزماں صاحب کی دعوت گورنری کے سلسلہ میں مغرب کے وقت بیچ لگزری ہوٹل میں آپ "امام" تھے اور سب مقتدی، اور ان سب مقتدیوں میں ایک میں بھی تھا، خیال تھا کسی دن در دولت پر جاکر زیارت کروں گا لیکن گھر کب پہنچا جب جنازہ گھر سے نکل رہا تھا، ع

جنازہ پر گماں "تخت سلیماں" کا ہوا مجھ کو

ادبی، علمی، اور مذہبی حیثیت سے آپ کا سب سے پہلا اثر میرے قلب پر "معارف" میں سلسلۂ مضامین خلافت عثمانیہ اور دنیائے اسلام" دیکھ کر ہوا، عجیب اتفاق ہے آپ کا پہلا مضمون بھی ترکوں ہی کے متعلق میں نے دیکھا، اور پاکستان میں آکر آپ کی آخری تصنیف (بریدِ فرنگ) بھی ترکوں ہی کے متعلق میری نظر سے گزری۔

جوشؔ ملیح آبادی کے الحادی کلام کی تصحیح کے متعلق میری خدمات کا علامہ دریابادی مدظلہٗ کے بعد جس جوش وخروش سے آپ نے اعتراف کیا ہے، اور جس طرح میری کتاب "جوش و ہوش" کے سلسلہ میں، حضرت موصوف کے "تعارف" کے پہلو بہ پہلو "مقدمہ" لکھا ہے، اسے بجا طور پر میں اپنا حاصل زندگی سمجھتا ہوں، اور "جوش و ہوش" کے ہنوز کتابی صورت نہ اختیار کرنے کے باوجود یہ سوچ کر دل ہی دل میں خوش ہوا، اور مطمئن رہا کرتا ہوں، ع

شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم

اب مذکورہ "جوش و ہوش" کا مقدمہ اور اس مقدمہ کے سلسلے میں چند متبرک مکاتیب، اور ایک نظم بطور نمونۂ اصلاح پیش کر کے میں یہ مختصر تمہید ختم کرتا ہوں، ع

تو خود حدیث مفصل بخواں ازیں مجمل

تقریب

جوشؔ ملیح آبادی کے ملحدانہ کلام کے جواب میں عقیلؔ خیرآبادی نے کچھ نظمیں لکھی ہیں ان سے اس مسلمان شاعر کی قوتِ شعری کے ساتھ ساتھ قوتِ ایمانی بھی ظاہر ہوتی ہے۔

شعر کو تاثیر کی جو قوت ملی ہے، اس کا انکار کون کرسکتا ہے، اسی بنا پر کفر نے ہمیشہ اسی آلہ سے کام نکالنے کی کوشش کی ہے، مگر حق نے بھی اس کے جواب میں اس کارگر آلہ کو استعمال کیا ہے اور اسی سے باطل کا استیصال کیا ہے۔

خود اسلام کے دورِ نبوت میں کافر شاعروں کے جواب میں مسلمان شاعروں نے اس سے کام لیا ہے، اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان فیض ترجمان سے داد، اور روح القدس کی تائید کی بشارت پائی ہے، —— چنانچہ حضرت عبداللہ بن رواحہ رض اور حضرت حسان بن ثابت رض اور دوسرے شاعر صحابہ کرام نے اپنے سحر بیان، اور زور کلام سے جہاد بالسیف کے ساتھ ساتھ کفر کی بیخ کنی کی بڑی بڑی خدمات انجام دی ہیں، —— آج جاہلیت کے اس عہد اور کفروا باحیت کے اس دور میں، باطل نے پھر شاعری کی تاثیر سے عوام کے دلوں کو مسخر کرنا چاہا ہے، ضرورت ہے کہ حق کے حامی آج پھر قلم کو علم کریں اور تیغ زباں کے جوہر دکھائیں۔

اس حیثیت سے جناب عقیل خیر آبادی مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ملحد مذکور کا کلمہ لکلمہ جواب دیکر باطل کے منہ پر وہ طمانچہ مارا ہے جس سے بھری محفل میں اس کی رسوائی ہوئی ہے —— جوش صاحب گو اپنی نظموں میں کہیں تو وطن پرست اور نیشنلسٹ، کہیں اشتراکیت پسند، اور سوشیالسٹ، کہیں قنوطیت اور سرمایہ داری کے دشمن، اور کہیں مزدوروں، اور کسانوں کے حامی معلوم ہوتے ہیں، لیکن دوسرا ہی صفحہ اُلٹئے تو معلوم ہوگا کہ وہ خواہش کے بندے، فواحش کے طلب گار، دولت کے پرستار، سرمایہ کے پجاری، امیروں، اور راجاؤں کے مصاحب، اور پنشن خوار، اور عیش شباب، اور شراب ناب کی تلاش میں تھیٹروں اور سینماؤں کے مالکوں کے زلہ ربا نظر آتے ہیں، اس دو رنگی سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کافر کا کفر بھی ناتمام ہے۔

نے کافر مطلق است نے مسلمانِ تمام

افسوس ان مسلمانوں پر ہے جو ایسے ملحد کو اپنی محفلوں میں بلاتے، اس کا کلام سنتے اور سناتے اور مشاعروں میں اس کے ملحدانہ کلام کی داد دے کر اس کو حوصلہ بڑھاتے ہیں۔

عقیل صاحب ماشاء اللہ شعر و سخن کی گود میں پلے ہیں، ایمان کے نور سے منور ہیں، دین کی غیرت رکھتے ہیں، امید ہے کہ مسلمان نوجوان ان کے اس کلام کو پڑھیں گے اور جہاں کفر کا زہر پھیلتا دیکھیں گے، یہ تریاق پیش کریں گے۔

(۱)

مکرم۔ زادکم اللہ غیرۃ علی الدین۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ آپ کی نظمیں جا بجا سے دیکھیں، قوت شاعری کے ساتھ قوت ایمانی بھی مبارک ہو، اللہ تعالیٰ آپکی ان دونوں قوتوں میں روز بروز اضافہ فرمائے، مجھے (مجموعۂ نظم جوش وہوش کی) ترتیب سے اختلاف ہے۔

سبب یہ ہے کہ اس طرح پوری پوری ملحدانہ نظم کی اشاعت کے بھی آپ ذریعہ بنیں گے، کیا معلوم آپ کے سبب سے کتنے معصوم قلوب آپ کے جواب سے زیادہ اس ملحد کے خیالات سے متاثر ہوں، اس لئے اپنے مجموعہ نظم سے جوش کی نظموں کو نکال دیجئے،

(۲)

مکتوب بالا کی رائے سے مجھے اختلاف تھا، اور اس کی تائید" حجت الاسلام" مدظلہ کے ایک مکتوب سے بھی ہوئی تھی، " جوش کا کلام مقابلہ میں درج کرنا ضروری ہے، بغیر اس کے آپ کے جواب کی وضاحت نہ ہوسکے گی"

میں نے علامہ ندوی کو اپنی رائے پھر لکھی، اس کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

"میں نے اپنی مخلصانہ رائے آپ کی خدمت میں پیش کردی، اس کا ماننا آپ کو ضروری نہیں، آپ اگر اسی میں مصلحت سمجھتے ہیں تو ضرور اپنی رائے پر عمل فرمایئے، مجھے کوئی آزردگی نہ ہوگی، تصنیف اور مصنف دونوں کے لئے بارگاہ الٰہی میں دلی دعا ہے۔"

(۳)

نظم "رحمۃ للعالمین" کی اصلاح،

"آپ کی اجازت سے ہمت پڑی تو چند لفظ پیش ہیں" (سید سلیمان ندوی)

(۱) لا الٰہ کا نشان ہے پیارے — تو مشکل قرآن ہے پیارے

۲ (۲) آڑ میں تیری بولتا ہے کون — کس کا تو ترجمان ہے پیارے

(۳) زندگی دوام کا پیغام — موت کا پاسبان ہے پیارے

(۴) میں نے دیکھا صحیفۂ فطرت — تیری ہی داستان ہے پیارے

۲ (۵) تیرا ہر فقرہ اک حدیث جدید — "وحی" تیری زبان ہی پیارے

(۶) میزباں جس کا لاشریک لہٗ — تو وہ اک میہمان ہے پیارے

۲ (۷) تیرا کہنا کہا اے حبیب خدا — تو خدائی کی جان ہے پیارے

(۸) سدرۃ المنتہیٰ اک حدِّ سفر — اور مدینہ مکان ہے پیارے

اصلاح:- " " تری منزل

(۹) جد جو آدمؑ ہیں اب ہیں ابراہیمؑ — کیا ترا خاندان ہے پیارے

اصلاح:- " تو "

(۱۰) ساغرِ سلسبیل و کوثر دے — تیری مے کی دکان ہے پیارے

(۱۱) آئے گا وقتِ نزع ضرور — یہ بھی اک امتحان ہے پیارے

اصلاح:- " لحد میں ملنے کو "

(۱۲) نام لینا درود پڑھنا ہے — منہ میں جب تک زبان ہے پیارے

اصلاح:- " لیکر

(۱۳) تو محمدؐ، عقیل ہے حسانؓ
وہ ہے تیرا بیان ہے پیارے

سید صاحب سے چند ملاقاتیں

محمد صبغۃ اللہ شہید انصاری فرنگی محلی

حضرت العلامۃ المغفور کو اگر اپنا استاد مجازی لکھنے میں مبالغہ کروں گا تو اس کہنے میں یقیناً بالکل سچا ہوں کہ مرحوم میرے لئے ایک شمع ہدایت، ایک سنگ میل یا ایک اسوۂ حسنہ تھے، اس کی تفصیل و توضیح کے لئے آپ کو ۱۹۰۸ء اور ۱۹۰۹ء کے لکھنؤ کو آنکھوں کے سامنے رکھنا ہوگا، اس زمانہ میں لکھنؤ میں دو تعلیم گاہیں زیادہ قابل ذکر تھیں، ایک مدرسہ نظامیہ فرنگی محل اور دوسرا ندوۃ العلما میں، اول الذکر کا ابتدائی طالبعلم تھا، اور ہمارے مولانا دارالعلوم ندوۃ العلماء کے درجۂ اعلیٰ کے ممتاز اور ایسے ہونہار طالبعلم تھے کہ ان کا ذکر ندوہ کے حلقوں میں اس طرح ہوتا تھا جیسے گلہائے کشمیر میں ایک سب سے زیادہ شامہ نواز اور دلکش پھول کا اس کے باغبانوں میں ذکر ہو، مجھے دو چیزوں نے خصوصیت سے ان کا مشتاق بنا دیا تھا۔

ایک یہ کہ وہ عربی میں بے تکلف تقریر کر لیتے ہیں، عربی میں تقریر تو اس واسطے عجیب تر چیز تھی کہ میں سمجھتا تھا کہ دوسری زبانوں میں تقریر کرنا ان مسلمانوں کا حصہ ہے جو انگریزی اسکولوں میں ابھرتے، کالجوں میں چمکتے، پھر ولایت کی یونیورسٹیوں میں جا کے امتیاز اور فضیلت حاصل کرتے ہیں،

دوسری چیز ان کے عالمانہ مضامین تھے جو گاہے گاہے اُس زمانہ میں "البیان" نامی ایک عربی رسالہ میں نکلتے تھے، جو لکھنؤ سے شائع ہوتا تھا،

مگر سید صاحب کو قریب سے دیکھنے کا اتفاق اُس وقت ہوا، جب ندوۃ العلماء کی نئی عمارت کے سنگ بنیاد رکھنے کی تقریب غالباً ۱۹۱۰ء میں اس مقام پر ہوئی جہاں اب ندوۃ العلماء کی شاندار عمارت مرجع اہل علم ہے، اس اجتماع میں یہ نوجوان عمامہ پوش جماعت طلبائے ندوہ میں بلند اور اعیان ندوۃ العلماء کے لگ بھگ نظر آرہا تھا، اس موقع پر انہوں نے ایک تقریر بھی کی تھی، جو خود خطیب کی طرح متین اور پُر وقار تھی، اس کے بعد "المنار" مصری اخبار کے ایڈیٹر سید رشید رضا کی آمد پر ان کی ایک برجستہ اور بے تکلف عربی تقریر نے مجھے ان سے بہت قریب کر دیا، غالباً اُسی دن مجھے ان سے تعارف حاصل کر کے بہت خوشی ہوئی، اس کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ماہوار میگزین "الندوہ" میں ان کے مضامین مجھے متاثر کرتے رہے، یہاں تک کہ الندوہ خود ان ہی کی ادارت میں شائع ہونے لگا، اور اس میں ان کے عالمانہ شذرات میرے دل میں ان کی عظمت اور محبت بڑھاتے رہے، اور اس کے ساتھ یہ خیال بھی کہ مجھے بھی تقریر کی مشق کرنی اور مضمون نگاری کی دُنیا میں امتیاز حاصل کرنا ہے، اس لئے میرا یہ دعویٰ کہ علامہ مغفور میرے لئے اسوۂ حسنہ تھے اب آپ کے نزدیک بھی ہم عنان حقیقت ہے۔

غالباً میں نے سب سے پہلے ان ہی کے نام کے ساتھ "ندوی" لکھا دیکھا، اور چونکہ وہ میری نگاہ میں عربی طلبہ میں سب سے زیادہ ممتاز تھے، اس لئے سچ یہ ہے میں ان کی وجہ سے ہر ایک شخص کو مستحق عزت سمجھنے لگا تھا جس کے نام کے ساتھ ندوی

ہوتا، ان کے اس احترام کی حد یہ تھی کہ مجھے ان کی عقیدت کی بدولت استاد محترم علامہ شبلی نعمانی المغفور سے ملاقات کا شوق بڑھا، جن کو میں اس وقت تک عقائد کے اعتبار سے قابل احترام نہیں سمجھتا تھا، اور شاید استدلالی دنیا میں بھی اس لئے کہ ان کی مشہور کتاب "الکلام" کی دلچسپ تنقید ایک طالب العلم کے قلم سے اسی زمانہ میں شائع ہونے والے ایک رسالہ "الناظر" میں دیکھا کرتا تھا، اسی زمانہ میں کانپور کی مسجد کا انہدام ہوا، جس نے گویا مسلمانان ہند میں پہلی بار سیاسی اور دینی بیداری پیدا کی، اسی زمانہ میں معلوم ہوا کہ مولانا کلکتہ سے شائع ہونے والے مشہور ترین ہفتہ وار اخبار "الہلال" کے خاص نامہ نگاروں میں ہیں، اور بعد کو غالباً ۱۹۱۳ء میں مولانا مستقل طور پر اس اخبار کی قلمی اعانت کرتے یا شریک ادارہ ہیں الہلال سے مجھے روز اول سے دلچسپی تھی، اور اس کے مضامین پر سر دھنتے وقت مجھے گھڑی گھڑی مولانا سلیمان ندوی کی یاد آجاتی، اس کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد مولانا شبلی مرحوم کی سیرت نبوی کی اسکیم شائع ہوئی، اور اس کی تفصیلات میں ان نوجوانوں کے ناموں کے چرچے ہونے لگے، جو مولانا کے ساتھ اس مقدس مقصد کے لئے اپنی دماغی اور قلمی کاوشیں وقف کر دیں گے، ان میں سب سے پہلا نام ان ہی "سلیمان" کا تھا، اور خدا معلوم کس مبارک وقت میں کس بے مثال خلوص اور کس عزم مجاہدانہ کے ساتھ "سلیمان" نے اپنے کو اس خدمت کے لئے وقف کر دیا تھا کہ دنیائے اسلام کے اس بے مثال شاہ کار، ایثار و کاوش، درایت و عقیدت کی تکمیل بلکہ بڑی حد تک تکمیل اس سعید ازلی، اسی فرزند رسول، اسی مداح محمد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) اور اسی شیفتۂ جمال محبوب خدا کے حصہ میں یوں آئی کہ گویا اس کے قلم کی ہر گردش پکار پکار کے کہہ رہی تھی،

داستان حسن گل را بشنو از مرغ چمن
زاغ ہا آشفتہ تر گفتند ایں افسانہ را

خدا گواہ ہے کہ سید سلیمان کے لئے دارین میں شرف و امتیاز اور ان کے مخلصین کے لئے ہر لمحہ حیات میں فخر و ناز کیلئے یہی کافی ہے کہ ان کے گوہر بار قلم ان کے فردوس سیرت دماغ، اور ان کی گل ریز انگلیوں نے وہ غیر فانی جواہر سلک کتاب میں پرو دئے ہیں جنہوں نے اس صدی میں دنیائے مشرق کے ہر گوشہ میں (جس میں خود حرمین شریفین بھی شامل ہیں) ہندوستان کو ممتاز اور بہت زیادہ سربلند بنا دیا ہے، اور بلا ریب وہ کتاب ہے جس کو میدان حشر میں اپنے یمین (دست راست) میں لے کے حاضر ہوں گے، تو بقول شخصے

فرشتے دیکھ کر ان کو پکاریں گے یہ محشر میں
جگہ خالی کرو مداح آتا ہے محمد کا!

یہ نہیں تو مصنف کے بدلے اس کی تصنیف کی قصیدہ خوانی کرنے لگا، لیکن کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ اردو سیرت نبوی کا ذکر خود سید سلیمان ندوی کا ذکر اسی طرح ہے جیسے مردوں کو زندہ کرنے کا ذکر خود فرزند مریم کا ذکر ہے، اور اجنہ اور عالم فضائی پر بر اقتدار کا نام لینا گویا سلیمان علیہ السلام کا تذکرہ کرنا ہے، اور ان مغفور و مبرور کے لئے یہ کہنا کہ وہ محقق تھے، ذاکر تھے، ادیب تھے، سخن سنج تھے، نقاد تھے، خطیب تھے، ندوۃ العلماء کے معتمد تھے، مولانا شبلی کے جانشین تھے، شبلی منزل اعظم گڈھ کی جان اور روح رواں تھے، تحریک خلافت کے ایک باوقار علم بردار تھے، ایک متہجد شب زندہ دار تھے، ارض القرآن، حیات امام مالک، اور سیرت عائشہ وغیرہ اور بہت سی کتابوں کے مصنف تھے، اور آخر میں

آئین اسلامی کی تدوین میں منہمک تھے، اور ان کا وجود بہتوں کے لیے شمع ہدایت ثابت ہوا، اور اس طرح کی بہت سی خصوصیات ایک طرف، اور دوسری طرف وہ ممدوح رب حمید کے مداح، اور سیرت نگار تھے، تو میرے خیال میں یہی دوسرا پلڑا یوم الدین والمیزان میں بہت بھاری ہوگا، گویا سیرت نبوی ان کی سربلندی کا وہ تاج ہے جس کے ذکر کرنے کے بعد ان کے دینی آویزہائے گوش ان کی شرعی قبائے افتخار اور ان کے طرہ ہائے علم و ادب کی داد دینے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔

بہر حال مولانا المغفور کی نابغہ کے ذوق ہی نے مجھے خطابت کی طرف متوجہ کیا، اور ادھر ان کی ادارت میں شائع ہونے والے "الندوہ" نے مجھے بھی ایک ماہوار رسالہ کی اشاعت کا شوق دلایا، اور الندوہ ہی کے نام پر میں نے ایک ماہوار رسالہ "النظامیہ" جاری کیا جو چار سال کے بعد بند ہوگیا، لیکن ذوق خطابت اور ذکر سیرت پاک بحمد اللہ اب تک باقی ہے، جب کہ قوتیں جواب دے رہی ہیں، اور مختلف امراض خانہ نشینی پر مجبور کر رہے ہیں۔

مولانا شبلی نعمانی کی حیات میں جب کہ مولانا سلیمان ندوی ان کے صحیح طور پر قوت بازو بن چکے تھے، اور سیرت نبوی کی پہلی جلد کی تکمیل میں اپنے استاد کے گویا دست راست تھے، مولانا کی آمد و رفت مسٹر عبد الماجد (حال مولانا عبد الماجد دریابادی مؤلف تفسیر ماجدی) دریابادی کے یہاں بھی رہتی تھی، وہ گاہے گاہے شام کو ان کے یہاں آتے، اور بعض اوقات عشا کے وقت تک رہتے اسی زمانہ میں میری آمد و رفت مولانائے دریابادی کے یہاں شروع ہوئی تھی، پھر جس تناسب سے میری بے تکلفی صاحب خانہ سے بڑھتی گئی اسی تناسب سے ان کے ہم نشینوں سے بھی بے تکلف ہوتا گیا اس وقت علامۂ دریابادی کی قیام گاہ، ایک متین و پرمغز ادبی اجتماع کا بھی مرکز تھی، جس میں علامہ سید سلیمان مولانا پروفیسر عبد الباری ندوی، ظفر الملک صاحب علوی مرزا محمد ہادی عزیز اور گاہے گاہے کشن پرشاد کول، اور خان بہادر ظفر حسین صاحب اور چند ارباب ادب جمع ہوتے، اور مختلف علمی اور ادبی عنوانات پر گفتگو ہوتی اچھے اچھے شعر پڑھے جاتے بلکہ کبھی کبھی حاضرین میں سے کوئی اپنے افکار عالیہ سے متمتع کرتا، اور ادبی تفریح اور لطائبات میں وقت لطف سے گذرتا، اس وقت مولانا عبد الماجد اچھے شاعر بھی تھے اور ناظر تخلص کرتے تھے؛ اسی اجتماع میں مجھے معلوم ہوگیا کہ وہ جس کو میں نرا کھرا مصنف، مضمون نگار، اور ایک خشک قسم کا مورخ ہی سمجھتا تھا ایک شگفتہ مزاج اور بذلہ سنج ادیب بھی ہے، اور اس کا دماغ جہاں اعلیٰ مضامین کا مخزن ہے، وہاں اس کا حافظہ اچھے اشعار کی لائبریری بھی، اور خود ایک نکتہ آفریں شاعر بھی ہے (مشاعرہ کا نہیں) ہم لوگ کبھی بذلہ سنجی کے سلسلہ میں رعایات لفظی اور ضلع جگت کی طرف جھک پڑتے تو مولانا سلیمان کو خوش قسمتی سے اس زمین میں بھی سباق لغایات پاتے، اور بعض اوقات تو اس ضلع بازی میں ان کے جملوں پر ہی ہماری پسلی پھڑک اٹھتی اور ایک ایسے دیہاتی یا قصباتی کو جس نے اس فن کی تحصیل نہیں کی تھی ہم لوگ بہت سے شہریوں سے زیادہ بلند اور حاضر دماغ پاتے اور جب مرزا ہادی عزیز ایسے مشہور شاعر کا قافیہ تنگ ہو جاتا تو سلیمان کتنی ہی ادبی پریوں کو مسخر کر کے حاضر قصر ادب کر دیتے؛ ایک دن میرے آتے ہی مجھ سے پوچھنے لگے، کہئے آپ کے تر ہندی کا کیا حال ہے؟ میں سمجھا آج زبان کے چٹخارے کے لئے ترش موضوع گفتگو ہوگی اور میرے دانت اس طرح کھٹے کئے جانے کی فکر ہے، میں نے جب آم املی اڑانا شروع کی تو فرمایا ترش رو نہ ہوجئے میں آپ کے دوست تر ہندی کو پوچھ رہا ہوں، اور یہ کہہ کر مسکرا دئے، میں نے ان کو بے تکلفی کی محفل میں بھی قہقہہ لگاتے نہیں دیکھا "کان جل ضحکہ التبسم" پر انہیں ہمیشہ عامل پایا، بہر حال یہ سوال میرے ایک عنایت فرما کے متعلق تھا جن کو بھول چوک سے کوئی علامہ ہندی نہ کہتا تو وہ سرکہ جبیں ہو جاتے۔

مولانا شبلی کے انتقال کے بعد مولانا پورے اعظم گڑھی ہو گئے تھے، کہ اس عرصہ میں تحریک خلافت شروع ہو گئی، اب [illegible] اور ان کی

بہت کم ملاقات ہوتی، تحریک خلافت کے کسی اہم اجتماع یا معرکۃ الآرا کانفرنس ہی میں ان سے نیاز حاصل ہوتا، خدا بچائے سیاسی مشاغل سے یہ وہ آگ ہے جو اپنے ہر ماسوا کو جلا کر خاک کر دینا جانتی ہے، اور اگر چکی کی مشقت میں مشق سخن جاری رکھنا مولانا حسرت کا کمال تھا، تو ان سیاسی مشاغل کے دوران میں جو تحریک خلافت میں مسلسل جاذب توجہات خاص تھے وہ تدوین سیرت نبی کے علاوہ ہمارے ادبی کتب خانوں کو اپنے قلم کے بے اندازہ برکات سے برابر بہرہ اندوز فرماتے رہے، اس زمانہ میں لکھنؤ اور خصوصیت سے مولانا قیام الدین محمد عبد الباری (قدس سرہٗ) کا گھر اعیان خلافت و اکابر سیاست اور خدام دین متین کا ایک بڑا مرکز تھا۔

مولانائے مرحوم کو فرنگی محل سے جو خاص رابطۂ قلبی، جو وابستگی روحانی اور عقیدت آمیز خلوص تھا، وہ شائد اس وقت منظر عام پر آسکے گا جب ان کے وہ مکاتیب شائع ہوسکیں گے جو انہوں نے مولانائے فرنگی محلی کو لکھے تھے یہاں تو یہ کہنا ہے کہ اکثر تو نہیں مگر اہم تر اجتماعات خلافت وسیاست میں مولانا سے فرنگی محل میں ملاقاتیں ہوتیں اور ان اجتماعات میں مولانا کی پختہ کاری، معاملہ فہمی، اور دُور رس نگاہ کا وہ بھی اعتراف کرتے، جو ان سے سیاسی دنیا میں قدیم العہد تھے۔

ان اجتماعات میں انہوں نے اخلاص و بصیرت سیاسی کا وہ نقش دلوں پر بٹھا دیا تھا کہ المغفور مولانا محمد علی کی قیادت میں مسلمانان ہند کا جو باوقار وفد انگلستان اس لئے گیا تھا کہ اس وقت کے وزیر برطانیہ لائڈ جارج کو مسلمانان ہند کی شرعی ذمہ داریوں اور خلافت کمیٹی کی اہمیت اور مسلمانوں کے خالص دینی مطالبات کو صاف صاف سنا دے تو حضرت مولانائے فرنگی محلی اور علی برادران مغفورین کی نگاہ دُور رس بے شمار عالم مبلغین تحریک خلافت میں ان ہی پر پڑی، اور اعیان خلافت نے بالاتفاق انہیں علمی و دینی وکالت مسلمین ہند کے لئے منتخب کیا، اور پھر وزیر اعظم برطانیہ کے سامنے جس طرح ان مجاہدین دین متین، ان غازیان ملت بیضا، اور ان علم برداران ملت اسلامی نے جعفرانہ ہمت کے ساتھ اعلان حق فرمایا اس کو مجلّایوں یاد رکھئے کہ اس نے وہ حدیث ہم کو یاد دلادی، جس کو برسوں سے مسلمانان عالم فراموش کئے ہوئے تھے یعنی" افضل الجھاد کلمۃ حق عند سلطان جابر " (بہترین جہاد حق بات کہہ دینا ہے ظالم حکمران کے سامنے)

اس وفد کے ایک ضروری رکن کی حیثیت سے اگر سلیمان دیو استبداد کو مسخر نہ کرسکے، تو اس کو مبہوت و سر بگریباں کر لینے میں ضرور کامیاب ہوئے۔ میں تحریک خلافت کے ابتدائی مبلغ اور خادموں اور اس کی جمعیتہ مرکزیہ کا ایک رکن بھی تھا، ایک بار میں نے ایک ایسے جلسے میں بھی تقریر کی جس میں سید مغفور کا بھی بیان ہوا تھا، تقریر کے بعد ہم دونوں ایک ساتھ قیام گاہ کے لئے روانہ ہوئے تو راستے میں مرحوم نے میری تقریر کی، داد دیتے ہوئے فرمایا" تقریر کے مؤثر اور دلپذیر ہونے میں خطیب کی شخصیت و وجاہت ظاہری کو بھی خاص دخل ہوتا ہے، شاید اگلے صالحین اسی لئے وعظ و تقریر کے وقت عمامہ باندھ لیا کرتے تھے" میں نے عرض کیا "مجھے عمامہ باندھنے کا شوق ہے، لیکن میں عمامہ اچھا نہیں باندھ پاتا ہوں" تو فرمانے لگے، " وہ ظاہری زینت جو آپ اپنے چہرے کی کر سکتے ہیں اس میں تو کوتاہی نہ کیجئے"، میں اس وقت تک داڑھی منڈایا کرتا تھا اس لئے میں اس استعارہ کو نہیں سمجھا یا اس کو سمجھنا نہ چاہا، تو اس وارث انبیاء نے مجھے ایک عجب دل نشین انداز میں داڑھی رکھنے کی اہمیت پر توجہ دلائی، اس انداز کا کیا اثر مجھ پر ہوا، اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ اس دن سے پھر میرے چہرے کو استرا چھو نہ سکا، اور اہم اجتماعات میں عمامہ یا عبا سے اپنے جسم کو آج تک رونق دیتا ہوں۔

تحریک خلافت کا ذکر آگیا تو اس عظیم الشان کانفرنس کا بھی حال سُن لیجئے، جو ان کی صدارت میں شاہ جہاں پور (یو۔پی) میں ہوئی تھی، تحریک خلافت کے زمانہ میں ہمیں غیروں کے ساتھ اپنوں سے بھی مقابلہ کرنا پڑتا تھا، ان اپنوں میں خصوصیت سے وہ رسوائے عام

جماعت بھی تھی جو کافر سازی میں افسوس اب تک مشغول ہے، اسی جماعت کے توڑ کے لئے تابڑ توڑ دو کانفرنسیں پچاس میل کی مسافت کے اندر بریلی اور شاہ جہاں پور میں ۲۱ء میں منعقد کی گئیں، بریلی میں ہونے والی کانفرنس کی صدارت مولانا ابوالکلام آزاد نے کی تھی، اس کانفرنس کے قبل ہی سے پوری بریلی ممتاز خدام اسلام پر تبرہ بازیوں سے متعفن کردی گئی تھی اور ہزاروں اشتہاروں اور پوسٹروں میں خدام خلافت کو گالیوں کے ساتھ اعیان تحریک خلافت حضرت مولانا محمد عبدالباری، مولانا ابوالکلام اور علی برادران پر طاجیاں اُڑائی گئی تھیں، اور بے شمار وجوہ کفر سے ان کو منسوب بہ کفر بے شمار کیا گیا تھا، مجھے خوب یاد ہے ان تکفیری چیتھڑوں میں سے چند چیتھڑے مولانا محمد علی المغفور کو بریلی کے ریفرشمنٹ روم میں اس وقت دکھائے گئے جب وہ ریل سے اُترتے ہی ناشتہ کر رہے تھے تو انہوں نے ایک عجب انداز استغنا کے ساتھ انہیں اٹھا کے پھینک دیا، پھر مسکرا کے فرمایا "مجھے فرنگی محل سے مولانا کی سند ملی ہے اور میں نے اس سند سے کوئی خاص کام اب تک نہیں لیا ہے، اب پہلا کام جو اس سند سے میں لوں گا وہ یہ ہوگا کہ اس کافر ساز مسلمین کے کفر کا فتویٰ اپنے دستخط و مہر سے مزین کرکے دے دوں گا۔"

یہی اشتہارات مولانائے ندوی کو شاہ جہاں پور میں دئے گئے تھے، مولانا نے پہلے اپنا خطبۂ صدارت کانفرنس کو سنایا، اس کے بعد ان اشتہارات کی طرف توجہ فرمائی، مگر ان اشتعال کن اشتہارات کے ذکر میں ان کی ضرب المثل متانت برقرار رہی، حد یہ ہے کہ لہجہ تک نہیں بدلا، اس کے بعد ان کے متین و مضبوط جوابات نے سچ یہ ہے کہ میری طرح ان لوگوں کو انگشت بدنداں کر دیا جو ان کو آج تک صرف ایک ادیب و مورخ ہی جانتے تھے، جزئیات فقہیہ پر عبور، مسائل کا استحضار اور قوت استدلال سب ہی سے خراج عقیدت وصول کر رہی تھی۔

عم محترم و مرشدی حضرت مولانا قیام الدین محمد عبدالباری (قدس سرہ) سے جو انہیں خاص رابطۂ قلبی تھا اس کی طرف میں اوپر اشارہ کر چکا ہوں، مگر سچ یہ ہے کہ اس کا صحیح اندازہ ۲۶ء میں اس وقت ہوا، جب ہم حضرت کے وصال سے سینہ فگار و دل ریش تھے، مولانا کے تعزیتی خط سے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہم افراد خاندان فرنگی محل ہی کی طرح حد سے زیادہ اندوہ گیں ہیں۔ اس کے بعد رسالہ "معارف" میں "فرنگی محل کی شمع آخری" کے بجھنے پر ان کے قلم کی نوحہ خوانی ہمارے دلوں کو برسوں نہیں بھولے گی، اور جس طرح انہوں نے اعتراف کمالات کے ساتھ اظہار تحسین اس سانحہ پر کیا تھا یقیناً کسی ادبی اور علمی مجلہ نے نہیں کیا تھا، ہمارا یہ غم ان کا بھی غم تھا اس لئے کہ وہ حضرت مغفور کے مدارج عالی سے ہم بہتوں کے اعتبار سے زیادہ واقف تھے۔

حضرت اقدس کے ساتھ ان کے رابطۂ قلبی کا ذکر کرنے کے ساتھ میں اس خاص محبت کو بھی قلم بند کرنا چاہتا ہوں جو ان کو سرزمین لکھنؤ کے ساتھ تھی، لاکھوں ارباب کمال کا "کعبۂ علمی" ہے، لیکن اس دور میں میں نے ان سے زیادہ لکھنؤ سے روحانی طور پر وابستہ کسی کو نہیں دیکھا، وہ فرمایا کرتے تھے "لکھنؤ میرا گھر ہے، میرا مرکز ہے، میرا منشا رعلمی ہے، اس لئے ہر اقدام اہم کے قبل میں لکھنؤ ضرور حاضر ہو جایا کرتا ہوں۔"

آیئے نوحہ غم ختم کرتے ہوئے میں اپنی اور ان کی آخری ملاقات مفصل کی بھی داستان سناتا چلوں، غالباً ۴۹ء کی بات ہے کہ لکھنؤ میں ایک عظیم الشان جلسۂ سیرت نبوی منعقد ہوا، یہ جلسہ ہو ہی رہا تھا کہ کچھ حضرات میرے پاس آئے اور انہوں نے مجھ سے کہا کہ سیرت پر تو کئی تقریریں ہمارے جلسے میں ہو چکی ہیں، تم چل کے آخر میں ذکر ولادت شریف کر دو، کہ یہی مسلک اختتام ہے، میں نے جلسہ میں جا کے دیکھا کہ ممتاز شرکائے بزم میں میری توقع کے خلاف علامہ ندوی بھی ہیں، میں نے تخلیق آدم سے بیان کو شروع کیا، پھر آدم کے مسجود ملائک ہونے کے ذکر کے بعد کہا کہ "شیطان ان کو سجدہ نہ کرنے پر مطرود و مردود ہوا، سب ہی کہتے ہیں، مگر اس کا اصلی سبب

بھی پیش نگاہ ہونا چاہئے، اور وہ یہ تھا کہ ملائکہ کی بہت بڑی اکثریت کے فیصلہ سے انحراف کرکے اس وقت کے عالم مخلوق کے قائد اعظم کے آگے اس نے سرِ نیاز و اطاعت خم نہیں کیا۔۔ بات آئی گئی ہوگئی، اس کے کئی مہینوں کے بعد حیدرآباد دکن کے ایک رئیس کے یہاں دعوت میں گیا دیکھا تو علامہ ندوی بھی تشریف فرما ہیں، میرے پہنچنے پر میزبان نے جب میرا تعارف اُن سے کرانا چاہا تو انہوں نے فرمایا "میں مولانا کو جانتا ہوں، یہ ہر اس مسلمان کو شیطان کہتے ہیں جو مسلم لیگ کا رکن اور کارکن نہیں ہے"، میں اس وقت تو مسکرا کے خاموش ہوگیا، لیکن جب ہم دونوں ایک ہی موٹر پر واپس ہوئے، تو میں نے مولانا سے عرض کیا کہ مجھے افسوس ہے کہ اس سخن گسترانہ بات کا استاد ندوہ نے اتنا اثر لیا، میرا روئے سخن آپ کی طرف نہ تھا، اور اگر آپ خیال فرماتے ہیں کہ ان جملوں کا اشارہ آپ کی طرف تھا تو میں آپ سے معافی مانگوں گا، "معافی" کا لفظ پوری طرح ادا بھی نہیں ہونے پایا تھا کہ اس مرد صاف دل نے مجھے گلے لگا لیا، اور فرمایا "مجھے آپ سے محبت ہے اس لئے مجھے اس روز کے بیان سے ضرور تکلیف پہنچی تھی لیکن اب میں صاف ہوں، اور ہم دونوں بدستور ایک دوسرے کے دوست ہیں" میں نے عرض کیا سید صاحب خدا گواہ ہے میں آپ سے بہت محبت کرتا ہوں۔

ہائے اس کے بعد کوئی زیادہ تفصیلی ملاقات ان سے نہ ہوسکی، ابھی چھ مہینے ہوئے جب وہ غالباً اپنا آخری دیدار کرانے اور لکھنؤ سے رخصت ہونے لکھنؤ تشریف لائے تھے، میں اس وقت بیمار تھا، اس لئے محروم نیاز رہا، اور جب وہ آغوش رحمت الٰہی میں جارہے تھے تو میں ڈھاکہ میں بغرض تبدیل آب و ہوا مقیم تھا، ان کے سانحۂ ارتحال نے میرے قلب و روح کو اتنا مجروح کردیا ہے کہ اس زخم کی گہرائی کا میں آج تک صحیح اندازہ نہیں کرسکا ہوں، اسی لئے وہ مناسب الفاظ بھی نہیں مل رہے ہیں جن سے میں اپنے تاثرات کا اظہار کرسکوں، لیکن مختصر طور پر یہ ضرور کہوں گا کہ ہماری باقاعدہ دینی تعلیم گاہوں نے اب تک ایسا جامع خصوصیات اور ہمہ گیر فاضل پیدا نہیں کیا ہے۔

ہائے سلیمان! تو جوانی سے تا عہد آخر دین، شریعت، سیرت، اور تبلیغ میں برابر مشغول رہا، تو اب آرام کر، انشاء اللہ میدان حشر میں ہم تیری سرخروئی اور سرفرازی کو رشک سے دیکھیں گے، اور اگر تیرے جد کی شفاعت نے ہماری دستگیری فرمائی تو تجھے حلہائے بہشتی پہنے دیکھ کے مبارکباد دیں گے، اللّٰھم لا تحرمنا اجرہ ولا تفتنا بعدہ و آت اجرہ آمین!

بقیہ بزم ریاض صفحہ ۶۹

راولپنڈی ۶/۵/۷۳ء

محترمی و مکرمی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گرامی نامہ ملا، فرمائش کی تعمیل سے کسی صورت بھی انکار نہیں کیا جاسکتا، لیکن کام کے ازدحام کی وجہ سے بہت مشغول ہوں۔ حضرت سید صاحب قبلہ رحمۃ اللہ علیہ پر کئی مضامین لکھنا تھے جن میں سے صرف ایک مضمون المسلمون (القاہرہ) کو لکھ کر بھیج سکا ہوں۔ امید کہ آپ معذرت قبول فرمائیں گے۔

امید کہ آپ کا مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ والسلام

عاجز مسعود عالم ندوی

سیّد سلیمانؒ : آج سے ۳۵ سال پہلے

عبد العلی خاں

غالباً فروری ۱۹۲۰ء میں مولوی سیّد سلیمان ندوی صاحب ڈاکٹر مختار احمد انصاری صاحب کے مہمان رہے ڈاکٹر انصاری صاحب کی نئی کوٹھی واقع دریا گنج میں مقیم ہوئے، یہ کوٹھی دریائے جمنا پر فصیل کے بالکل قریب واقع ہے مشہور ہے کہ یہاں دارا شکوہ کا محل تھا، مولوی صاحب کی طبیعت عرصہ دراز سے ناساز تھی جس کی وجہ سے وہ ڈاکٹر انصاری صاحب کے پاس تشریف لائے تھے، یہ ڈاکٹر انصاری صاحب کی خصوصیت تھی کہ ان کے دوست ہندوستان کے دور دراز مقامات سے بیمار ہو کر آتے تھے اور ان کے مہمان ہوتے تھے اُن سے علاج کرواتے تھے۔ ڈاکٹر انصاری جیسے ہندوستان میں کم لوگ ہوں گے کیونکہ اُن کے یہاں دو چار مہمان ہمیشہ رہتے تھے اور بعض اوقات مہمان اس کثرت سے ہو جاتے تھے کہ ان کے لئے خیمہ نصب کرنا پڑتا تھا۔

خوبیٔ تقدیر سے مولوی صاحب میرے کمرہ میں مقیم ہوئے۔ میری اور ان کی چارپائیاں بالکل قریب تھیں جس کی وجہ سے اکثر بات چیت کرنے کا موقع ملتا تھا۔ مولوی صاحب نے اپنی چارپائی کا سرہانہ پائنتی سے کسی قدر نیچا رکھا۔ میں نے اس کا سبب دریافت کیا تو فرمایا کہ ایسا کرنے سے زیادہ دماغی کام کرنے والوں کے دماغ کو آرام پہنچتا ہے اور تھکاوٹ جلد رفع ہو جاتی ہے۔

مولوی صاحب سے کبھی قرآن شریف کی مختلف آیات پر گفتگو ہوتی، کیونکہ میں نے جبکہ میں نویں کلاس میں قرآن شریف کو معانی کے ساتھ پڑھنا شروع کیا تھا جس کی وجہ سے قرآن شریف سے خاص لگاؤ تھا کبھی احادیث پر بات ہوتی اور بعض اوقات اُس زمانہ کے سیاسی حالات پر بحث ہوتی، ہر نوع پر گفتگو سنجیدہ اور سلجھی ہوئی ہوتی تھی

مولوی صاحب کی آمد کی خبر سن کر شہر سے بعض لوگ آتے تھے اور مختلف موضوع پر گفتگو کرتے تھے، مولوی صاحب ہر بات کو اس خوش اسلوبی سے سمجھاتے تھے کہ سنجیدہ مسائل آسانی سے سمجھ میں آجاتے، الغرض کہ یہ قلیل زمانہ بڑی دلچسپی کا زمانہ تھا۔

رات کے کھانے میں ڈاکٹر انصاری صاحب شریک ہوتے تھے کھانے پر مختلف پہلوؤں پر باتیں ہوتی تھیں جو کہ بڑی معلومات سے پُر ہوتی تھیں، کبھی سیاسی معاملات پر اور کبھی مذہبی مسائل پر گفتگو ہوتی تھی، حقیقت یہ ہے کہ یہ زمانہ بڑی اچھی طرح گزرا اور ہمیشہ یاد رہے گا۔

دوسری مرتبہ مولوی سلیمان ندوی صاحب جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام پر علیگڈھ تشریف لائے۔ مولوی صاحب نے

بی۔ اے کے طلباء کو چند لیکچر قرآن شریف پر دیئے، مولوی صاحب نے ہفتہ عشرہ جامعہ میں قیام کیا، طلباء ہر وقت مولوی صاحب کو گھیرے رہتے تھے اور سیکڑوں باتیں دریافت کرتے تھے، مگر مولوی صاحب ہمیشہ خوش خلقی سے جواب دیتے تھے۔ اسی زمانہ میں مولانا حافظ حمید الدین فراہی صاحب بھی جامعہ ملیہ میں تشریف لائے تھے اور انھوں نے کئی روز قرآن مجید کا درس دیا مولانا محمد علی صاحب مجھ کو بھی جامعہ ملیہ لے گئے تھے، اس لئے علیگڈھ میں بھی ان حضرات کی خاطر مدارات میرے سپرد تھی میں حتی المقدور ان بزرگوں کی خدمت کرتا تھا اور ساتھ ہی میں بھی مستفیض ہوتا تھا۔

جامعہ ملیہ کے قیام کے زمانہ میں ہندوستان کے مختلف مقامات سے بزرگان دین اور سیاسی رہنما تشریف لاتے تھے جب یہ سب صاحبان ایک جگہ جمع ہوتے تھے اور مختلف انواع پر باتیں کرتے تھے تو عجیب وغریب سماں نظر آتا تھا۔

مولانا محمد علی صاحب مولوی سید سلیمان ندوی صاحب کو خلافت کے وفد میں انگلستان لے گئے، حالانکہ مولوی صاحب وہاں جانے سے اجتناب کر رہے تھے مگر اسلامی جذبات اور مولانا محمد علی صاحب کے اصرار کی وجہ سے انگلستان گئے اور کما حقہ اسلام کی خدمت انجام دی۔

قیام پاکستان کے زمانہ میں مولوی سلیمان ندوی صاحب بھوپال میں قضائی کے عہدہ پر متمکن تھے اور پاکستان تشریف نہیں لائے، مولوی احتشام الحق صاحب ۴۸ء میں مولوی صاحب ممدوح کو لینے کے لئے ہندوستان گئے مگر مولوی صاحب نہیں آئے، دوسرے سال جب مولوی سلیمان ندوی صاحب حج کرنے کے لئے مکہ معظمہ تشریف لے گئے تو مولوی احتشام الحق صاحب مولوی سلیمان ندوی کو لینے کے لئے ہوائی جہاز سے مکہ معظمہ جانے والے تھے مگر مولوی صاحب اُس وقت بھی یہاں نہ آئے۔ مولوی احتشام الحق صاحب نے پھر تیسری مرتبہ مولوی صاحب کو لانے کیلئے کوشش کی۔ اس مرتبہ مولوی سید سلیمان ندوی صاحب مملکت پاکستان کے کانسٹی ٹیوشن میں اسلامی قانون داخل کرنے کے لئے تشریف لے آئے۔ یہاں مولوی صاحب کی تشریف آوری پر اُن سے اکثر ملاقات ہوئی، مولوی صاحب جس نہج سے اسلامی قانون منضبط کرنا چاہتے تھے حکومت کو اُس سے اتفاق نہ تھا لہٰذا عرصہ تک مولوی صاحب بیکار بیٹھے رہے اور مالی دشواریوں میں مبتلا ہوگئے لیکن مولوی صاحب کے قدم صراطِ مستقیم سے ذرا بھی نہیں ڈگمگائے۔ اتنے صحیح العقیدہ اور مستقل مزاج لوگ کم ہوتے ہیں۔

کچھ عرصہ کے بعد مولوی سلیمان ندوی صاحب کی پیش کردہ شرائط پر حکومت رضامند ہوگئی، مولوی صاحب نے کام کرنا شروع کر دیا اور مجوزہ کمیٹی کے صدر ہوگئے۔

"مرضیٔ مولیٰ از ہمہ اولیٰ" مولوی صاحب کام ختم نہ کرنے پائے تھے کہ داصل بہ حق ہوگئے، نہایت افسوس ہے کہ ایک عالم باعمل پاکستان میں آئے اور چل دیے۔ اب تمام پاکستان میں کوئی شخص نظر نہیں آتا جو اُن کی جگہ پر کر سکے۔ اللہ مدد کرے۔

پروفیسر یوسف سلیم چشتی

خراجِ عقیدت

گذارش اوّلین سید صاحب مرحوم و مغفور کی بلند پایہ اور جامع حیثیات شخصیت، دینی اور علمی خدمات، ذاتی کمالات اور راقم الحروف پر انکے گوناگوں احسانات کا تقاضا، تو یہ تھا کہ دل کھولکر اپنے قلبی تاثرات قلمبند کرتا اور مرحوم کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کی وضاحت کرکے اپنے لئے سرمایۂ سعادت بہم پہونچاتا، لیکن "سایاض" کے محدود صفحات اس بات کی اجازت نہیں دیتے۔ اس لئے ہر جگہ اختصار سے کام لیا ہے۔ ۱۲۔

ابتدائی حالات پٹنہ کی تحصیل بہار شریف سے چھ سات میل کے فاصلہ پر دیسنہ نامی ایک موضع ہے جو صدیوں سے شرفائے سادات کا مسکن رہا ہے۔ سید صاحب اسی بستی میں ماہ صفر ۱۳۰۲ھ میں پیدا ہوئے تھے والد بزرگوار کا اسم گرامی حکیم سید ابوالحسن تھا، اور سید صاحب کے بڑے بھائی حکیم سید ابو حبیب صاحب مرحوم بھی طبیب تھے۔

سید صاحب نے آنکھ کھولی تو گھر میں علم کا چرچا دیکھا ابتدائی تعلیم اپنے بڑے بھائی سے حاصل کی، جو جسمانی طبیب ہونے کے علاوہ روحانی طبیب بھی تھے یعنی وہ حضرت شاہ ابو احمد صاحب نقشبندی مجدّدی بھوپالی کے مرید اور خلیفۂ مجاز تھے میرا خیال ہے کہ سید صاحب کی شخصیت میں تقوے اور طہارت کا جو رنگ ساری عمر نمایاں اور کارفرما رہا یہ زیادہ تر بڑے بھائی کے فیض صحبت ہی کا نتیجہ ہے ابتدائی تعلیم ختم ہوجانے کے بعد سید صاحب کو پھلواری شریف بھیجا گیا لیکن یہاں صرف چند ماہ تعلیم پائی اسکے بعد مدرسہ امدادیہ دربھنگہ میں داخل کیا گیا۔ یہاں غالباً ۵۔۶ سال تک تعلیم پائی۔

سید صاحب کے رشتہ کے چچا مولانا سید حافظ شاہ تجمل حسین صاحب نے جو ندوۃ العلماء کے بانیوں میں سے ہے، سید صاحب کے پدر بزرگوار کو مشورہ دیا کہ اس جوہر قابل کو ندوۃ العلماء میں داخل کیا جائے۔ چنانچہ سید صاحب کے حقیقی پھوپھی زاد بھائی مولوی محمد احسن صاحب استھانوی فروری ۱۹۰۱ء شوال ۱۳۱۹ھ میں انکو اپنے ساتھ لائے اور ندوہ میں داخل کردیا۔

ندوہ میں قیام ندوہ میں سید صاحب کا قیام ۱۹۰۱ء سے ۱۹۱۲ء تک رہا ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۶ء تک بحیثیت متعلم اور ۱۹۰۷ء سے ۱۹۱۲ء تک بحیثیت مدیر الندوہ اور معلم۔

ذیل میں قیام ندوہ کے خاص خاص حالات مختصراً درج کرتا ہوں:۔

۱۔ ۱۹۰۲ء میں جب مولانا شبلی مرحوم امرتسر کے جلسہ ندوۃ العلماء میں شرکت کے بعد واپسی میں لکھنؤ آکر ٹھہرے تو سید صاحب نے سب سے پہلی مرتبہ انکی زیارت کی" اور استاد اور شاگرد میں وہ رابطہ قایم ہوا جو مدت العمر قایم رہا۔

۲۔ سید صاحب نے ندوہ میں قدیم عربی زبان کے ساتھ ساتھ جدید عربی میں بھی مہارت تامہ بہم پہونچائی چنانچہ سید صاحب خود لکھتے ہیں خاکسار کو چونکہ بچپن سے ادب کا شوق تھا اسلئے دار العلوم (ندوہ) میں اس زمانہ کے جو عربی اخبارات المؤید اور اللواء وغیرہ آتے تھے۔

اُن کو پڑھا اور ان کے معنی حل کیا کرتا تھا، اسی وجہ سے میں نے ایک بہت بڑے امتحان میں کامیابی حاصل کی جس کا واقعہ یہ ہے کہ سنہ ۱۹۰۳ء میں جب مولانا شاہ محمد سلیمان صاحب (پھلواری شریف والے) دارالسلام میں مقیم تھے (نواب محسن الملک دارالعلوم دیکھنے کو آئے، میں نے انکی شان میں ایک عربی قصیدہ پڑھا جس کو سنکر انہوں نے فرمایا کہ میں دارالعلوم کی عربی دانی کا قائل اسوقت تک نہیں ہونگا جبتک یہ نہ جان لوں کہ یہاں کے طالب عربی اخبار سمجھ سکتے ہیں۔ چنانچہ المؤید یا اللواء کا ایک پرچہ منگوایا گیا اور مجھ سے ایک مضمون کی طرف اشارہ کرکے پڑھنے کو کہا گیا جب میں اسکو صحیح پڑھکر اسکا صحیح مطلب بتا دیا تو نواب صاحب بے انتہا خوش ہوئے اور اسے دارالعلوم کا ایک خاص امتیاز سمجھا۔

۳۔ سنہ ۱۹۰۵ء میں مولانا شبلی مرحوم ندوہ میں آکر مقیم ہوئے اُن کے پاس مصر و شام کے اکثر اخبار اور رسالے آیا کرتے تھے، سید صاحب ان اخبار و رسائل کو بالالتزام پڑھا کرتے تھے جس کی بنا پر ان کو جدید عربی زبان میں لکھنے اور پڑھنے کی پوری مشق ہو گئی

۴۔ مولانا شبلی مرحوم نے جن ہونہار طلبہ کو اپنے گرد جمع کیا اس میں سید صاحب بھی تھے۔ چنانچہ انہوں نے جرجی زیدان کی کتاب الانتقاد سید صاحب کو تلخیص کے لئے دی۔ اور تقریر کی مشق بھی کرائی۔

۵۔ مولانا شبلی مرحوم ہی کی کوشش سے سید صاحب نے جدید طبیعات، اور جدید ہیئت کا بھی مطالعہ کیا چنانچہ سید صاحب نے ندوہ کے جلسۂ دستار بندی میں علوم قدیمہ و جدیدہ کے موازنہ پر ایک بسیط مضمون لکھکر پیش کیا اور الندوہ میں "سکون ارض" اور "مسلمان اور علم" پر چند نمبر لکھے۔

۶۔ سنہ ۱۹۰۶ء میں مولانا مرحوم نے سید صاحب کو قرآن پاک کے اصول بلاغت پر اسباق بھی پڑھائے اور املا بھی کرایا۔

۷۔ سنہ ۱۹۰۶ء میں سید صاحب نے ندوہ کے نصاب کی تکمیل کی اور چونکہ اپنی قابلیت اور فطری صلاحیت کی بدولت اُستاد مرحوم کے دل میں جگہ بنا چکے تھے اسلئے تکمیل کے بعد فوراً زمرۂ اساتذہ میں شامل ہو گئے بلکہ مولانا ابوالکلام کے امرتسر چلے جانے کے بعد مولانا شبلی مرحوم نے الندوہ کی ادارت بھی سید صاحب ہی کے سپرد کی۔

۸۔ سنہ ۱۹۰۷ء سے سید صاحب اپنے اُستاد کے رفیق کار بلکہ دست راست بنگئے چنانچہ جب انہوں نے تعلیم سے فراغت پائی تو اُستاد نے سیرت صلعم کے لکھنے کی ترغیب دی بلکہ بقول سید صاحب "ہدایت فرمائی اور احادیث و مسانید کی طرف توجہ دلائی"

علاوہ بریں اسی خصوصیت کی بنا پر جب سنہ ۱۹۰۷ء میں نواب سکندر نواز جنگ نے اپنا کتب خانہ ندوۃ العلماء کی نذر کیا تو مولانا شبلی نے ان کتابوں کو لانے کے لئے سید صاحب ہی کو پٹنہ بھیجا تھا اور سنہ ۱۹۱۱ء میں جب نواب عماد الملک نے اپنا کتب خانہ ندوہ کے حوالے کیا تو اُستاد کی نگاہِ انتخاب انہی پر پڑی تھی۔

۹۔ سنہ ۱۹۰۶ء میں سید صاحب نے ندوۃ العلماء کے سالانہ جلسہ منعقدہ بنارس میں پہلی مرتبہ بھرے مجمع میں کامیاب تقریر کی۔

۱۰۔ مارچ سنہ ۱۹۰۶ء میں رفاہ عام کلب لکھنؤ کے وسیع ہال میں جلسہ دستار بندی کے نام سے ندوہ کا عام سالانہ جلسہ ہوا۔ سید صاحب نے اس جلسہ میں علوم جدیدہ و قدیمہ کے موازنہ پر تقریر کی اور بقول سید صاحب "اسی تقریر کے دوران میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے جلسہ کو تماشاگاہ اور آئینہ حیرت بنا دیا۔ عین راقم کی تقریر کے اثناء میں کسی نے اٹھکر کہا کہ اگر یہ تقریر عربی میں کریں تو بلاشبہ ندوہ کی تعلیمی کرامات کا ہم یقین کریں مولانا شبلی حسب قاعدہ جلسہ سے باہر چلے گئے تھے۔ اسلئے مولوی سید عبدالحئی صاحب مرحوم نے مجھ سے دریافت فرمایا تم کر سکتے ہو؟" میں نے اثبات میں جواب دیا اور عربی میں تقریر شروع کردی۔ جلسہ پر ایک سماں چھا گیا مولانا کو باہر یہ خبر معلوم ہوئی تو فوراً اندر آئے اور میرے پاس کھڑے ہو کر مجھ سے دریافت کیا کہ اگر تمکو اسی وقت کوئی موضوع دیا جائے تو تم تقریر کر سکتے ہو؟ میں نے پھر اثبات میں جواب دیا تو مولانا نے مجمع کو خطاب کرکے فرمایا کہ اس طالب علم (سید صاحب) نے جو تقریر کی ہے اسکی نسبت بعض لوگ بدگمانی کر سکتے ہیں کہ یہ گھر سے تیار ہو کر آئے تھے۔ اس بدگمانی کے لئے اگر کوئی صاحب

اسی وقت موضوع دے سکتے ہیں یہ اسپر تقریر کرینگے۔ چنانچہ موضوع کے تقرر کے لئے لوگوں نے خواجہ غلام الثقلین کا نام پیش کیا۔ جو اس زمانہ میں لکھنؤ میں وکالت کرتے تھے۔ انہوں نے یہ موضوع مقرر کیا کہ ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کیونکر ہو؟ میں نے اس موضوع پر اپنے خیالات ظاہر کرنے شروع کئے۔ ہر طرف سے احسنت و آفرین کی صدائیں باربار بلند ہو رہی تھیں۔ استاد مرحوم نے جوش مسرت میں اپنے سر سے عمامہ اتار کر میرے سر پر باندھ دیا، جو اس خاکسار کے واسطے ہمیشہ کے لئے طرۂ افتخار بن گیا" (حیات شبلی ص ۴۵۷)

۱۰۔ "۱۹۰۸ء میں جب گورنمنٹ نے ندوہ کی امداد کی تو ایک جگہ اس میں جدید عربی کی تعلیم کے لئے بھی مقرر کی گئی۔ استاد مرحوم نے اس جگہ کے لئے سید صاحب ہی کا انتخاب کیا۔ اسکے بعد انہوں نے اس کی تکمیل کے لئے انہیں مصر بھی بھیجنا چاہا مگر اس زمانہ کے مصری سیاسیات کے سبب سے گورنمنٹ نے اجازت نہیں دی۔"

۱۱۔ "جدید عربی الفاظ و اصطلاحات کو عام کرنے کے لئے مولانا (شبلی مرحوم) کی تجویز کے مطابق سید صاحب نے دروس الادب کے نام سے دو ابتدائی عربی رسالے لکھے۔

۱۹۱۰ء میں ندوہ کے اجلاس دہلی میں یہ طے ہوا کہ جدید عربی الفاظ و لغات کی ایک ڈکشنری ترتیب دی جائے۔
یہ کام بھی مولانا شبلی مرحوم کے ایماء سے سید صاحب ہی کی سپرد کیا گیا، جسکو انہوں نے دو سال میں پورا کر کے ۱۹۱۲ء کے اجلاس لکھنؤ میں جسکے صدر علامہ سید رشید رضا مصری تھے، پیش کیا، اور وہ 'لغات جدیدہ' کے نام سے چھپ کر شایع ہوا۔

۱۹۱۰ء میں ہز ہائینس سر آغا خاں بالقابہ، مولانا شبلی مرحوم کی دعوت پر ندوۃ العلما کو دیکھنے آئے۔ اس جلسہ میں سید صاحب نے عربی میں اس موضوع پر تقریر کی کہ علماء کو فلسفۂ جدید کا سیکھنا کیوں ضروری ہے؟

۱۹۱۲ء میں ندوہ سالانہ اجلاس لکھنؤ میں ہوا۔ علامہ سید رشید رضا اس جلسہ کے صدر تھے۔ سید صاحب نے انگریزی اسکولوں کے نصاب تعلیم میں سے اُن غلطیوں کے اقتباسات پیش کئے جن میں اسلام، پیغمبر اسلامؐ صحابۂ کرامؓ قرآن پاک اور مسلمان بادشاہوں پر الزامات لگائے تھے۔

جلسہ کے اختتام پر مولانا شبلی مرحوم نے اردو میں صاحب صدر کا شکریہ ادا کیا جس کا عربی ترجمہ مولانا کے ارشاد کے مطابق سید صاحب نے کر کے سنایا۔

سید صاحب نے اس عرصہ میں تین مرتبہ الندوہ کی ادارت کے فرائض انجام دیئے۔ پہلی مرتبہ ۱۹۰۶ء سے لیکر مارچ ۱۹۰۷ء تک۔ دوسری مرتبہ اگست ۱۹۰۷ء سے فروری ۱۹۱۰ء تک اور تیسری مرتبہ اگست ۱۹۱۱ء سے مئی ۱۹۱۲ء تک

۱۹۱۲ء میں مولانا ابو الکلام آزاد نے کلکتہ سے الہلال نکالا چونکہ سید صاحب سے اُن کے خاص روابط تھے، اسلئے انہوں نے اس مجلہ کی ادارت قبول کر لی اور کلکتہ تشریف لے گئے۔ یہیں سے سید صاحب کی زندگی کا تیسرا دور شروع ہوتا ہے جو تا دم وفات قائم رہا۔

سید صاحب نے" استاد مرحوم کی صحبت اور تربیت میں آٹھ برس (۱۹۰۵ء تا ۱۹۱۳ء) مسلسل گذارے اور اس میں شک نہیں کہ استاد نے افادہ کا اور شاگرد نے استفادہ کا حق ادا کر دیا۔

فی الجملہ سید صاحب نے ایک سال تک مولانا ابو الکلام کے ساتھ الہلال کو ایڈیٹ کیا۔ اسکے بعد ۱۹۱۳ء میں دکن کالج پونا میں عربی فارسی کی پروفیسری قبول کر لی اور پونا چلے گئے۔ سید صاحب چونکہ بالطبع منکسر المزاج اور نام و نمود کی خواہش سے بے نیاز تھے جسکی تائید شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی مدیر مجلہ معارف کے اس فقرہ سے ہوتی ہے" اس کو خدا نے حقیقی بڑائی بخشی تھی

اسلئے وہ مصنوعی اور خود ساختہ بڑائی کے پیچھے کبھی نہیں پڑا، اور دنیاوی جاہ و اقتدار کی ہوس سے ہمیشہ دور کبر و نخوت سے نفور رہا" اسلئے انہوں نے مولانا ابوالکلام سے کبھی نہیں کہا کہ "الہلال" کے سرورق پر اپنے ساتھ میرا نام بھی بحیثیت جوائنٹ اڈیٹر تحریر کیا کریں، لیکن دنیا جانتی ہے کہ الہلال کی ترتیب اور دلکشی میں مولانا سے زیادہ سید صاحب کی قابلیت کو دخل تھا۔ اسکا ثبوت یہ ہے کہ جب ۱۹۱۳ء میں سید صاحب پونا تشریف لے گئے تو تھوڑے ہی دنوں کے بعد مولانا کو محسوس ہونے لگا کہ:

تھی وہ اک شخص کے تصور سے
اب وہ رعنائی خیال کہاں

چنانچہ ۹ جنوری ۱۹۱۴ء کو مولانا نے سید صاحب کو ایک طویل خط لکھا جو دسمبر ۱۹۵۳ء کے معارف میں شائع ہوا ہے۔ اس میں لکھتے ہیں:-

"آپ نے پونا میں پروفیسری قبول کرلی حالانکہ خدا نے آپکو درس و تعلیم مدارس سے زیادہ عظیم الشان کاموں کے لئے بنایا ہے۔ خدا کے لئے میری سنیئے۔ میں آپ کی عزت کرتا ہوں اور خدا شاھد ہے کہ آپ کی محبت اپنے دل میں رکھتا ہوں۔ کیا حاصل اس سے کہ آپ نے چند طلبہ کو عربی فارسی سکھلا دی۔ آپ میں وہ قابلیت موجود ہے کہ آپ لاکھوں نفوس کو زندگی سکھلا سکتے ہیں"

"آپ اگر الہلال بالکل لے لیجئے اور جس طرح جی چاہے اسے ایڈٹ کیجئے۔ صرف اپنے مضامین دیدیا کرونگا۔ اور کچھ تعلق نہو گا آپ معاً وہاں استعفا دیدیں اور کلکتہ چلے آئیں"

ابوالکلام کان اللہ لہ

بانا آدم بر سر مطلب، ۷ نومبر ۱۹۱۴ء کو مولانا شبلی مرحوم مرض الموت میں مبتلا ہوئے۔ ۱۵ نومبر کو مولانا نے سید صاحب کو پونا، کلکتہ، اور دیسنہ کے پتے سے تار بھجوائے۔ سید صاحب کہتے ہیں کہ میں اسوقت بانکی پور میں تھا مجھے ان تاروں میں سے کوئی تار نہیں ملا لیکن بلا اطلاع دل نے خود زیارت کی کشش ظاہر کی اور میں صبح سویرے کسی سے کہے بغیر چل کھڑا ہوا۔ لیکن آہ! جب ۱۵ نومبر کی شام کو میں پہونچا تو طاقت جواب دے چکی تھی۔ مولانا نے آنکھیں کھولکر حسرت سے میری طرف دیکھا اور دونوں ہاتھوں سے اشارہ کیا کہ "اب کیا رہا" لوگوں نے جواہر مہرہ گھولکر ایک چمچہ پلا دیا تو جسم میں فوری طاقت آگئی، تو معاہدہ کے طور پر میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر فرمایا "سیرت میری تمام عمر کی کمائی ہے۔ سب کام چھوڑکر سیرت تیار کرد" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا ضرور! ضرور!!

دنیا نے دیکھ لیا کہ شاگرد نے اپنے شفیق استاد کی وصیت کی ایسے انداز میں تعمیل کی کہ رہتی دنیا تک اسکا نقش زائل نہو سکیگا۔ چنانچہ ۱۹۱۵ء سے سید صاحب نے دار المصنفین، اعظم گڈھ کو اپنی علمی، مذہبی اور قومی سرگرمیوں کا مرکز بنالیا۔

دار المصنفین کی ادبی اور علمی سرگرمیوں سے قوم کو روشناس کرنے اور مسلمانوں میں سنجیدہ لٹریچر کے مطالعہ کا ذوق پیدا کرنے کے لئے سید صاحب نے ۱۹۱۶ء میں معارف جاری کیا جو اسوقت سے لیکر آجتک نکل رہا ہے اور اسی روش پر قائم ہے۔

۱۹۱۷ء میں بنگال علماء کانفرنس کے صدر منتخب ہوئے ۱۹۲۰ء میں وفد خلافت کے رکن کی حیثیت سے لندن گئے۔ ۱۹۲۱ء میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے رکن منتخب ہوئے ۱۹۲۴ء میں وفد خلافت کے صدر ہوکر حجاز تشریف لے گئے ۱۹۲۵ء میں راقم الحروف نے اثبات واجب الوجود پر ایک مضمون معارف میں اشاعت کے لئے سید صاحب کی خدمت میں بھیجا، اور درخواست کی اشاعت سے قبل اسے بنظر اصلاح دیکھ لیا جائے۔ سید صاحب نے اس مضمون کو اپنے ادارتی نوٹ کے ساتھ شائع فرماکر میری حوصلہ افزائی فرمائی اس طرح سید صاحب سے غائبانہ تعارف کی ابتداء ہوئی ـــــ

اسکے بعد میں نے چار سال تک معارف میں سید صاحب کے ایماء سے فلسفہ اور الٰہیات پر مضامین لکھکر بھیجے جو انکی اصلاح کے بعد مختلف اوقات میں شائع ہوتے۔

۱۹۲۵ء میں انجمن حمایت اسلام لاہور نے ڈاکٹر اقبال مرحوم کے ایماء سے اشاعت اسلام کالج قایم کیا جسکا مقصد انگریزی دان مسلمان نوجوانوں کو

تبلیغ و اشاعت اسلام کے لئے تیار کرنا تھا۔ اور ڈاکٹر صاحب کے ارشاد کے مطابق راقم الحروف کو اس کالج کا پرنسپل مقرر کیا گیا۔

میں نے ڈاکٹر صاحب کے مشورہ سے کالج کا نصاب تعلیم مرتب کر کے سید صاحب کی خدمت میں منظوری کے لئے بھیجا۔ مرحوم نے اس سلسلہ میں میری کافی رہنمائی فرمائی اور سیرت النبی جلد اول و دوم اور ارض القرآن کا نصاب میں اضافہ فرمایا نیز مجھے ہدایت فرمائی کہ ہندستان کی تاریخ پڑھاتے وقت اُن صوفیائے کرام کے حالات سے بھی طلبہ کو آگاہ کروں جنہوں نے ہندستان میں اسلام کی تبلیغ کی ہے۔

سید صاحب کے اس ارشاد نے مجھے بزرگان دین کے سوانح حیات اور ملفوظات کے مطالعہ کی طرف مائل کیا، اور اس مطالعہ کی بدولت خود میری زندگی میں ایک انقلاب عظیم رونما ہو گیا۔ جسکی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے تاہم اتنا کہہ سکتا ہوں کہ مجھ پر سید صاحب کا یہ وہ احسان ہے جس سے میں کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس طرح میں فلسفہ اور کلام کے صحرائے خار دار سے نکلکر تصوف کی سرسبز اور شاداب وادی میں آ گیا۔

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ۝

۱۹۳۳ء میں نادر شاہ کی دعوت پر سید صاحب کابل تشریف لے گئے تاکہ وہاں کے علماء کو جدید نصاب تعلیم کی تدوین میں مشورہ دے سکیں۔ اس سفر کا حال "سفر نامہ افغانستان" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

۱۹۳۵ء میں سید صاحب مدرسۃ البنات جالندھر کی استدعا پر اسکے سالانہ جلسہ میں شرکت کے لئے تشریف لائے۔ کارکنان مدرسہ اور عمائدین شہر نے بڑی گرمجوشی کے ساتھ سید صاحب کا استقبال کیا۔ اسی جلسہ میں راقم الحروف کو زندگی میں پہلی مرتبہ سید صاحب کی زیارت کی سعادت حاصل ہوئی۔ میں نے اس سے پہلے ایسا دلکش چہرہ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اُنکے تقدس کا جو اثر اسوقت میرے دل پر قائم ہوا۔ اس میں آجتک کمی نہیں ہوئی ہے۔ اسی جلسہ میں راقم الحروف کو سید صاحب کی صدارت میں تقریر کرنے کا عزت بھی حاصل ہوئی۔ تعلیم نسواں پر اپنی تقریر شروع کرنے سے پہلے صاحب موصوف نے میری حوصلہ افزائی کے لئے چند تحسین آمیز کلمات بھی ارشاد فرمائے۔ یہ سب انکی بزرگانہ شفقت تھی۔

۱۹۴۱ء میں علی گڈھ یونیورسٹی نے سید صاحب کو ڈاکٹر آف لٹریچر کی ڈگری دیکر اپنی عزت میں اضافہ کیا۔ سید صاحب کا مرتبہ اس بات سے ظاہر ہے کہ انکی صحبت میں بیٹھنے والا "آدمیت" کی ڈگری حاصل کر لیتا تھا۔ اور لٹریچر تو "دبیت" کا ایک ادنیٰ شعبہ ہے سچ کہا ہے اقبال نے:

صحبت از علم کتابی خوشتر است   صحبتِ مردانِ حر آدم گر است

۱۹۴۵ء میں سید صاحب ریاست کے قاضی القضاۃ کی حیثیت سے بھوپال تشریف لائے۔ میں اس زمانہ میں وسط ہند اور سی پی میں تبلیغ و اشاعتِ اسلام کا نگراں تھا اور ریاست کوروائی میں مقیم تھا جو بھوپال سے اسی میل کے فاصلہ پر ہے۔ اس سلسلہ میں بھوپال بھی آمد و رفت رہتی تھی۔ کیونکہ ہندوؤں میں مفت تقسیم کرنے اور نو مسلموں کو نماز روزہ کے مسائل سے آگاہ کرنے کے لئے جو لٹریچر تیار کرتا تھا اسے بھوپال ہی میں چھپواتا تھا اس لئے سید صاحب سے شرف ملاقات حاصل کرنے کا موقع بھی ملجاتا تھا۔

۱۹۴۶ء میں نواب صاحب کوروائی کی دعوت پر سید صاحب سیرۃ النبی ؐ کے جلسہ میں کوروائی تشریف لائے اور سرور محل میں قیام فرمایا چونکہ میں بھی یہیں مقیم تھا اسلئے مجھے میزبانی کا شرف بھی حاصل ہوا اور خدمت کی سعادت بھی۔

سرور محل کے سامنے چھوٹی سی مسجد ہے جسکی تعمیر میں نواب صاحب نے مزدوروں کے ساتھ کام کیا تھا۔ اس مسجد میں سید صاحب نے فجر کی نماز کے بعد قرآن حکیم کا درس دیا۔ اور رات کے وقت سیرت کے جلسہ میں پہلے خاکسار نے اس موضوع پر لب کشائی کی جرأت کی، اسکے بعد سید صاحب قبلہ نے اپنے ارشاداتِ گرامی سے سامعین کو مستفید فرمایا۔ تین دن قیام کرنے کے بعد سید صاحب بھوپال تشریف لے گئے۔

دورانِ قیام کوروائی میں سید صاحب نے مجھ سے ارشاد فرمایا کہ تم نے ڈاکٹر اقبال کی برسوں صحبت اٹھائی ہے اسلئے تم مرحوم کے سوانح حیات

مرتب کرد یا اس طور کہ پہلے ماحول کی تصویر کھینچو پھر اس میں اقبال کی تاثیر سے رنگ آمیزی کرو تاکہ آیندہ نسلوں کے لئے مفید ثابت ہو سکے؛

سنہ ۱۹۴۹ء میں سید صاحب حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے اور ۲۴ جون سنہ ۱۹۵۰ء کو کراچی تشریف لائے۔ مستقل قیام کا ارادہ نہیں تھا لیکن مشیت ایزدی کو یہی منظور تھا کہ سرزمین کراچی ابدی آرامگاہ بنے اسلئے صاحب زادی کا اصرار واپسی کے ارادہ پر غالب آگیا۔

جنوری سنہ ۱۹۵۱ء میں مجھے کراچی میں ملاقات کی عزت اور مسرت حاصل ہوئی اور اس کا سلسلہ آخر وقت تک قایم رہا۔ میں ہمیشہ علمی مسائل اپنی نوٹ بک میں لکھکر لے جاتا تھا اور اُن کو موصوف کی خدمت میں پیش کر کے اپنی معلومات میں اضافہ کیا کرتا تھا۔ اور ضروری نوٹ اسیوقت ضبط تحریر میں لے آتا تھا۔ میں بخوف طوالت اپنے سوالات اور انکے جوابات تو اس مختصر مضمون میں درج نہیں کرسکتا لیکن اتنا ضرور لکھونگا کہ جب ۵۱ء شروع میں میں نے ایک آیت کا مطلب پوچھا تو فرمایا کہ

"تم ساری عمر مضمون نگاری کرتے رہے اور تمہاری تقریریں سننے کا بھی اتفاق ہوا ہے جو علم تم نے حاصل کیا ہے اُسکے اقتضاء پر عمل کب کرنا شروع کروگے؟ اگر تم میرے پاس اسلئے آتے ہو کہ کسی مضمون کی تیاری میں مجھ سے مدد لو تو اسکے لئے میں تیار نہیں ہوں ہاں اگر تم اس آیت کا مطلب اسلئے پوچھتے ہو کہ اس پر عمل کی کوشش کرو، تو میں ضرور تمہاری رہنمائی کرونگا"

اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ سید صاحب اپنے نیازمندوں کی زندگی میں کس قسم کا انقلاب پیدا کرنا چاہتے تھے۔

سید صاحب کی نصیحتوں میں سے یہ نصیحت ہر وقت میرے پیش نظر رہتی ہے اور انشاء اللہ وہ زمانہ دور نہیں ہے جب میں اس پر عمل کرنے کی سعادت حاصل کرونگا۔

ایک ملاقات کے دوران میں مجھ سے فرمایا کہ میں تمکو نصیحت کرتا ہوں کہ "کراچی کی کسی مسجد میں پاؤں توڑ کر بیٹھ جاؤ اور اپنا سارا وقت قرآن حکیم کے پڑھنے اور پڑھانے میں صرف کرو، تاکہ تمہاری دُنیا اور آخرت دونوں سنور جائیں"

سید صاحب کے احسانات میں سے ایک احسان یہ بھی ہے کہ انہوں نے ضرب کلیم۔ بال جبریل۔ اسرار خودی اور رموز بیخودی کے بعض مشکل ترین مقامات کے حل کرنے میں میری بروقت امداد فرمائی۔

اگست سنہ ۵۳ء میں آخری علالت کا سلسلہ شروع ہوا۔ ڈاکٹری تشخیص یہ تھی کہ دل کسی قدر پھیل گیا ہے۔ اس وجہ سے مرحوم کو تنفس میں تکلیف محسوس ہوتی تھی۔ اسی علالت میں سید صاحب نے ۲۲ نومبر سنہ ۵۳ء کو شام کے ۷½ بجے وفات پائی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی زندگی ہر اعتبار سے لائق رشک اور اس لئے قابلِ تقلید تھی۔ انہوں نے جو جگہ خالی کی ہے وہ مدتوں تک پُر نہیں ہوسکتی کیونکہ ایسا جامع حیثیات شخص کہیں مدتوں کے بعد پیدا ہوا کرتا ہے۔

میں نے ابتداہی میں اس بات کی وضاحت کردی ہے کہ میں اس مختصر مضمون میں مرحوم کے کمالات پر کماحقہ تبصرہ نہیں کرسکتا اس لئے صرف اس فقرہ پر اس مضمون کو ختم کرتا ہوں کہ میں سنہ ۱۹۱۲ء سے تا ایندم علماء سے استفادہ کر رہا ہوں لیکن سید صاحب کے علاوہ اور کسی عالم کی خدمت میں حاضر ہو کر مجھے یہ محسوس نہیں ہوا کہ میں ایک متقی اور عالم باعمل انسان کی خدمت میں حاضر ہوں الحق، جو نورانیت مجھے اُن کے چہرہ میں درخشاں نظر آئی وہ میں نے بہت ہی کم بزرگوں کے چہروں میں پائی۔ اللہ مجھے اور میرے دوستوں کو اُن کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

سیّد صاحب رحؒ یورپ میں

مُرتبہ :- مشیر الحق بحری آبادی

جنگ عظیم اول ۱۹۱۴ء کے بعد دنیا میں ایک انقلاب سا آگیا تھا، یورپین حکومتیں ایک پلان کے مطابق آہستہ آہستہ اسلامی حکومتوں کو صفحۂ ہستی سے مٹاتی چلی جارہی تھیں، جزیرہ نمائے عرب میں انگریزوں نے شریف حسین کو سبز باغ دکھا کر بغاوت کرائی، اور عرب کے ٹکڑے ٹکڑے کردیئے —— یہودیوں کو اپنا ہمنوا بنانے کیلئے فلسطین کی رشوت دی، روس میں انھیں دنوں سرخ انقلاب آیا تھا، اسکے ماتحت اسلامی ریاستوں کی تقدیر کے فیصلہ کا دُنیا انتظار کر رہی تھی۔ ترکی کی عظیم الشان سلطنت کا جو حصہ افریقہ میں تھا اسے اٹلی غصب کرچکا تھا، یورپ میں ترکی کے صوبے آسٹریا، بلغاریہ، سرویا، مانٹی نیگرو اور یونان میں بٹ چکے تھے۔ سب سے بڑا امر زیر غور یہ تھا کہ ترکی کا بقیہ یورپی مقبوضہ تھریس کس کو دیا جائے، قسطنطنیہ پر کون قابض ہو۔ اناطولیہ میں سمرنا گویا یونانیوں کو مل ہی چکا تھا اور بقیہ اناطولیہ کی سپردگی کا مسئلہ در پیش تھا۔

اس صورت حال سے ساری دُنیائے اسلام میں زلزلہ برپا تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے اسوقت ہندوستان کے مسلمانوں کو چند بہادر، دردمند، اور حساس ہیرو عنایت کئے تھے جو اپنی جانوں پر کھیل کر کھڑے ہوئے اور مجلس خلافت کے نام سے مرکزی مجلس بمبئی میں قائم کی جسکی شاخیں دیکھتے دیکھتے سارے ہندوستان میں قائم ہوگئیں۔ تحریک خلافت اتنی منظم اور جاندار تحریک تھی کہ اسکو دبانے کی، حکومت کی ساری تدبیریں بیکار ہورہی تھیں اور تمام دُنیائے اسلام کی نظریں اسوقت ہندوستان کے مسلمانوں اور جمیعتہ خلافت پر لگی ہوئی تھیں۔

دسمبر ۱۹۱۹ء میں خلافت کے اجلاس منعقدہ امرتسر میں طے ہوا کہ ہندوستان کیطرف سے چند آدمیوں کا ایک وفد انگلینڈ اور یورپ کے دوسرے اتحادی ملکوں میں بھیجا جائے —— وفد کے مطالبات حسب ذیل تھے:-

(۱) - ترکی کے سلطان کی حکومت، بحیثیت اسکے کہ وہ مسلمانوں کا خلیفہ ہے، قسطنطنیہ، تھریس اور اناطولیہ اور آرمینیا میں مستقل اور آزاد رکھی جائے۔

(۲) - حجاز، شام، فلسطین اور عراق کو جہاں مسلمانوں کے مقدس مقامات ہیں غیر اسلامی اقتدار سے محفوظ رکھا جائے۔

(۳) - ہندوستان کی آزادی کے لئے رائے عامہ ہموار کی جائے کیونکہ بلاد اسلامیہ کا تحفظ ہندوستان کی آزادی کے بغیر ممکن نہیں۔

اس وفد کیلئے ہندوستان سے مولانا محمد علی مرحوم، سید حسین صاحب اور مولانا سید سلیمان صاحب ندوی مرحوم کا بحیثیت ارکان انتخاب ہوا۔ انکے علاوہ بھی کچھ لوگ تھے جو بعد میں گئے یا لندن میں پہلے سے مقیم تھے۔

دوران سفر میں لندن، پیرس اور اٹلی کے راستہ سے سید صاحب مرحوم نے اپنے بعض اعزہ اور احباب کو خطوط لکھے تھے جو اسوقت کے اخبارات میں شائع ہوئے تھے اور تقریباً ۳۰ برس بعد پچھلے سال ان خطوط کا مجموعہ کراچی سے حضرت سید صاحب کی حیات

ہیں" برید فرنگ" کے نام سے شائع ہوا ہے۔
زیر نظر سفرنامہ انھیں خطوط سے میں نے مرتب کیا ہے چونکہ ان خطوط کو لکھے ۳۰ برس کا عرصہ گزر چکا ہے جسمیں دنیا کہیں سے کہیں پہونچ چکی ہے۔ جس مقصد کیلئے وفد یورپ گیا تھا وہ مقصد بھی لوگ بھول چکے ہیں۔ اسلئے یہ خطوط اب ایک تاریخ کا کام دیتے ہیں۔ لیکن اُنھیں خطوں میں بہت سے اشارات ایسے بھی ہیں جن سے مغربی تہذیب، مغربی افکار، مغربی عادات، مغربی سیاست غرضیکہ پورے مغرب کا اندازہ ہوتا ہے۔ میں نے عام طور سے انھیں تاثرات اور واقعات کو منتخب کیا ہے جو اتنی مدت گزر جانے کے بعد بھی "نئے" ہیں۔
میں نے اپنی تئیں پوری کوشش کی ہے کہ سفرنامہ کا تسلسل کہیں ٹوٹنے نہ پائے اور دلچسپی باقی رہے پھر بھی ممکن ہے کہ آپ کہیں پر جھول محسوس کریں ـــــ لیکن اگر آپ میری دشواریوں کو پیش نظر رکھیں گے تو آپ کو کہیں بھی سقم محسوس نہ ہوگا۔ مجھے پوری کتاب کو پڑھ کر نشانات لگانے پڑے، حسب منشا ٹکڑوں کا انتخاب کرنا پڑا۔ کہیں کہیں تو ایسا ہوا ہے کہ ایک سطر ایک خط میں ملی تو آگے کی چار سطریں اسی مضمون کے کسی دوسرے خط سے لینی پڑیں۔ اور بقیہ مضمون کسی تیسرے خط سے ــــــ لیکن اتنا اطمینان رکھئے کہ اس "مقراض بازی" میں کہیں بھی سید صاحب مرحوم کے "منشاء" کو مجروح نہیں ہونے دیا۔
زیر نظر سفرنامہ کا ایک ایک لفظ حضرت سید صاحب کے قلم کا ہے۔ میں نے پوری کتاب میں سے اسے منتخب کرکے صرف مرتب کیا ہے اور بس۔"

---

۲۹ جنوری ۱۹۲۰ء کی شام کو ہم لوگ کلیان پہونچے۔ تھوڑی دیر ٹھہر کر بذریعہ اسپیشل بمبئی لائے گئے۔ اسٹیشن سے لیکر مستقر تک آدمیوں کا وہ ہجوم تھا کہ لوگ کہتے ہیں کہ بمبئی کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ ہے
۳۰ کو بمبئی سے ہنگریا جہاز ۸ بجے صبح روانہ ہوا۔ جہاز میں اب تک تلاطم نہیں، اسلئے چکر نہیں آیا، ہر طرح کا آرام ہے لیکن پیٹ کی بڑی مار ہے۔ حالانکہ چار وقت کھانا ملتا ہے۔ صبح کو چائے۔ ۸ بجے تک بریک فاسٹ، ۱ بجے ٹفن اور ۷ بجے شام کو ڈنر۔ لیکن بدمزہ، بدبو، خام ـــــ جہاز میں انگریزی مذاق کا بدبودار کھانا سب سے زیادہ تکلیف دہ ہے ـــــ کل محمد علی صاحب نے خود باورچی خانہ میں جاکر گوشت بھونا۔
جس جہاز پر ہم جارہے ہیں یہ نہایت سُست ہے دن رات میں صرف ۲۸۰ میل چلتا ہے۔ مگر اس کے کمرے اور سامان واسباب نہایت اچھے ہیں۔ ہر کمرے میں دو پلنگ مع بستر، کپڑے رکھنے کی الماریاں، ہاتھ منہ دھونے کے لئے پائپ مع طشت، ایک کرسی ایک برقی پنکھا تین برقی روشنی دو کھونٹیاں ـــــ ہم اکثر یہ بھول جاتے ہیں کہ ہمارا سفر کسی خوفناک سمندر کے اندر ہے جسکی ایک موج تلاطم ہماری زندگی ختم کرسکتی ہے۔ سبحان اللذی سخرلنا ھذا وما کنالہ مقرنین۔
لوگ ڈراتے تھے کہ بحر احمر میں یوں گرمی ہے یوں تمازت ہے لیکن خدا کا کرنا دیکھئے کہ یہاں سیکڑوں میل تک یعنی یہاں تک کہ کل شام کو سوئز میں قدم رکھیں گے۔ گرمی کا نام ونشان نہیں۔ سردی بلکہ جاڑا تک موجود ہے ـــــ لکھنؤ سے سخت سردی میں نکلا۔ بمبئی پہونچکر جاڑے کے کپڑے بھاری ہوگئے باریک ململ کا کرتا نکال کر پہنا جو احتیاطاً اس لئے رکھ لیا تھا کہ واپسی گرمی میں ہوگی تو ہندوستان کی ریل میں پہنوں گا۔ جہاز پر بیٹھکر کراچی پہونچا۔ جہاز پر میرا لباس کسی قدر تغیر کے بعد یہ رہا ہے، سر پر ترکی ٹوپی، بدن پر دوہری اونی بنیائن کے اوپر قمیص سخت اور سفید کالر، اسکے اوپر سیاہ شیروانی نصف پنڈلی تک لٹکی ہوئی، پاؤں میں اونی پاجامہ کے اوپر سیاہ پتلون

سیاہ شو یا بوٹ۔

جہاز جب مصّوع میں لنگر انداز ہوا تو ہندوستانی آبادی کو دیکھ کر تعجب ہوا۔ اُردو کی فرمانروائی دیکھئے کہ افریقہ کے ریگستانوں تک وسیع ہے۔ مصوع سے نکل کر سمندر میں اسقدر تلاطم ہوا کہ ۴۸ گھنٹے تک جہاز مثل جھولا کے محسوس ہوتا تھا۔ چپ چاپ پڑے رہے مگر دوران یا قے نہیں ہوئی۔ کل سے بحمداللہ سکون ہے۔ کل شام کو جہاز پہونچیگا۔

رات بھر جہاز عدن کے ساحل پر کھڑا رہا اُترنے کی بڑی کوشش کی آخر ۲ بجے شب کو مایوس ہو کر ہم لوگ بستر پہ گئے کیونکہ ڈاکٹر کی اجازت کے بغیر ساحل پر اترنا ممکن نہیں اور ڈاکٹر صاحب سات بجے سے پہلے اپنے آرام خانہ سے باہر نہیں نکل سکتے بہرحال دُور ہی سے کھڑے ہو کر اس سرزمین اقدس کے ایک گوشہ کی زیارت کر لی۔

حسرت پہ اس مسافر بیکس کے روئیے
بیٹھا ہوا ہے تھک کے جو منزل کے سامنے

پورٹ سعید میں جو مصر کی آخری سرحد ہے اور جہاں سے یورپ کا پہلا قدم شروع ہوتا ہے صرف ایک شب بسر کی جامع عباسی میں نماز پڑھی، یہ سنکر ہندوستانی (اور پاکستانی بھی۔ مرتب) مسلمانوں کو تعجب ہو گا کہ ایک ہی صف میں حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی نماز پڑھ رہے تھے اور امام سب کی رعایت کر رہا تھا۔

پورٹ سعید سے نکلے تو بحر متوسط میں دو روز اس قدر قیامت خیزیاں رہیں کہ تکیہ سے سر نہ اُٹھا سکا، آخر یورپ کی پہلی سرزمین برنڈزی (اٹلی) آئی۔ یہاں پہونچ کر ہمارے جہاز کے ملازمین اور ملاحوں نے اسٹرائیک کر دی بمشکل وہ وینس پہونچانے پر راضی ہوئے۔ دوسرے دن ایک بجے کے قریب وینس آیا لیکن ساحل تک پہونچتے پہونچتے شام ہو گئی۔ یہ شہر چھوٹے چھوٹے جزیروں کا ایک جال ہے۔ ہر جزیرے سے گزرتے ہوئے آخر اس بڑے جزیرے کے قریب لنگر انداز ہوئے جو اصل شہر ہے، یہ بڑا جزیرہ بھی بیچ بیچ کی چھوٹی چھوٹی سینکڑوں نہروں میں منقسم ہے جن کو جا بجا پلوں کے ذریعہ باہم ایک کیا ہے، بجائے سڑکوں کے نہریں ہیں ایک جگہ سے دوسری جگہ کشتیوں پر آتے جاتے ہیں چنانچہ ہم ہوٹل کشتی پر گئے۔ اسٹیشن بھی کشتی پر گئے۔ تمام شہر یادگار تاریخی عمارات کا مرقع ہے۔ تمام راستے پتھروں کے بنے ہیں۔ یہاں کا ہر پتھر تاریخ کا ایک صفحہ ہے گویا دہلی مرحوم کا نقش مرقوم ہے لیکن افسوس کہ دہلی ویران اور منہدم ہے اور یہ عمارات ابتک زندہ اور قائم ہیں۔

وینس سے سوئٹزرلینڈ ہو کر ہملوگ پیرس کو روانہ ہوئے، بیچ میں ریلوے ملازمین نے اسٹرائیک کر دی بمشکل جسطرح بنا بھاری اسباب کو چھوڑ کر پیرس پہونچے۔ ارادہ تھا کہ پیرس میں کچھ دن قیام ہو گا مگر وہاں پہونچکر اخبارات سے معلوم ہوا کہ کل ہی شب کو ہاؤس آف کامنس میں مسئلہ ٹرکی پر بحث ہونے والی ہے اسلئے دوسرے ہی دن جسطرح بنا بھاگ کر انگلینڈ پہونچے۔ اسٹیشن سے سیدھے ہاؤس گئے۔ پیرس سے تار دیدیا گیا تھا ہمارے لئے ممتاز مہمانوں کی گیلری میں نشست کا انتظام کر دیا گیا تھا لیکن ہم لوگ اس وقت پہونچے جب آدھا مناظرہ ختم ہو چکا تھا، تمام ممبروں کی تقریریں تعصب سے لبریز تھیں، ہم مسلمانوں کو تو تعصب پر طعنہ دیا جاتا ہے مگر یہ کیا چیز ہے جو تمام یورپ میں نظر آ رہی ہے۔

لندن میں سردی اوج شباب پر ہے۔ شب و روز کوئلہ کی گرمی اور بجلی کی روشنی آفتاب کا کام دیتی ہے تمام شہر، تمام مکانات انجنوں اور چمنیوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ ہر کمرہ میں آتشدان مع چمنی کے ہے اسی سبب سے بیسیوں احتیاط اور تدابیر کے باوجود ہاتھ مُنہ جب دُھوئیے طشت میں سیاہ پانی گرے گا۔ ایک کالر اور کف دوسرے دن کام نہیں دیتا۔ انجن اور آتش دان کے سبب اسقدر

دھواں پھیلتا ہے کہ ذرا کسی چیز کو ہاتھ لگائیے تو ہاتھ کالے ہوجاتے ہیں۔ شاید اسی لئے سیاہ لباس انگلستان کا کیا بلکہ سارے یورپ کا مخصوص لباس قرار پاگیا ہے۔

یہاں دولت کی فراوانی اور اخلاق کی آزادی حد تخمین سے باہر ہے۔ ہر عورت نیم برہنہ نظر آئیگی اس سردی کے عالم میں ڈنر کی میز پر باریک ریشمی یا جالی دار کپڑا پشت و سینہ پر ڈال کر، سینہ تاحدِ مقیاس شباب اور پیٹھ نصف یا تمام تر برہنہ، نیم آستین یا ہاتھ بالکل برہنہ، ——— اور کبھی اس لباس میں آنا کہ پشت پر ایک تار نہیں، کہاں تک حفظان صحت اور اصول اخلاق کے لحاظ سے جائز ہے۔ ایک دلنشین خاتون اسی لباس میں جہاز پر محفل رقص میں شریک تھیں ان کو جو سردی لگی تو تین چار روز تک رونق بزم نہ ہوسکیں۔ پاؤں میں نصف ساق تک پاتابہ اس قدر پتلا اب پہنا جاتا ہے کہ رنگت چھن چھن کر باہر نمایاں ہو خاص خاص ہوٹل میں جہاں تمام کام خواتین سے متعلق ہیں وہاں سروس کرتے ہوئے عہد و پیمان کا استحکام ہوتا ہے، راستوں میں خصوصاً شب کو کسی نیک سرشت کا متانت کیساتھ چلنا مشکل ہے۔ اور غالباً آپ مجھے نیک سرشت اور متین تصور کرتے ہونگے۔ نتیجہ اب نکال لیجئے۔ استغفراللہ۔

جس مکان میں ہم لوگ مقیم ہیں اسکا نام البرٹ ہال مینشن ہے۔ پرنس البرٹ، ایڈورڈ ہشتم کے باپ کا نام آپ نے سنا ہوگا۔ البرٹ ہال انگلینڈ کا سب سے بڑا اور مشہور ترین ہال ہے جسمیں دس ہزار آدمیوں کی نشست ہے۔ یہ ہال ہمارے مکان کے پیچھے ہے۔ مکان کے سامنے باغ ہے اس باغ میں البرٹ میموریل ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک عظیم الشان چبوترہ پر ایک اسٹیچو قائم ہے۔ چبوترہ کے چاروں طرف گوشوں پر دنیا کے چار براعظم، ایشیا، افریقہ، امریکہ، اور یورپ کے باشندوں کے مع انکے اقلیمی خصوصیتوں کے مجسمے ہیں۔ ہندوستان ہاتھی پر سوار ہے۔ افریقہ اونٹ پر۔ امریکہ بھینس پر اور یورپ، گائے پر۔ اس باغ کو طے کیجئے تو دوسرا باغ شروع ہوگا۔ جسکا نام نامی و اسم گرامی ہائڈ پارک ہے اور جو چار دانگ عالم میں اپنی خصوصیات کیلئے مشہور ہے۔ یہاں اکثر اوقات لوگوں کو بے حجاب جلوے نظر آتے ہیں جا بجا میدانوں میں، درختوں کی جڑوں میں، کنج باغ میں، جھاڑیوں میں آپ کو دو، دو کرسیاں بچھی ہوئی ملینگی۔ قرآن کی آیت پاک۔ وخلقنا کل شئی زوجین۔ کی تفسیر کا عملی مشاہدہ آپکو یہیں ہوگا۔ اسکے بیچ میں ایک نہر جاری ہے جسمیں سینکڑوں کشتیاں پڑی ہیں ہر کشتی کسی مرد یا صنف نازک کی انگلیوں سے حرکت کرتی ہوئی کسی نہ کسی جھاڑی کے سائے میں پہونچ کر گھنٹوں آرام کرتی ہے اور انواع و اقسام کے لذائذ روحانی کا منظر دکھاتی ہے ہر کس و ناکس چلتے پھرتے یہ منظر دیکھ سکتا ہے۔ مگر آپ یہ نہ سمجھئے کہ بداخلاقی کے ان مرتکبوں کی گرفت ملک کی اعلیٰ متمدن حکومت کیطرف سے قانوناً نہیں ہوتی۔ نہیں جناب! باغ کے صدر دروازہ پر آپکو جلی حرفوں میں یہ قانون تختیوں پر لکھا نظر آئیگا کہ "پبلک منظر کو شرمناک واقعہ کے عملی مشاہدہ سے متاثر نہ کیا جائے" مگر اس قانون کی عملی تفسیر یہ ہے کہ ہر ممکن طریق انداز عمل سے ہر رہ رو کو دعوت نظارہ دی جائے۔ ارضی جنت کے اس احاطہ میں آکر فرشتہ غیب کی جو پہلی آواز آپکے کانوں میں آئیگی وہ۔ اعملوا ما شئتم۔ ہے انگریزوں کو فخر ہے کہ انکے اور صرف انکے ملک کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ یہاں قانوناً فاحشہ کا وجود نہیں لیکن عملاً انکو یہ بھی فخر حاصل ہے کہ انکے ملک کا کوئی راستہ، گلی، چوراہہ، باغ، دریا غرضکہ ہر وہ مقام جہاں کوئی مادی جسم رہ گزر پاسکتا ہو اس "شریف طبقہ" کے وجود سے محروم نہیں۔

بحمد اللہ ابتک سب "خیریت" ہے "مقناطیس" کی قوت کشش میں شک نہیں لیکن پہلے "لوہا" چاہئے۔ اس سے محرومی ہے پھر وجود مقناطیس ایک تماشہ سے زیادہ نہیں ——— اور کچھ سنا ہے یہاں بعض سینما میں ہمارے منظر و مرقع دکھائے جارہے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہاں کی بداخلاقی سے متاثر نہ ہونا اولیائے کرام کا کام ہے اور مجھے فخر ہے کہ اس حیثیت سے میں "طائفہ عالیہ" میں داخل ہوں۔

میری لال (ترکی) ٹوپی بھی ولایت میں عجائب المخلوقات میں سے ہے۔ انگلینڈ میں تو جدھر نکلتا ہوں تماشا بن جاتا ہوں کیونکہ وہاں

ریاض کراچی (۹۱) مارچ ۱۹۵۴ء

لال ٹوپی اور نیچی شروانی کسی نے کلبے کو دیکھی ہوگی۔ مشرقی مسلمان اقوام میں سے انگلینڈ آنیوالے صرف ہندوستانی مسلمان ہیں جو بمبئی ہی سے "صاحب" بنکر روانہ ہوتے ہیں اور اکثر تو گھر ہی میں "دیسی صاحب" بن لیتے ہیں تب "ولایتی صاحب" بننے آتے ہیں ــــ بہرحال میری لال ٹوپی یہاں نگاہوں کا مرکز ہے۔ لندن سے باہر ایک اسٹیشن پہ اترا تو سڑک پہ ایک خاکروب "صاحب" جھاڑو دے رہے تھے لال ٹوپی دیکھ کر مسکرائے پھر خراماں خراماں میری طرف آئے اور پوچھا "بغدادی؟" میں نے کہا "نہیں۔ ہندی" ــــ معلوم ہوا کہ یہ صاحب بھرتی ہو کر عراق گئے تھے اور بغداد کی جنگ میں شریک تھے وہاں انکو یہ لال ٹوپی نظر آئی تھی۔ اب انھوں نے یہ سمجھ لیا کہ جسکے سر پر لال ٹوپی ہو۔ فھو البغدادی۔

ایک جلسہ میں ایک صاحب نے میرے لباس کو تعجب کی نگاہ سے دیکھ کر پوچھا کہ کہاں سے آتے ہو؟ میں نے کہا غلاموں کے ملک سے۔ اس نے کہا ہندوستان! میں نے دل میں کہا اللہ اکبر، ہمارا وطن اپنی غلامی میں اسقدر شہرۂ آفاق ہے کہ لوگ اسکی حقیقت کو اس مجاز کے پردہ میں بھی سمجھ جاتے ہیں۔

* * * *

یہاں کے مصارف بہت بڑھ رہے ہیں۔ جب سے لندن آئے ہیں ایک ماہ میں تین مکان بدل چکے ہیں۔ اب یکم اپریل کو چوتھے مکان میں جائینگے۔ نہ صرف انگلینڈ بلکہ یورپ میں گرانی کا عالم یہ ہے کہ گنی کی قیمت گویا ہمارے روپے کے اور شلنگ کی ہمارے آنے کے برابر ہے۔ بخشش یا مفت کا انعام جسکے نے ہم ایشیائی بدنام ہیں وہ یہاں ٹپ کے نام سے مشہور ہے اور اس کثرت سے ہے کہ آدمی گھبرا اٹھتا ہے، آپ ہوٹل میں کھانا کھانے گئے، باہر کمرہ میں کوٹ اتار کر نوکر کو دیا اندر میز پر کھانا کھایا، کھانے کے بعد جس نوکر نے آپکو میز پر سرو کیا اس کو دیجئے، باہر آکر جس نے کوٹ اتارا اسکو دیجئے۔ دروازہ سے نکل کر دربان جس نے دروازہ کھول کر آپ کیلئے موٹر منگوایا اسکو دیجئے۔ پولس اور ریلوے ملازم تک اسی کے منتظر رہتے ہیں اور اس خوشی سے اسکو قبول کرتے ہیں گویا وہ اپنا حق پا رہے ہیں۔

یہاں کا پونڈ قدر و منزلت میں آپکے روپئے کے برابر ہے یہاں کا شلنگ آپکے آنے کے برابر اور یہاں کا پنس آپکے پیسوں کے برابر ہے۔ عام بول چال کی زبان میں ان سکوں کا نام اسی بے وقعتی سے لیا جاتا ہے جیسے روپئے، آنے، پائی کا آپکے ملک میں۔ پھر بھی یہاں کے مزدور غریب ہندوستان کے متوسطین سے بہتر ہیں، طرز لباس، سکونت اور ظاہری نمائش کے اعتبار سے آپ تمیز نہیں کر سکتے کہ امیر کون ہے اور غریب کون ــــ وہ با تکلف اور بھڑکدار لباس اور آراستہ کمرے آپ محنت و مزدوری کرنیوالوں کے دیکھینگے کہ وہ ہمارے یہاں کے امراء کو نصیب نہیں۔ ہمارا نوکر ایک پونڈ فی ہفتہ پاتا ہے، ریشمی پائتابے سے کم تو کسی راستہ چلنے والی عورت کے پاؤں میں بھی نہ پائینگے۔ بمبئی اور کلکتہ کے مکانات پر انگلستان کے مکانات کو قیاس کر لیجئے۔ رات کو تھیٹر اور سینما دیکھنے کیلئے ٹکٹ گھر سے لیکر دور تک سڑک پر لوگوں کی صف دن سے لگی رہتی ہے۔ جو پوشاک یہاں نوکر پہنتے ہیں وہ آپ کے یہاں کے صاحب بنے ہوئے لوگ فخراً پہنتے ہیں، قالین و مخمل پاؤں کے نیچے دروازہ سے لیکر کمرہ تک آپ گھر گھر پائینگے۔ گھروں کی آرائش و زیبائش مشرقی قصر و ایوان کو مات کرتی ہے۔ کمتر کوئی ہاتھ قیمتی پتھر کی انگوٹھی سے خالی ہوگا۔ ہر بیس پچیس قدم پر آپ جوہری کی دوکان پائینگے۔ سونے چاندی کے سامان دیکھینگے۔ موٹر سے نیچے کوئی پاؤں نہیں رکھتا۔

سوال یہ ہے کہ دولت کی یہ بہتات آئی کہاں سے؟ کیا ہماری جیبوں سے؟ عرب شاعر متنبی کہتا ہے ــــ مصائب قوم عند قوم فوائد ــــ یعنی ایک قوم کی مصیبت کے معنی ہی دوسری قوم کی نعمت کے ہیں۔ ایشیا لٹ کر یورپ آباد ہوا ہے۔ ہمارے گھر

خالی ہوئے ہیں تو یہاں کے ہوٹلوں اور ریستورانوں میں یہ چہل پہل ہے ہمارے گھر غم خانے ہیں تب یہاں یہ عشرت خانے سجے ہیں۔ بس اصلی چیز سود لیتی ہے۔ اور بس ـــــ ایک مقرر نے ایک جلسہ میں لندن کی دولت وحشمت سے معمور تجارت خانوں اور ایوانوں کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ دولت جو لندن میں نہیں سما سکتی کہاں سے آئی ہے؟ پھر خود ہی جواب دیا، آئرلینڈ، مصر اور ہندوستان کے فقیروں کی جھولیوں سے۔

مسلسل جنگ نے تمام یورپ کو تھکا دیا ہے۔ بجز مدبرترین ممالک، مزید خونریزی کا یہاں کوئی بھی خواہاں نہیں، اشخاص سے بڑھکر انجمنوں تک نوبت پہونچتی ہے۔ دنیا میں امن وآرام پھیلانے کی غرض سے متعدد انجمنیں قائم ہوچکی ہیں۔ عوام کا طبقہ صرف روٹی چاہتا ہے۔ حکومت اور مُلک اور تاج اور تخت نہیں۔

ہم سمجھتے تھے کہ انگریزوں کو اپنی شہنشاہی کا بڑا پاس ولحاظ ہوگا مگر یہاں کی حالت یہ ہے کہ وہ عظیم الشان حکومت جس کے احاطہ میں کبھی آفتاب نہیں ڈوبتا، اس کی عظمت پبلک کی نگاہ میں ایک پرکاہ کے برابر بھی نہیں۔ ہندوستان رہے یا جائے ان کی پاپوش کو بھی اس سے کوئی غرض نہیں صرف چند ارباب سیاست اور علم برداران حکومت ہیں جو تمام کرہ ارض کو اپنی انگلیوں پر نچا رہے ہیں۔

یہاں کی سیاست یہ ہے کہ جبتک کوئی کام واقع نہ ہوجائے اس کو الفاظ کا طلسم جانو، واقعہ نہ سمجھو، پہلے بھی علم تھا اب علم الیقین ہے کہ بہترین مدبر یہاں وہ سمجھا جاتا ہے جو کذب اور دروغ گوئی کے فن میں سب سے زیادہ کمال رکھتا ہو۔ چنانچہ مسٹر لائڈ جارج یہاں کے بہترین مدبر ہیں۔ روزانہ پارلیمنٹ میں، اخباروں میں، اسپیچوں میں، ان کے تخالف بیان کی ایک نئی مثال ملتی ہے۔

یہاں آکر ایک چیز میں نے بالکل نئی سُنی اور معلوم ہوا کہ پالٹکس کی دنیا میں اسکا بڑا انتظام ہے وہ لفظ "پروپیگنڈہ" ہے یعنی تم اپنے مقصد کے لحاظ سے، سچ یا جھوٹ جو بات تمام دُنیا کو منوانا چاہتے ہو اسکو اخبارات اشتہارات جلسوں اور ایجنٹوں کے ذریعہ اسقدر ہر جگہ پھیلا دو کہ اس گنبد مینا کے نیچے ہر گوشہ اور کونہ سے وہی ایک صدا سنائی دے اور چند روز کے بعد وہ تاریخی واقعہ بنجائے ـــــ جسطرح آج تمام عالم تیغ برطانیہ کے سایہ میں جی رہا ہے اسی طرح تمام دنیا کے حواس خمسہ ان برقی عصبات اور رگوں سے اپنا علم وجدان حاصل کرتے ہیں جو ریوٹر کے تاروں کی صورت میں جسم زمین کی سطح پر پھیلے ہوئے ہیں یہاں آکر تو سب سے پہلی بات مجھے یہ تسلیم کرنی پڑی کہ تقریباً سو برس سے دنیا کی تاریخ کا کوئی اعتبار نہیں بڑے بڑے مضمون یا تقریریں سے اسطرح چند باتیں ادہر ادہر کی حسب مدعا چھانٹ لی جاتی ہیں کہ قائل و متکلم کو اس سے ایک ذرہ تعلق نہیں ہوتا دوسرے دن وہی بات ریوٹر کے الہامی ذرائع سے تمام دنیا میں، اسطرح پھیل جاتی ہے کہ آپ اسکی تردید سے قطعاً عاجز ہیں۔ کوئی کیا کرسکتا ہے اور کسطرح اپنا جواب تمام دُنیا کو سُنا سکتا ہے۔ محمد علی صاحب کا بیان جو ہندوستان میں وزیراعظم کی ملاقات کی نسبت چھپا ہے وہ سرتاپا محرف ہے اور سنکر آپ حیرت کریں گے کہ کسطرح یہ بیان تیار کیا گیا ہے۔ ہماری پوری تقریریں سے جو کئی صفحات میں ہے ایک فقرہ کہیں کا ایک فقرہ کہیں کا اپنے مطلب کا لے لیا ہے اور خود اپنا جواب من وعن شائع کردیا ہے۔ اسطرح تو کوئی قرآن کو بھی نعوذباللہ طلسم ہوشربا بنانا چاہے تو بنا سکتا ہے۔ ریوٹر کے ذریعہ دنیا کے گوشہ گوشہ میں وزیراعظم کا جواب بتفصیل شائع کیا گیا لیکن ہمارے مطالبات زبردستی اسی ناقص صورت میں یہاں بھی اور ہندوستان میں بھی چھاپے گئے۔ یہاں کی حالت پر جہاں تک غور کیا معلوم ہوا کہ ہر شے تجارت ہے۔ پالٹکس بھی تجارت ہے۔ اخبارات اور مضمون نگاروں پر جو زرپاشی کریگا۔ وہ عوام کو بھی اپنی مٹھی میں لے لیگا۔

لیبر پارٹی جس سے لندن میں کچھ امید ہے اسکی ایڈوائزری کمیٹی سے ۱۰ اپریل کو ملاقات ہوئی ایک گھنٹہ تک گفتگو ہی ۲۳ اپریل کو دوبارہ ملاقات کا وعدہ کیا ہے۔ صدر کی تقریر نہایت عمدہ اور ہمدردانہ تھی لیکن مجھے اس سے کوئی امید نہیں۔ لیبر پارٹی آئرلینڈ کی حمایت میں بہت زور سے اٹھی اور چند روز میں بیٹھ گئی۔ پولینڈ کی مخالفت میں بڑا جوش دکھایا مگر شاید ایک ہفتہ سے زیادہ قیام رہا ہو۔ انگریزوں کا دماغ فطرتاً اسقدر تنگ واقع ہوا ہے کہ اسمیں بین الاقوامی وسعت کی صلاحیت نہیں انکے دماغ سے قومی خود غرضی جا ہی نہیں سکتی۔ اسلئے لیبر پارٹی کی ان ہمدردیوں سے یہ قیاس نہ کیجئے کہ وہ اپنے ملک میں جس اظہار فیاضی کیلئے تیار ہیں اس سے ایشیاء کی بیمار و بیکس قومیں بھی فائدہ اٹھا سکتی ہیں انگلستان کی آزاد سے آزاد پارٹی بھی بہرحال انگریز ہے لندن میں ہم لوگ ڈیڑھ مہینہ کے قریب رہے اور ہر طبقہ اور ہر فرقہ کے آدمیوں سے ملے۔ پیرس آئے ابھی صرف ایک دن گزرا ہے لیکن قسم بخدا کہ یہ ایک دن اس ڈیڑھ مہینہ سے بہتر ہے۔ اسلام اور مسلمانوں سے محبت رکھنے والوں کی تعداد یہاں کثیر نظر آتی ہے۔ انگلینڈ میں ہمدرد سے ہمدرد انگریز بھی صرف نفع زر کیلئے کام کرتا ہے۔ آپ یہ سُن کر حیرت کرینگے کہ آج ۱۲ بجے دن سے لیکر ۲ بجے شب تک ایک فرنچ لیڈی جسکو مشرق خصوصاً بلقان کی سیاست سے ذوق ہے۔ ہمارے ساتھ اپنے ہاتھ سے کام کرتی رہی۔ فرانس کی سرزمین ہماری امیدوں کا کشت زار ہے ہم نے دیکھا اور دیکھ رہے ہیں کہ محکوم قوموں سے نفرت اور اپنی بڑائی اور تعلّی کے جذبات انگلش قوم میں علی حالہ باقی ہیں لیکن فرنچ قوم مسلمانوں کی عنایت و محبت کی سرتاپا مشکور ہے۔ کوئی فرانسیسی ایسا نہیں ملا جس نے اسلام اور مسلمانوں کے نام سے ہماری اپیل کو رد کیا ہو۔ مظلوموں کی اعانت بیکس اقوام کی حمایت اور غربا کی امداد انکا اصل کام ہے ان سے ملکر معلوم ہوا کہ فرانسیسی قوم دنیا میں کیوں اسقدر محبوب اور ہر دلعزیز ہے۔ ایک معمولی سا واقعہ میں آپکے سامنے پیش کرتا ہوں جس سے انگلینڈ اور فرانس کا فرق محسوس ہوگا۔ ہر انگلش مین خواہ وہ لیبر پارٹی ہی کا ممبر کیوں نہ ہو آزادی اور جمہوریت کے دعووں کے باوجود ہمارا ایمپائر (our own empire) اور ہمارے فیلو سبجکٹس (Fellow Subjects) کہنے سے نہیں شرماتا کل ایک فرانسیسی ہم لوگوں کی خاطر سے انگریزی بول رہا تھا انگریزی محاورہ کے مطابق افریقہ کے فرنچ مقبوضات کی نسبت اس کی زبان سے ہمارا ایمپائر کا لفظ نکلا تو وہ شرما گیا اور فوراً اس نے اس لفظ کو چھوڑ کر سٹی (city) اور سٹی زن (citizen) سے اپنا مطلب ادا کیا۔

* * * *

وفد خلافت لندن میں جب وزیر ہند کی ملاقات کو گیا تو اسکو کچھ دیر وہاں بیٹھ کر انتظار کرنا پڑا جہاں وزارت ہند نشست کرتی ہے یعنی انڈیا کونسل ہاؤس۔ اس چھوٹے سے کمرہ کو دیکھ کر خیال آیا کہ یہ وہ ایوان عالی ہے جہاں بیٹھ کر ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ ہوتا ہے۔ ایوان وزارت کی میز پر آٹھ پیتل کے موٹے پیپر ویٹ تھے ان پر فارسی اور اردو اشعار کندہ نظر آئے فارسی کے اشعار عموماً سعدی کے ہیں ان تمام اشعار میں بادشاہ کو عدل و انصاف کی تعلیم دی گئی ہے۔ پرنس غلام حسین آف میسور نے ۱۸۵۴ء میں ان کو پیش کیا تھا خیال کرتا ہوں کہ یہ شاید سلطان میسور کے دربار کی یادگار ہوں۔ صدر ایوان وزارت کے سامنے جو دو لوحیں ہیں ان پر یہ اشعار ہیں:-

(۱)

ہر کہ اورا عدل عادت می شود	بے گماں عمرش زیادت می شود
ہر کرا بر خلق بخشائش شود	آبروئے او درا فزائش شود
از سخاوت آبرو افزوں شود	از بخیلی بے خرد را مردوں شود

بارعیت چوں کند حاکم ستم   مرا درا باشد بتا در ملک کم

---

(۲) بد و نیک ہر چند ہے بے ثبات   ولیکن جہاں میں ہے بہتر یہ بات
کہ نام نکوئی رہے یادگار   ہمیشہ نکو نام ہے برقرار
ہمیشہ جو کوئی کرے کام نیک   تو بیشک ہو آغاز انجام نیک
ستانا دل کا اے صاحب بُرا ہے   قلوب مرد ماں عرش خدا ہے

شاعر نے تو" اے صاحب" کسی اور معنی میں کہا ہے مگر واقعہ کی مناسبت دیکھئے کہ" صاحب" لوگوں پر کسقدر چسپاں ہے
باقی چھ چپ و راست کے پیپر ویٹ پر یہ اشعار ہیں۔

(۳) ر شنیدم کہ در وقت نزع رواں   بہ ہرمز چنیں گفت نوشیرواں
ازاں بہرہ در تر در آفاق نیست   کہ در حکمرانی با نصاف نیست

---

(۴) چو نوشیرواں عدل کرد اختیار ۔   کنوں نام نیک است ازو یادگار
چو ایزد ترا ایں ہمہ کام داد   چرا بر نیاری سرانجام داد

---

(۵) ثباتے ندارد جہاں اے پسر   بغفلت مبر عمر در وے بسر
خواہی کہ خدائے بر تو بخشد   با خلق خدائے کن نکوئی

---

(۶) ناتوانی حاجت مردم برار   تا برآرد حاجتت را کردگار
برآوردن کام امیدوار   بہ از قید بندی شکستن ہزار
شاہ ما آں کند کہ او گوید   حیف باشد کہ جز نکو گوید

---

(۷) جہاں را با نصاف آباد دار   دل اہل انصاف را شاد دار
ترازیں بہ آخر چہ حاصل شود   کہ نامت شہنشاہ عادل بود

---

(۸) عدل کر دنیا میں غافل زندگانی پھر کہاں   زندگی بھی گر رہی تو یہ حکمرانی پھر کہاں
سدا عیش دنیا، دکھاتا نہیں   گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

یہ کیا کہتے ہو کہ ہم وزیراعظم سے مرعوب ہو گئے ؟ مرعوبیت اتنی بھی ہوئی ہو جتنی مجھے اپنے بڑے بھائی کے سامنے ہے

ہے تو کفر۔ اس انگلینڈ میں جہاں بادشاہ بھی رسمی اور قدیم الدستور تعظیم کے سوا کسی عزت کا مستحق نہیں وزیراعظم سے رعب کھانا قابل مضحکہ تخیل ہے۔ اب تک ارکان وفد کے جسقدر بیانات تقریریں اور اعلانات ہوتے ہیں انکا عشرعشیر بھی آج تک کوئی ہندستانی یہاں آکر نہ ظاہر کر سکا۔ ابتک کس ہندوستانی کو ہمت ہوئی تھی کہ انگلینڈ کی سرزمین میں آکر جہاد کی تہدید کرے؟ کس ہندوستانی نے یہ جرأت کی تھی کہ انگلینڈ میں بیٹھکر غیر بادشاہوں کے نام معروضے بھیجے؟ اب تک کس ہندوستانی نے یہ خطرہ گوارا کیا تھا کہ یورپ کے دیگر وزراء کے سامنے اپنے بیانات پیش کرے۔

* * * *

۳۰ جون کو ہمارا قافلہ آکسفورڈ گیا تھا، وہاں کے عجائبات علمیہ دیکھے۔ متعدد کالجوں کا مشاہدہ کیا کتب خانے دیکھے انگلستان چونکہ جزیرہ ہے اسلئے یہاں کے باشندوں کو مجبوراً ملاح ہونا چاہئے اور اسی لئے انگلستان دنیا کی سب سے بڑی بحری قوت ہے لیکن معلوم ہے کہ یہ قوت بحری اپنی تعلیم کا کہاں سے آغاز کرتی ہے۔ کیمبرج اور آکسفورڈ کی یونیورسٹیوں میں دونوں جگہ منجملہ ورزشوں کے کشتی رانی کا بھی بڑا انتظام ہے شہر میں فطری اور مصنوعی نہریں ہیں۔ جسکے کناروں پر ہر کالج کا اپنا گھاٹ ہے جسمیں اس کالج کی کشتیاں پڑی ہوتی ہیں۔ ہر کالج کی علیحدہ علامت اور نشان ہے جو کالج کی عمارتوں پر، طلبہ کے لباسوں پر کشتیوں کے ہیز می گھاٹوں پر بنا ہے۔ طلبہ اپنے وقت کا بڑا حصہ کشتی رانی میں صرف کرتے ہیں۔ سال میں ایک دفعہ لندن آکر کیمبرج اور آکسفورڈ کا مقابلہ ہوتا ہے۔ دیکھنے کی ایک گراں فیس ہوتی ہے، جو جیت جاتا ہے اسکے محامد اور اوصاف مہینوں اخبارات میں مزے لے لیکر گنائے جاتے ہیں۔

آکسفورڈ اور کیمبرج کو دیکھ کر معلوم ہوا کہ مشرقی اور مغربی طرز تعلیم اور تربیت میں کیا فرق ہے مشرقی طالب علم کا مدعا یہ ہے یا یوں کہئے کہ مشرقی مدارس کا مقصد یہ ہے کہ طالب علم زیر درس علوم میں ماہر ہو جائے لیکن مغربی طرز تعلیم کا منشاء یہ ہے کہ طالب علم کے تمام قوائے جسمانی و دماغی و اخلاقی میں بالیدگی ہو۔ علاوہ تعلیم کے لہو و لعب، ورزش جسمانی اور کشتی رانی کی خاص مشق کرائی جاتی ہے۔ ان کے ہاں انجمنیں اور مجلسیں ہیں جن میں پالٹکس بلکہ انٹرنیشنل پالٹکس پر آزادانہ بحثیں ہوتی ہیں۔

اس سے اندازہ ہوگا کہ ہندوستان کے محکمہ تعلیمات کا یہ اصول کہ پالٹکس کو احاطہ تعلیم کے اندر نہ داخل ہونا چاہئے۔ اور طلبائے ہند سیاسیات کو شجر ممنوعہ سمجھیں کس حد تک یورپین طریقہ تعلیم کے منافی ہے اور اس روک تھام سے ہمارے محکمہ تعلیم کا مدعا کیا ہے اچھی طرح سمجھ میں آسکتا ہے۔

ایک کتب فروش کی دوکان پر گیا تھا اسکی وسعت دیکھ کر حیران ہوگیا یہ برٹش میوزیم کے سامنے ہے۔ ہر موضوع، ہر سبجکٹ اور ہر مبحث کی کتابوں کا الگ صیغہ اور الگ عملہ تھا، مشرقی زبانوں اور کتابوں کا الگ نقشوں کا الگ تاریخ کا الگ غرض ایک ایک علم و فن کا الگ۔ عمر خیام کی رباعیات کا ایک نسخہ دیکھا جسکے ایک ایک صفحہ پر ایک ایک انگریزی ترجمے کی رباعی اور مقابل کے صفحہ پر رباعی کی مادی تصویر، گویا رباعی کے مفہوم کو تصویر سے مجسم کیا ہے۔

کل ۱۱ جولائی کو تین ہفتوں کیلئے میں بسلسلہ علاج ویشی (فرانس) آیا ہوں یہ معدہ اور جگر کے بیماروں کیلئے خاص صحت گاہ ہے۔ گرمی کے تین چار مہینوں میں یہ نہایت آباد رہتا ہے پھر یہاں خاک اڑتی ہے۔ آج کل یہ بہار پر ہے۔ پیرس سے سات

گھنٹوں کی مسافت پر ہے یہاں چند قدرتی معدنی چشمے ہیں جنکا پانی معدہ وجگر کے لئے آب حیات ہے ان چشموں کو گورنمنٹ نے خوشنما قبوں کے سائے میں کر دیا ہے ان پر پتھر کے کنگورے بنا کر چاروں طرف لگا دیئے ہیں جن سے پانی نکلتا ہے چاروں طرف لوہے کی تیلیوں کا کٹہرہ ہے جن میں چھوٹی چھوٹی ہزاروں کیلیں جڑیں ہیں ہر کیل میں ایک گلاس لٹکا ہے گلاسوں پر نمبر پڑے ہیں کٹہرہ کے نیچے پانی پلانے والیاں کھڑی رہتی ہیں چاروں طرف صبح شام ہزاروں آدمیوں کا میلہ لگا رہتا ہے۔ پانی شور اور گرم ہے سعدی کہتے ہیں۔ ؎

هرکجا چشمهٔ بود شیریں مردم و مور و مرغ گرد آیند

مگر یہاں چشمہائے شور کے گرد مردم و مور و مرغ کا مجمع ہے۔ البتہ ان شور چشموں کی تقریب سے "زنن اور روان شیریں چشمے" ہر جگہ چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ فتبارک اللہ احسن الخالقین ـــــ مسافروں کے اس عارضی شہر میں دماغی علمی تفریح گاہ سے لیکر جسمانی عیش و عشرت گاہ تک پہلو بہ پہلو نظر آتے ہیں اور یہی فرانسیسی تمول کے خصائص ہیں۔

جس مقام پر میں یہ لکھ رہا ہوں یہ ویشی کا کلب ہے یہ ایک وسیع باغ و عمارت ہے جسمیں مختلف مقامات پر کئی ہزار کرسیاں پڑی ہیں، جس پر کلب کے ممبر ہی بیٹھ سکتے ہیں۔ اسکے ایک گوشہ میں تھیٹر ہے دوسرے گوشہ میں ریسٹورانٹ ہے، سامنے لائبریری ہے اور لائبریری کے سامنے ہی قمار خانہ ہے۔ جہاں تمام دن فرانس کے شرفاء بیٹھے جوا کھیلتے رہتے ہیں کھیلنے والوں کے چاروں طرف تماشائی ہیں۔ باغ کی ایک روش پر "لذت شب" کے سوداگروں کا بازار ہے۔ "تماشا" خود محو خرام ہے۔ "تماشائی" زیجیب" چکر کاٹ رہے ہیں۔ ایک طرف رقص و سرود کا انتظام ہے۔

۱۴ جولائی کو فرانس کی عید حریت (جشن آزادی) کا دن ہے انکے خیال میں یہ وہ دن ہے جب "دنیا" نے "عدالت" "اخوت" "مساوات" پائی۔ "دنیا" سے مراد "مختصر فرانس" ہے۔ بہر حال پرسوں اور کل یہاں حریت کا جشن تھا۔ تمام شہر بقعہ نور تھا۔ عمارتیں جھنڈیوں سے آراستہ تھیں۔ ہر چوراہے پر باجے بج رہے تھے جسکے چاروں طرف صدہا انسانی جوڑوں کا پرا تھا۔ باجہ کے تال و سُر پر ایک ایک مرد اور ایک ایک عورت کے پاؤں میں خود بخود جنبش ہونے لگتی تھی سینہ سے سینہ لگ جاتا تھا اور رقص فاسقانہ شروع ہو جاتا تھا کسی کا نشہ اسی حالت میں تیز ہو گیا تو "مراقصہ" سے بڑھکر "ملاعبہ" پھر "ملامسہ" آخر" ــــ "تک نوبت پہونچ جاتی تھی۔ تمام شہر کے چوراہے اسی منظر سے معمور تھے۔

فرانسیسیوں کے متعلق رائے بدل رہی ہے۔ میں ان کو پرلے درجے کا منافق سمجھتا ہوں۔ ہندوستان کے ایک خاص طبقہ کے اخلاق سے انکا اخلاق بہت ملتا جلتا ہے۔ ظاہری نمائش اخلاق ان میں بہت ہے۔ دکھاوے کی ہمدردی ان کا خاصۂ قومی ہے۔ منہ پر ہر قسم کی چکنی چپڑی باتیں کرینگے۔ مگر دلمیں جو نفاق ہے وہ ظاہر نہ کرینگے۔ دنیا کی حریت، طلب اقوام کے بیبیوں وفود ان کی باتوں میں دہوکہ کھا کر انکے سہارے اپنی آزادی کیلئے اختر شماریاں کر رہے ہیں۔ فرانسیسی ملنے جُلنے میں بہت ہنس مکھ و بے تکلف واقع ہوئے ہیں اور انگریز خشک مزاج اور دیر آشنا، اسلئے بے غرض ملاقاتوں میں فرانسیسیوں کا اثر بہت اچھا پڑتا ہے لیکن جب کبھی مطلب کی بات آتی ہے تو فرانسیسی انگریزوں سے کم بیمروت اور سخت نہیں نکلتے۔

فرانس کی جمہوریت اور آزادی کا افسانہ تو بہت سُنا ہوگا لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ قوم انگریزوں سے بھی زیادہ مستعبد اور اقتدار پسند ہے۔ عوام کو سلطنت میں کوئی دخل نہیں پہلے یہ سُنکر بہت خوشی تھی کہ فرنچ اپنی حکومت کو شہنشاہی و بادشاہی اور نو آباد شہروں کو محکوم اقوام اور دیگر اقوام محکومہ کو انگریزوں کی طرح رعایا نہیں کہتے بلکہ اپنی سلطنت کو کامن ویلتھ (دولت مشترکہ)

رعایا کو سٹی زن (شہری) کہتے ہیں۔ لیکن افسوس کہ یورپ آکر معلوم ہوا کہ ہر لفظ سے اسکا اصلی مفہوم مراد لینا ضروری نہیں جیسے لیگ آف نیشن (مجلس اقوام) انڈپنڈنٹ (خودمختاری) وغیرہ الفاظ کے معنی یورپ میں وہ نہیں سمجھے جاتے جو ایشیا میں از روئے لغت سمجھے جا سکتے ہیں۔ فرانس کا حق شہریت، فرنچ، انڈیا، مراکش، الجیریا اور ٹیونس وغیرہ کے باشندوں کو آپ جانتے ہیں کب حاصل ہو سکتا ہے؟ جب وہاں کے باشندے فرنچ قانون اختیار کرلیں، فرنچ حکومت تسلیم کرلینے کے بعد فرنچ قانون اختیار کرنیکے معنی آپ سمجھے؟ یعنی دیگر قوانین حکومت کیساتھ نکاح وطلاق وراثت اور دیگر معاملات میں اپنا مذہبی وقومی قانون چھوڑ دیا جائے۔ اسکے صاف معنی یہ ہیں کہ اپنی قومیت اور جنسیت چھوڑ کر فرانسیسی قومیت اختیار کرلو ظاہر ہے کہ مسلمان اسکو قبول نہیں کرسکتے اسلئے وہ حق شہریت سے محروم ہیں۔ اور حقوق میں ایک فرنچ مین کے برابر نہیں ہو سکتے۔

جمہوریہ فرانس کا شعار (موٹو) یہ چار الفاظ ہیں — اخوت — مساوات — عدالت — آزادی — حکومت کے ہر دفتر اور ایوان کے صدر دروازہ پر یہ الفاظ آپ کو کندہ ملیں گے لیکن ان کے معنی آپ وہ نہ سمجھیں جو لغت کی زبان آپ کو بتلاتی ہے۔

واپسی کیلئے یکم ستمبر کو ہملوگ لندن سے روانہ ہوکر پروگرام کے مطابق سفر کر رہے تھے کہ کل میلانو (اٹلی) میں یکایک کو۔ کمپنی کے دفتر سے اطلاع ملی کہ ۱۰ ستمبر کو چلنے والا جہاز ملتوی ہوگیا۔ یہ خبر بجلی بنکر میرے صبر وتحمل کے خرمن پر گری۔ اخبارات کی معرفت پہلے سے معلوم تھا کہ امیر فیصل[1] یورپ آرہے ہیں عزم قطعی تھا کہ حضرت کی زیارت سے مشرف ہوں، ہمارا راستہ بھی سارے یورپ کو طے کرکے نکلتا تھا اسلئے یقین تھا کہ راہ میں کہیں نہ کہیں مٹ بھیڑ ہوگی۔ پہلے خیال تھا کہ شاید سوئزرلینڈ نقطہ اتصال ہو لیکن یہ غلط نکلا اور اٹلی کے مضافات میں انکے اسٹاف اور ہمارے وفد میں تصادم ہوا۔

یکم ستمبر کی صبح کو لندن سے روانہ ہوکر، بجے شام کو پیرس پہونچے، ۳ کی شام کو وہاں سے چلکر ۱ بجے کے قریب سوئزرلینڈ کے قصبہ "طریلطے" اور "مانترو" پہونچے، یہ قصبہ ممالک اسلامیہ کے پناہ گزینوں کا مامن ہے۔ پورا ملک سوئزرلینڈ کوہستانی ہے ریل سے وہی مناظر نظر آتے ہیں جو بمبئی سے پونا تک ہیں۔

روم جاتے ہوئے راستہ میں بعض وجوہ سے ۱۲ گھنٹوں کیلئے فلارنس میں اتر گئے۔ یہ شہر گزشتہ تاریخ میں شاندار حکومتوں کا مرکز رہا ہے، فنون لطیفہ کا یہ گہوارہ ہے۔ سنگی مجسموں کاغذی تصویروں، اور روغنی مرقعوں کا وہ گراں بہا نوادر کا تاریخی مجموعہ یہاں ہے کہ دنیا میں اسکی نظیر نہیں۔ عظیم الشان سنگی عمارتوں میں یہ بے بہا تحائف زمانہ رکھے ہوئے ہیں ان کو دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کے انسانوں نے خدا کی صنعتوں کے مقابلہ کا پورا عزم کرلیا تھا آنکھوں نے جو نوادر دیکھے خامۂ نگار انکی صنعت کی نہیں کھینچ سکتا۔ گو مجھے اس فن میں درک نہیں مگر تصویروں کی ظاہری لطافت ونزاکت عام نظروں سے بھی پوشیدہ نہ رہ سکی۔ خصوصاً وہ تصویریں مجھے بہت پسند آئیں جن میں مصور نے انسانی جذبات کو مجسم کیا تھا، مذہبی تصاویر کی تعداد زیادہ ہے اور یہ عموماً چودھویں اور پندرھویں صدی کے مصوروں کے کارنامے ہیں۔

یہاں پتھروں میں مختلف رنگ کے پتھروں کی ہئیت ترکیبی سے نقش ونگار پیدا کرنیکا کارخانہ دیکھنے کے لائق ہے، ہمارے

---

[1] شریف حسین کے بڑے صاحبزادے، جو آخر میں عراق کے بادشاہ ہوئے، ۶ . ۷ . یونگی بغاوت کے اصل بانی یہی تھے۔

یہاں آگرہ میں بھی یہ کام ہوتا ہے مگر تعصب ہوگا اگر موجودہ عہد میں فلارنس کو آگرہ پر فوقیت نہ دی جائے آگرہ کے تاج میں جو کام ہے اس قسم کا کام یہاں بھی نظر آتا ہے مگر تاج کے کام کو کوئی نہیں پہونچتا۔ فلارنس کا یہ کام یہانتک ترقی کر گیا ہے کہ انھیں مختلف رنگ کے پتھر کے ٹکڑوں سے پوری انسانی تصویر بنائی جاتی ہے اور ہر انسان کی سنگی تصویر مجسّم کی جاتی ہے۔

فلارنس چھوڑ کر ۹ ستمبر کو اٹلی کے دارالحکومت رومہ میں پہنچے اٹلی ایک سمت میں یورپ کا آخری ملک ہے۔ اس لئے یہاں کے مغربی قالب میں مشرق کی روح جھلکتی ہے، طرز و انداز، عادات و اخلاق میں ایشیاء کا پرتو نمایاں ہے۔ شکل و صورت اور رنگ و روپ میں بھی مشرق و مغرب کی گنگا جمنا نظر آتی ہے اس لئے یہاں کی صورتیں مشرقی قوموں کے معیار ذوق سے گری ہوئی نظر نہیں آتی ہیں۔

امیر فیصل کی بدولت اٹلی کے دیہاتوں تک میں جانیکا اتفاق ہوا۔ پرانے طرز کے مکانات جدید انداز کی عمارتوں کے پہلو بہ پہلو نظر آتے ہیں۔ غریب کسان، غلوں کے کھلیان، کھپریل کی چھت زمین میں کھیلتے ہوئے بچے، پھٹے پرانے کپڑوں میں انسان ہر جگہ نظر آتے ہیں۔ کہیں کہیں تو بالکل ہندوستان کا دھوکہ ہوتا ہے۔ خود شہر رومہ میں نئے اور پرانے تمدن کا جوڑ ہر چیز میں صاف نظر آتا ہے۔ ایک طرف اگر جدید العہد تمدن کی سر بفلک عمارات ہیں جہاں بجلیوں کے گھوڑے کونے کونے میں دوڑ رہے ہیں تو دوسری طرف ہندوستان کے پرانے شہروں مثلاً بنارس کیطرح تنگ و پختہ سڑکیں ہیں جنکے دونوں طرف قدیم العہد کھڑکیوں والے مکانات ہیں کھڑکیوں میں میلے اور پرانے کپڑے لٹکتے نظر آتے ہیں۔ جدید شہر کے بالکل متصل رومتہ العظمیٰ کے قدیم کھنڈر ہیں۔ جہاں رومیوں کے گزشتہ جلال و عظمت کے آثار دفن ہیں۔ اونچی اونچی اینٹ اور چونے کی دیواریں گری پڑی اب بھی نظر آتی ہیں اور انکو سیاح عبرت کی نظر سے دیکھتے پھرتے ہیں۔

رومہ کا شہر عالم مسیحیت کا پایۂ تخت ہے۔ پوپ کا ایوان اقدس اسی شہر کے ویٹیکن نام ایک گوشہ میں واقع ہے تمام شہر خانقاہوں، گرجوں، معبدوں اور مقبروں سے معمور ہے مجھ کو تو یہ شہر دیکھکر اپنی پرانی دلّی یاد آ گئی۔ ہر خانقاہ، ہر گرجا، ہر معبد اور ہر مقبرہ انسانی صنعت کا نادر نمونہ ہے سقف سے لیکر صحن تک بلکہ اس شہر کے آسمان سے لیکر زمین تک مجسموں اور تصویروں سے اسطرح معمور ہے گویا ایک نئی کائنات جو سراسر انسانی ہاتھوں کی مخلوق ہے ہر طرف جلوہ ریز ہے۔ ویٹیکن کی مشہور عمارت دیکھی یہ پوپ کا ایوان اقدس ہے۔ خاصہ رقبہ ہے یہ پورا رقبہ شاہ اٹلی کے حدود حکومت سے خارج اور خاص پوپ کی گویا ایک شہری حکومت کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں کی پولس بھی خاص پوپ کی ہے، ہر صدر دروازہ یہ مقدس پولس ایک خاص قسم کی وردی میں نظر آتی ہے انکا پورا لباس زرد، سُرخ، سیاہ مختلف رنگوں کے ملیے دھاری دار کپڑے سے بنا ہوا ہے۔ ہاتھوں میں پرانے قسم کے اسلحے نظر آتے ہیں۔

پوپ سے تو نہیں لیکن نائب پوپ سے ملاقات ہوئی انکا لباس تو ہم کو بالکل عربوں کا سا معلوم ہوا۔ دیر تک بات چیت ہوتی رہی، ویٹیکن کی لائبریری دیکھنے کا مجھے شوق تھا پوپ کے سکرٹری سے اس کیلئے وقت مقرر کرایا۔ دوسرے دن جاکر لائبریری دیکھی۔ پہلی تیزدہی مجسمہ خانے تھے۔ دوسرے کمرے تصویر خانے تھے۔ کتاب خانوں کا کمرہ گو کھلا تھا مگر کتابیں الماریوں میں بند تھیں۔ ایک کمرہ میں مختلف سلاطین عالم کی طرف سے پوپ کی خدمت میں کتب مقدسہ کے مطلا و مذہب جو نسخے بھیجے گئے تھے وہ سب ایک شیشہ کے صندوق میں بہ ترتیب تختہ پر چاروں طرف رکھے تھے، سب سے قیمتی جلد فرانس کی تھی۔

جواہرات سے آراستہ تھی۔ انھیں ہدیوں میں ایک سلطان ترکی کا ہدیہ بھی تھا۔ جس کی جلد پر سنہرا طغرا اور چاروں
طرف کوئی عبارت جو پڑھی نہیں گئی لکھی تھی۔

پیٹر کا گرجا یہاں کے مشہور عجائبات میں سے ہے۔ گرجوں کے متعلق چند باتیں عجیب معلوم ہوئیں۔ ایک تو یہ کہ جس
طرح ہماری مسجدیں قبلہ رُخ ہوتی ہیں۔ یہ گرجے سب مشرق کے رُخ واقع ہیں۔ تمام صحن و دیوار مقبرے ہیں۔ جن میں مسیحی
اولیا یا امرا یا مشاہیر دفن ہیں سقف و دیوار کتب مقدسہ کی داستانوں کی مجسم تصویریں ہیں۔

ایک عجیب چیز شہر کے باہر قدیم العہد عیسائیوں کا مقبرہ اور عبادت خانہ اس زمانہ کا ہے جب رومن حکومت میں عیسائیت
گناہ تھی۔ اور عیسائی ڈھونڈ ڈھونڈ کر ستائے جاتے تھے۔ اس زمانہ میں شہر سے باہر عیسائیوں نے زمین کے اندر سرنگ کھود کر
اپنا ٹھکانا بنایا تھا جہاں چھپ کر وہ اپنے طور کی عبادت کرتے تھے اور اسکی دیواروں میں اپنے مردے دفن کرتے تھے۔ یہ زیرزمین
سرداب گو ۳۲ میل تک ہے لیکن ۱۲ میل تک زمین کھود کر صاف کیگئی ہے۔ اندر بالکل اندھیرا ہے موم بتیاں لیکر ہملوگ اسکے اندر
گھسے اور کچھ دور جاکر واپس نکل آئے۔

پہلے تو شک تھا کہ شاید اب بھی جہاز نہ ملے مگر خدا کا شکر کہ محمد علی صاحب کی اندھا دُھند کوششوں اور لنوری عزیز بے
ایک ترک تاجر کی جانفشانی سے جہاز مل گیا۔ عزیز بے نے ایک بڑے اطالین عہدہ دار سے جہاز کمپنی کو تار دلوایا۔ جواب آیا
کہ چار نشستیں محفوظ ہیں۔ ۱۷ ستمبر کو یہ جہاز جس کا نام گراز یا گراس ہے برنڈزی پہونچے گا اور ۴ اکتوبر تک ہم کو ہندوستان
پہونچادے گا۔

نیپلس بھی اٹلی کا مشہور شہر ہے۔ رومہ سے برنڈزی جاتے ہوئے، جہاں سے ہم کو جہاز پر سوار ہونا تھا راستہ میں پڑتا
ہے۔ چنانچہ ۱۴ ستمبر کو ۱۲ بجے رومہ سے روانہ ہوئے رات کو ۱۰ بجے کے قریب نیپلس پہونچے۔ رات کو ہوٹل میں جاکر پڑ رہے۔
یہ شہر سمندر کے کنارے واقع ہے۔ اور نہایت خوش منظر ہے۔ خاص کر ہمارے لئے دل چسپی کا باعث اس لئے بھی تھا کہ یہ
بھی یورپ کے ان شہروں میں سے ہے جن پر اسلام کا علم ایک مدت تک لہراتا رہا ہے عربوں نے جنوبی اٹلی پر ایک زمانہ میں حکومت
کی ہے اور اسکے آثار اب تک باقی ہیں۔

نیپلس کے قریب اٹلی کے مشہور ویران شہر پامپائی کے آثار ہیں۔ جو دو ہزار برس پہلے رومیوں کا ایک آباد و عالیشان
شہر تھا مگر آتش فشاں پہاڑ کے پھوٹنے سے تباہ ہوگیا۔ اسے دیکھنے گئے موٹروں پر گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کا راستہ ہے، پہاڑیوں
کے جھنڈ میں یہ شہر ایک مرتفع مقام پر واقع ہے اس سفر میں اور امیر فیصل کی ملاقات کے رہگذر میں بھی اٹلی کے قصبوں اور دیہاتو
سے گزرنے کا اتفاق ہوا تھا، نظر آیا کہ یہ ملک کسی حالت میں ہندوستان سے بہتر نہیں، وہی افلاس و غربت ہے، بچے برہنہ تن یا
میلے کچیلے کپڑوں میں۔ عورتیں، کثیف اور پھٹے پُرانے کپڑوں میں سر پر بوجھ اٹھائے چل پھر رہی تھیں، کاشتکار اپنے کھیتوں
میں آجا رہے تھے، سڑکیں ناہموار، ناصاف، راستوں میں کوڑا کرکٹ، بھیک مانگنے والوں کا ہجوم —— اس ویران
شہر کو جو ہزاروں سال زیر خاکستر دفن تھا محققین آثار نے اب کھود کر نکالا ہے۔ سب سے پہلے ایک عجائب خانہ ملا، جسمیں
عورت، مرد اور بچوں کے چند ڈھانچے ملے جو کھودتے ہیں نکلے ہیں، لاشیں اسی حالت میں اکڑی ہوئی رکھی تھیں جس حالت میں آتش
فشانی کے وقت روح انکے تن سے نکلی تھی۔ اوپر چڑھکر صحن، دیواروں، سڑکوں، عدالتوں، دوکانوں اور کارخانوں کے آثار
لے جنکو دیکھکر رومی عہد کی عظمت نظر آئی۔ تھیٹر اور حمام خاص تماشا گاہ تھے بہرحال ان آثار ہی کو دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ یہ قوم

عیش پرستی کے کس حضیض اور پستی تک پہونچ چکی تھی جسکا عکس دیواروں اور عمارتوں کے نقشوں سے آج بھی نظر آتا ہے برہنہ عورتوں اور مردوں کی رنگین تصویریں ہر جگہ نظر آتی ہیں۔ انسانی آلۂ تناسل علامت خیر و برکت سمجھ کر گھروں اور دوکانوں کے دروازوں پر ایک چھوٹے سے طاق میں نصب کرتے تھے اور وہ ابتک ہیں۔ ایک جگہ اسکی قوت ثقل ترازو میں تلتی نظر آتی ہے سامنے کی پہاڑیوں سے ابتک دھواں اٹھتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

۱۷ ستمبر کی ۴ بجے شام آخری لمحہ تھا جب ہمارے جہاز نے یورپ کے ساحل سے لنگر اٹھایا اور ہم نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس بیگانہ تہذیب و تمدن کی قید سے چھ ماہ کی اسیری کے بعد نجات ملی۔ جب ہم نے بحر متوسط میں قدم رکھا تو ہر چیز ہم کو مانوس نظر آنے لگی۔ یونان کے سواحل ۲۴ گھنٹے سے زیادہ پیش نظر رہے — کریٹ سامنے سے گزرا — پھر یکے بعد دیگرے اور جزیرے گزرتے گئے اس تمام اثناء میں اس عہد کا خیالی منظر سامنے رہا جب یہ تمام سمندر اور راسکے یہ جزیرے ہمارے اسلاف کے دریا پیما جہازوں کے سیر گاہ تھے۔

بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی

پانچویں دن صبح کے وقت مصر کی سرحد نظر آئی، پورٹ سعید کا سواد شہر سامنے تھا۔ جس جہاز سے ہم سفر کر رہے تھے اسکا نام گراز تھا۔ فلسطین کی یہودی آبادی کیلئے ہر جہاز سے سینکڑوں یہودی یورپ کے ممالک سے فلسطین جا رہے تھے چنانچہ اس گراز پر بھی ۳۰۰ کے قریب جوان مرد و عورت یہودی تیسرے درجہ میں سوار تھے۔ پانچ روز تک ہم نے انکی حالت دیکھی اس سے افسوس ہوا کہ کیا ارض مقدس کی حرمت انھیں کے ذریعہ برقرار رکھی جائیگی یہ لوگ سر دیا سے ہجرت کر آرہے تھے، مفلوک الحال اور ناشائستہ ہونیکے علاوہ انمیں یورپ کے تمام معائب موجود تھے۔ ہمارے پاس جہاز کے خلاصی اور افسران "آوارہ گرد نازنینان اسرائیل" سے جس بے باکی کیساتھ لطف اندوز ہوتے نظر آتے تھے اور خود انکے جو اخلاق ہر کہہ و مہہ پر نمایاں ہو رہے تھے ان سے اندازہ ہوتا تھا کہ آئندہ بیت المقدس کا تمدن کس نوع کا ہوگا۔

پورٹ سعید میں یہ قافلہ اتر گیا۔ یہاں ہمارا جہاز چند گھنٹے ٹھہرنے والا تھا اسلئے پاسپورٹ دکھا کر جلدی جلدی اترے کہ کسی مصری ہوٹل میں جاکر آج مشرقی مذاق کا کھانا کھائینگے۔ گھنٹہ دو گھنٹہ شہر و بازار میں پھرے مصر اس لڑائی کے بعد ایک عجیب مصر ہو گیا ہے۔ ہوائے استقلال اور تمنائے آزادی بچہ بچہ کے سر میں ہے۔

۲۵ ستمبر کو جہاز نے مصوّع میں قدم رکھا۔ ہمارے ہندوستانی بھائیوں کی جو یہاں تاجر ہیں صورتیں نظر آنے لگیں مغرب کی نماز ہم نے یہاں ایک بڑی مسجد میں ادا کی۔ مسجد کا فرش صرف سنگریزوں کا تھا۔ محمد علی صاحب نے اس موابست کے اظہار کیلئے جو مسلمانان عالم کو باہم ہے اور نیز اسلئے کہ مسلمانان ہند کی یادگار انکے دلوں میں قائم رہے، ہندوستانی تاجروں کے ذریعہ وفد کی طرف سے ۱۵ پونڈ اسکے پختہ فرش کیلئے دیئے اور ایک عربی کتبہ لکھکر دیا جو پتھر پر "مسلمانان ہند" کا کندہ کرکے فرش پر لگا دیا جائے۔

۲۶ کی صبح کو مصوع سے ہمارے جہاز نے لنگر اٹھایا اور ۲۷ کی دوپہر کو پرتم میں کوئلہ لینے کیلئے ٹھہرا۔ یہ جزیرہ سواحل یمن کے مقابل واقع ہے۔ چھوٹے چھوٹے پہاڑی جزیرے ہیں، جو گو آبادی کے قابل نہیں لیکن تجارتی اور جنگی حیثیت سے نہایت باموقع ہیں۔ عربوں اور ترکوں نے انکو بیکار چھوڑ دیا تھا "خانہ خالی را دیو می گیرد" اب طبعی طور سے انگریزی قبضہ میں ہیں۔ اور کوئلہ کمپنی کے مرکز ہیں۔ آنے جانیوالے جہازوں کو کوئلہ دیکر جو نفع یہاں پیدا ہوسکتا ہے اسکا تصور کر سکتے ہیں۔ یہ حق کس

ہے اور کس کو پہونچ رہا ہے۔

چند گھنٹوں میں یہاں سے جہاز چلا تو دوسرے دن صبح کو عدن نظر آیا۔ صبح کو پہونچے تھے اور بارہ بجے تک فرصت تھی۔ بڑے ذوق و شوق سے اترے کہ کم از کم اس ارض اقدس کے ایک گوشہ ہی کے دیدار سے اپنی آنکھوں کو منور کرلیں۔ ذہن میں نقشہ تھا کہ ساحل پر قدم رکھتے ہی بڑی بڑی عباؤں میں ہم کو عرب نظر آئینگے لیکن ساحل سے لیکر شہر عدن تک ہم کو خاص عرب صورت کوئی نظر نہ آئی۔ یا ہندوستانی نظر آئے یا صومالی۔ ہندوستان کے گجراتی ہندو اور ہندو بنئے وہی اپنی دھوتی اور ترازو کیساتھ نظر آئے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ بھی ہندوستان ہی کا ٹکڑا ہے۔ تمام قطعہ ارض پہاڑی ہے۔ شہر نہایت بدصورت اور بدنما معلوم ہوتا ہے۔

پہاڑی کے دامن میں ایک طرف کچھ پرانے آثار ہیں۔ ان کو دیکھنے گئے۔ یہاں پانی نہایت کمیاب ہے۔ حمیر اور سبا نے جو یمن کی سب سے قدیم اور متمدن قومیں تھیں بارش کے پانی کو روکنے کیلئے اور اسکو پینے اور زراعت کے کام میں لانے کیلئے بڑے بڑے سنگی بند اور حوض بنائے تھے اس قسم کے بند اور حوض عدن میں بھی تھے۔ یہ مدت سے ریت اور بالو میں دفن ہوگئے تھے۔ انگریزوں نے انکو اب صاف کرایا ہے۔ انکو جاکر دیکھا۔ پہاڑوں کے دروں کو کاٹکر نہایت ہوشیاری سے سوراخوں اور درازوں کو مسالے سے بند کرکے قدرتی نالوں کو درست کرکے اوپر نیچے تین چار بڑے بڑے حوض تیار کئے ہیں جنمیں علی الترتیب پانی جمع ہوتا ہے اوپر کا حوض لبالب ہوگیا تو نالی کی راہ سے دوسرے میں پانی آگیا۔ اس سے تیسرے میں بھر چوتھے میں ـــــ دیکھکر سخت حیرت ہوئی کہ کس خوبصورتی اور مضبوطی اور انجنیری سے یمن کے پرانے باشندوں نے ان حوضوں کو تیار کیا تھا کہ ہزاروں برس گزرنے پر بھی ابتک وہ تازہ معلوم ہوتے ہیں کلام پاک کی وہ آیت یاد آئی جسمیں سبا کی عظمت اور انکی تباہی کا حال بیان کیا گیا ہے۔

آپ یہ تصور کرکے خوش ہو رہے ہونگے کہ اس خشک ملک میں جہاں پانی کا ہمیشہ کال رہتا ہے گورنمنٹ نے ان حوضوں کو صاف کرکے پھر زمانہ قدیم کیطرح باشندوں کیلئے آب رحمت کا سامان کردیا ہے۔ یہ خوشی درست ہے صرف اسقدر معلوم ہونا اور باقی ہے کہ یہ آب رحمت بہت گراں بکتا ہے۔ یعنی صرف پچاس ہزار روپیوں کے بدلے اسکا پانی گزشتہ سال نیلام ہوا تھا۔

عدن دیکھنے کی جتنی تمنا تھی اسکو دیکھکر اتنا ہی افسوس ہوا۔

عدن کے بعد اب بمبئی ہے اور ہر وقت اسکے ساحلوں کا انتظار ہے۔

(بقیہ بزم ریاض از صفحہ ۸۰)

العمران کراچی

مکرمی ـــــ السلام علیکم

سید صاحب قبلہ پر میرا ایک مضمون انگریزی اخبار مارننگ نیوز میں چھپا تھا نظر ثانی کرکے وہی اردو میں ارسال خدمت کررہا ہوں قبول فرمایئے گا

ابھی سمجھے کہاں ہیں ہم کہ کیا کچھ کھو کے بیٹھے ہیں

والسلام مخلص سید اکبر علی

(بر صفحہ ۱۰۷)

علامہ سید سلیمان ندوی رحمتہ اللہ علیہ

سید عزالدین ندوی قیم خانقاہ سلیمانیہ پھلواری شریف ضلع پٹنہ (بہار)

گرچہ شیریں دہنان بادشہانند ولے
آن سلیمان زمان ست کہ خاتم با اوست

دنیائے اسلام کا یہ سانحہ عظیم بھی بڑا حسرت ناک ہے کہ حضرت العلام سید سلیمان ندویؒ اس فانی دنیا سے عالم آخرت کی طرف کوچ کر گئے۔ سید صاحب رحمتہ اللہ نے جس ماحول میں تربیت پائی اور جن گودوں میں پلے اور جن سہاروں نے انہیں زندگی بخشی ان کا قدرتی تقاضا یہی تھا کہ وہ مخدوم بنتے اور بنے سید قوم ہوتے اور ہوئے عالم اسلام کے بڑے سے بڑے رہنماؤں کی صف اول میں ان کی جگہ بنتی اور بنی، ان کی ابتدائی تعلیم پھلواری شریف کی مشہور عالم (علم وعمل کی) بستی میں ہوئی اور اسی ماحول سے کچھ سیکھ کر وہ دارالعلوم ندوہ گئے پھلواری شریف میں ان کے اساتذہ کی فہرست میں حضرت مولانا سید شاہ محمد سلیمان صاحب قادری چشتی کا اسم گرامی بھی ہے جسے سید صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے ایک مضمون میں جو حضرت شاہ سلیمان صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی وفات پر سپرد قلم فرمایا ہے، وضاحت کی ہے حضرت سید صاحبؒ کی زندگی کے کارنامے بے شمار اور بے حد روشن ہیں۔ اہل قلم حیران ہیں سینہ کوب ہیں اور آفتاب علم کی اس اچانک جدائی پر صف ماتم بچھی ہوئی ہے ہندوستان و پاکستان ہی نہیں بلکہ سارا عالم اسلام نعم البدل ڈھونڈھ رہا ہے لیکن مل نہیں ملتا اور نہ ملنے کی امید ہے، حال یہ ہے کہ گذشتہ ساٹھ ستر سال کی تاریخ میں ملت کے غم خوار و درد آشنا علماء نے جن میں نمایاں ہستیاں حضرت مولانا لطیف اللہ علی گڑھیؒ حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ حضرت مولانا شاہ سلیمان پھلواریؒ کی تھی ندوۃ العلماء کے نام سے ایک مجلس قائم کی تھی اور اس مجلس نے ایک تعلیم گاہ کا افتتاح کیا تھا اسی تعلیم گاہ کے ایک آفتاب عالم تاب حضرت مولانا سید سلیمان ندوی تھے، بلاشبہ بڑے فخر کے ساتھ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ سید صاحبؒ کا وجود گرامی اس تعلیم گاہ کی روح کا نچوڑ اور عطر تھا اور دارالعلوم ندوہ اگر سید صاحبؒ کے علاوہ کسی اور کو نہ بھی پیدا کرتا تو وہ اپنے مقصد میں کامیاب تھا، وہ دارالعلوم ندوہ کی ایک ایسی گرانمایہ پیداوار تھے جس پر ندوہ اور سارے ندوی ہمیشہ ناز کریں گے اگرچہ وہ ساری امت مسلمہ کے مخدوم و مطاع تھے ساری قوم بھی انہیں اسی طرح رو رہی ہے جس طرح ندوی ماتم کناں ہیں، حضرت مغفور کی زندگی کے کام اتنے زیادہ ہیں جن کا گننا دشوار نہیں دشوار تر ہے، تصنیفوں کا جو ذخیرہ چھوڑ گئے ہیں وہ اس درجہ قیمتی اور نفع بخش ہے کہ اس کا صحیح اندازہ امت کے خواص ہی کر سکتے ہیں، سیرت النبی کی جلدیں سبحان اللہ کیا کہنے ہیں ان کے، دربار رسالت کا مقبول کارنامہ نجات کے لئے یہی بس ہے کہ مصنف و تصنیف دونوں بارگاہ رسالت میں مقبول ہیں اور اس فیروز بختی کا بھی کیا کہنا ہے کہ اس راہ میں بھی اتنے آگے گئے ہیں کہ جہاں ان کے معاصرین نہیں پہونچ سکے ہیں حضرت رسالت سے جن تصنیفوں کو شرف قبول بخشا گیا ہے، جہاں امام دارالہجرت مالک ابن انس کی موطا اور دیگر فقہاء و محدثین کی بعض تصنیفیں مصلح الدین شیرازی سعدی کی گلستان و بوستان و علامہ بوصیری کا قصیدہ بردہ ہیں وہاں مولانا سید سلیمان ندویؒ اور ان کی تصنیفوں کا عطر و نچوڑ "سیرت النبی" کی جلدیں بھی ہیں، اہل قلم مقالات لکھ رہے ہیں اور ان کی زندگی کے مختلف گوشوں پر خامہ فرسائی ہو رہی ہے اور میرے عزیز و محترم بھائی مولانا سید رئیس احمد جعفری کی فرمائش و عنایت پر میں بھی ایک مقالہ ماہنامہ "ریاض" کے سید سلیمان نمبر کے لئے آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں مگر میں ان کی زندگی کے ایک خاص روشن پہلو کو بحث لا رہا ہوں وہ یہ کہ سید صاحب رحمتہ اللہ اپنی تمام خوبیوں کے ساتھ حدیث خیر الناس من ینفع الناس بہترین انسان وہ ہے جو دوسروں

کو نفع پہنچانے کی ایک زندہ تفسیر تھے علم پروری ان کی خمیر کا ایک جزء بن گئی تھی ان کی ذات صدہا بے پناہ اہل علم کے لئے ایک بڑا سہارا تھی وہ اپنے معاصرین کو بھی فائدہ پہونچانے سے گریز نہیں کرتے تھے، ندوۃ العلماء کے وابستگان میں کوئی ایسا نہیں جو ان کا ممنون کرم نہ ہو خصوصاً میرے ساتھ ان کی کرم فرمائیاں اس حد تک بڑھی ہوئی تھیں کہ مجھے کبھی یہ محسوس نہ ہو سکا کہ میں اس دنیا میں بے سہارا ہوں، خدا شاہد ہے میری تمناؤں کو پروان چڑھانے والے میری علمی ترقیوں سے خوش ہونے والے میرے بڑے محسن اور سب کچھ وہ تھے، دارالعلوم ندوہ سے فارغ ہوتے ہی مجھے موتیہاری ضلع چمپارن میں شعبہ تبلیغ وصدر مدرسی کی ایک جگہ مل گئی تھی سید صاحب رحمۃ اللہ نے اس کی ایک ہلکی سی مبارکباد کے بعد مجھے ایک ایسا مربیانہ شفقت ومحبت بھرا خط لکھا جس کے لفظ سے رس ومٹھاس ٹپک رہی تھی، اس خط کا اقتباس بھی ہدیہ ناظرین ہے،

عنوان یوں ہے

برادرم مولوی شاہ عزالدین صاحب صدر شعبہ تبلیغ وصدر مدرس مدرسہ اسلامیہ موتیہاری

عزیزی، زاد علمہ وفضلہ، السلام علیکم۔

افسوس ہوا کہ میرا اصلی خط (یعنی پہلا خط) آپ کو نہیں ملا ورنہ آپ اس افسردہ دلی سے میرے خط کا جواب نہ دیتے میں نے اس میں سب کچھ لکھا تھا اور محبت سے لکھا تھا، نواب صدر یار جنگ شروانی آپ کو میمن عبدالعزیز صاحب کے پاس علی گڑھ بھیجنا چاہتے ہیں دو برس کے لئے، تاکہ وہاں سے واپس آکر آپ ندوہ میں درس ادب کا کام کریں، چونکہ مجھے معلوم ہے کہ آپ کو ذوق ادب ہے اس لئے مناسب سمجھا کہ آپ کو اس فن میں ترقی وتکمیل کا موقع بہم پہنچاؤں، آپ موجودہ معاوضہ کی کمی وبیشی کا دھیان بھی نہ لائیے، بلکہ اپنی علمی ترقی وتکمیل اور ابھرنے کے مواقع کو دیکھئے، تو کیا آپ چالیس روپئے ماہوار کے وظیفہ پر دو سال علی گڑھ میں میمن عبدالعزیز صاحب مشہور ماہر ادبیات عرب وکاتب ولغوی کے پاس رہ کر تکمیل کرنا پسند کریں گے تاکہ دو برس کے بعد ندوہ آکر آپ ندوہ میں درس ادب کی خدمت انجام دیں۔ . . . . . .

. . . . الغرض دو شکلیں ہیں اور دونوں میں سے ایک کے لئے آپ کو تیار ہونا چاہیئے ورنہ کسی اور کا انتخاب کرنا ہوگا،

والسلام

سید سلیمان

۱۲ دسمبر ۱۹۴۰ء

کرم کا یہ موجزن دریا اور دل پر قابو پانے والا بلکہ چھا جانے والا یہ جادو ایسا نہ تھا جس کی کوئی کاٹ ممکن تھی، میں نے فوراً جواب دیا فرمان کے مطابق موتیہاری چھوڑنے پر آمادہ ہوں لیکن ان کا جواب بھی عربی کی دو سطروں میں آگیا۔

عزیزی اکرمک اللہ السلام علیکم ورحمتہ اللہ

لا تَعْجَلْ فِی الْأُمورِ وتَرَبَّصْ حَتّٰی یا تِیَکَ کِتابی فَاِنَّ الشَّرْ وانی حتی الآن لَمْ

یُقطَع اَمْراً

والسلام

سلیمان الندوی

۲۰ دسمبر ۱۹۴۰ء

یہ خط وکتابت اس وقت ہوئی تھی جب میری عمر غالباً بائیس[۲۲] تئیس[۲۳] سال کی تھی اور میں مجرد رہ رہا تھا، خدا کی شان دیکھئے کہ یہ اسکیم دوبارہ بروئے کار نہیں آئی اور حضرت مغفور نے کچھ دنوں کے بعد ہی ناظم ندوہ ڈاکٹر سید عبدالعلی کے ذریعہ تقرری کا خط بھیجوا کر ندوہ میں ادب وتفسیر کی

جگہ پر مامور کردیا، پانچ سال تک اس منصب پر فائز رہنے کے بعد ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ کی طلب پر مجھے سید صاحب مغفور لہ نے شاہی مسجد لاہور کی خطابت و امامت کے لئے روانہ فرمادیا اور وہاں کی کارگذاری پر ہمیشہ خوش و خرم رہے اور برابر قیمتی رہنمائی فرماتے رہے، جب میں نے اپنی پہلی علمی کاوش کشف الظلام کے نام سے شائع کی تو پسند فرمایا لیکن بعض عربی اشعار کے ترجمہ کی اصلاح فرمائی میں نے اُن اصلاحوں پر اپنا تلمیذانہ شبہ پیش کیا تو مزید غور فرماکر بڑی صداقت کے ساتھ رجوع فرمالیا اور بڑی شفقت بھری نگاہوں سے دیکھا جس کی لذت و کسک دونوں ہی آج تک محسوس کرتا ہوں اور یہ ایک ایسا انوکھا اتفاق ہے کہ آج سے ۲۰-۲۵ سال ادھر سید صاحبؒ نے جن اشعار کے ترجمے کی اصلاح فرمائی تھی وہ اُن کے سانحہ ارتحال سے ایک گہری مناسبت رکھتے ہیں ان اشعار میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ اس فقیہ امت کے حالات سے ہو بہو مطابقت رکھتا ہے اشعار یہ ہیں ۔

فَلَيْتَ الْمَنَايَا كُنَّ خَلَّفْنَ عَاصِمًا
فَعِشْنَا جَمِيعًا أَوْ ذَهَبْنَ بِنَا مَعًا

کاش کہ موت عاصم کو چھوڑ دیتی تو ہم دونوں
ساتھ جیتے یا ہم دونوں کو ایک ہی ساتھ لیجاتی

دَفَعْنَا بِكَ الْأَيَّامَ حَتّٰى إِذَا أَتَتْ
تُرِيدُكَ لَمْ نَسْطِعْ لَهَا عَنْكَ مَدْفَعًا

زمانے کی مصیبتوں کو ہم تیرے سہارے دور کرتے رہے لیکن جب وہ تجھی کو چاہتی آگئیں تو ہم ان کو تجھ سے ہٹا نہ سکے

آج اسی طرح امت اسلامیہ ندوہ و اہل ندوہ ہم زبان ہو کر اپنے عاصم کے غم میں سوگوار ہیں ان کا عاصم کھو گیا اور جو جگہ اس نے چھوڑی ہے اُسے پُر کرنے والا کوئی نہیں قوم روئیگی اور روتی رہے گی لیکن یہ گنج گراں مایہ پھر کبھی نہ ملے گا، سید صاحب رحمۃ اللہ جب "معارف" میں "ہندوستان میں علم حدیث" کے نام سے ایک طویل و بسیط مقالہ لکھ رہے تھے اس وقت مجھ ناچیز سے فرمائش کی کہ صوبہ بہار اور پھلواری شریف میں کن کن واسطوں سے علم حدیث پہونچا ہے اس پر ایک مقالہ لکھو۔ میں نے حکم کی تعمیل کی تو معارف میں اسے شائع فرمایا میرے مضمون پہونچنے کی اطلاع خط کے ذریعہ ان الفاظ میں دی ۔

عزیز محترم السلام علیکم
آپ کا مضمون علم حدیث پر پہونچا اس کی بہت ضرورت تھی، انشاء اللہ تعالیٰ معارف میں شائع ہوگا ۔

والسلام
سید سلیمان
۲۱ مارچ ۲۳ء

علم دوستی و علم پروری کی ایک انوکھی مثال مولانا عبدالعزیز میمن کی ہے، میمن صاحب اورینٹل کالج لاہور میں ادبیات عرب کے استاذ تھے ان کی مہارت فن کو دیکھ کر سید صاحبؒ ان کو کسی اونچے منصب پر دیکھنے کے خواہش مند تھے، علی گڑھ یونیورسٹی سے سید صاحب کو گہرا لگاؤ تھا وہاں صدر شعبہ ادبیات عرب کی جگہ خالی ہوئی تو انہوں نے بڑی کوششوں سے میمن صاحب کو نامزد کرایا اور اتنی بڑی جگہ پر بڑے معاوضہ کے ساتھ چپکا دیا، اس واقعہ کا تذکرہ سید صاحب رحمۃ اللہ نے ناچیز سے بذات خود فرمایا تھا، موقع یہ تھا کہ دارالعلوم ندوہ میں مالی معاوضہ کی کمی بیشی پر گفتگو چل پڑی تھی فرمانے لگے میں خود تو دارالمصنفین سے اب تک ایک واجبی رقم لیتا رہتا ہوں لیکن اپنے دوستوں کو گراں قدر تنخواہوں پر مامور کرتا ہوں میمن صاحب کو ساڑھے آٹھ سو روپیوں کی جگہ پر رکھا آیا ہوں اللہ اکبر علم پروری و علم شناسی کی حد ہو گئی، میمن صاحب بذات خود کسی وجہ سے

غالباً سید صاحبؒ سے خوش نہیں تھے۔ لیکن اس پرواہ کے بغیر ان کے علم کی ایسی قدردانی صرف سید صاحبؒ کا کارنامہ ہو سکتا ہے۔ اب دکھے ہوئے دل اور بہتے آنسوؤں کے درمیان ان کی ایک تحریر کا حوالہ دیکر رخصت ہوتا ہوں، دارالعلوم ندوہ کے ایک سالانہ اجلاس کے موقع پر چار سلیمان جمع تھے قاضی محمد سلیمان منصورپوری، مولانا سلیمان اشرف صدر شعبہ دینیات علی گڑھ یونیورسٹی، حضرت مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواری علامہ سید سلیمان ندویؒ حضرت شاہ سلیمان صاحب پھلواری نے فرمایا پہلے سلیمان فرد تھا اب رباعی ہے مولانا سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں اور کس حسرت سے فرماتے ہیں کہ قاضی محمد سلیمان صاحب کی وفات سے چند سال گذرے کے مثلث ہو گئی اور حضرت شاہ سلیمانؒ کی وفات سے ۲ صفر کو قطعہ ہو گئی اب اس رباعی کے صرف دو مصرعے باقی ہیں" راقم الحروف (عزالدین) کہتا ہے یہ دو مصرع بھی کچھ دن پیشتر سے فرد بن گئے تھے اور آخری فرد دریتیم علامہ سید سلیمان ندوی کی ذات گرامی تھی، افسوس کہ وہ فرد بھی چند دن پیشتر سمٹ گیا، انا للّٰہ وانا الیہ راجعون لیکن مولانا سید سلیمان ندویؒ کی موت اپنے پیچھے ایک ایسا سرمایہ علم و خدمت چھوڑ گئی ہے جو رہتی دنیا تک ان کا نام و کام باقی و روشن رکھے گا۔

قَدْ مَاتَ قَوْمٌ وَمَا مَاتَتْ مَكَارِمُهُمْ
وَعَاشَ قَوْمٌ وَهُمْ فِيْنَا كَأَمْوَاتٍ

بلاشبہ مولانا سید سلیمان ندویؒ تنہا امت تھے، قوم تھے اور سب کچھ تھے حضرت مولانا شاہ سلیمان پھلواریؒ کی دعاؤں نے علامہ سید سلیمان ندوی جیسا گوہر پیدا کیا تھا اب نہ شاہ سلیمانؒ ہیں اور نہ سید سلیمان ندویؒ، کیا توقع کی جائے کہ ہندوستان و پاکستان میں کوئی سید سلیمان ندویؒ پیدا ہو گا اللہ تعالیٰ ان کے مدارج فزوں سے فزوں تر کرے، قیامت تک ان کی قبر انوار و برکات کا سرچشمہ رہے آمین۔

۶۴، عبدالعزیز لین، بسیل خانہ، ڈھاکہ

بقیہ بزم ریاض

یکم فروری ۱۹۵۴ء

اخی المکرم علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ میرے ان بڑے بھائیوں میں تھے، جن کا احترام میں برابر کرتا رہا، اور ان کی شفقت و محبت بھی میرے ساتھ ہمیشہ رہی۔

ان کی وفات کا حادثہ فاجعہ ایسا نہ تھا جس کی خبر سن کر میں صرف کچھ افسوس کر کے رہ جاتا کیونکہ یہ موت صرف ایک انسان کی موت نہ تھی بلکہ علم و ادب کی موت تھی، اور میرے لئے بلکہ مجھ جیسے کتنوں کے لئے شفقت و محبت کی موت تھی، انا للّٰہ وانا الیہ راجعون

اگر آج بھی میں کچھ پہلے جیسی زندگی گذارتا تو یقیناً اپنی قلبی کیفیتوں کو مرثیہ و قطعات تاریخ وغیرہ کے ذریعہ ظاہر کرتا۔ مگر چند برسوں سے کچھ ایسی زندگی گزار رہا ہوں کہ گویا ہر وقت موت کا منتظر بیٹھا رہتا ہوں، اس لئے اعزہ و احباب میں سے کسی کی رحلت کی خبر سن کر تقاضائے فطرت حسب تعلقات متاثر تو ضرور ہو جاتا ہوں، مگر کچھ ہی دیر کے بعد دل مطمئن ہو جاتا ہے یہ سمجھ کر کہ اچھا وہ پہلے سہی، میں بھی تو کمربستہ تیار ہی ہوں۔ اس لئے نہ اب کسی عزیز کا مرثیہ لکھتا ہوں نہ کسی کا قطعۂ تاریخ وفات، دل ہی اس کی طرف مائل نہیں ہوتا۔

بھائی صاحب ممدوح رحمہ اللہ جیسی علمی جامعیت میری نظر سے نہیں گذری، یہی وجہ تھی کہ باوجود اس کے کہ مجھ سے ان سے شرعی امور میں کچھ اختلافات تھے، میں ان کا بہت احترام کرتا تھا، اور ان کی تحریروں کو بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھتا تھا، اور ان کی باتوں کو جی لگا کر سنتا تھا،

سیّد صاحبؒ

نقوش و تاثرات

رئیس احمد جعفری

مجھے اپنے والد کی صورت یاد نہیں، لیکن ان کا سانحۂ وفات خواب سا یاد ہے، گھر میں کہرام مچا ہوا تھا، میں حیران و پریشان ادھر ادھر دیکھ رہا تھا، کہ اتنے میں شبرتیا آئی، یہ ہمارے گھر کی پروردہ تھی، اگرچہ عجیب الخلقت تھی، یعنی نوجوان مردوں کی طرح مسیں بھیگی ہوئی تھیں، اور سبزہ آغاز بھی تھی، لیکن میں اس سے مانوس بہت تھا، وہ خود بھی رو رہی تھی، بار بار اپنے دوپٹے سے آنسو پونچھتی تھی، اس نے میری انگلی پکڑی، اور پڑوس کے ایک گھر میں لے گئی، وہاں کے بچوں نے مجھے گھیر لیا، اور میں گھر کا سانحۂ عظیم بھول کر ان کے ساتھ کھیل میں لگ گیا، خدا نے ماں ایسی دی تھی جس نے پورے طور پر باپ کی قائم مقامی کا فرض ادا کیا، والدہ نے میری اور میرے بڑے بھائی سید عقیل احمد جعفری کی جس استقلال و عزیمت کے ساتھ تربیت کی، اس کی مثال کم ملے گی، ہر طرح کے ناموافق حالات کا انہوں نے مردانہ وار مقابلہ کیا، اور اپنا کام جاری رکھا، والد کے انتقال کے وقت بھائی صاحب انگریزی مدرسہ میں پڑھ رہے تھے، میں اگرچہ ابھی تعلیم و تدریس کی پابندیوں سے آزاد تھا، پھر بھی گھر پر ایک حافظ جی رکھ لئے گئے، انہوں نے قرآن شریف سے تعلیم کا آغاز کیا، والدہ کی نیت یہ تھی، کہ ایک بیٹا انگریزی پڑھے، دوسرا عربی، کچھ عرصہ بعد والدہ اپنے والد سید نیاز احمد صاحب سپرنٹنڈنٹ پولیس کے پاس بھوپال چلی گئیں، وہاں پھر ایک حافظ صاحب تلاش کئے گئے، بھوپال کی آب و ہوا راس نہ آئی، چند ماہ کے بعد ہمارا قافلہ وطن واپس پہنچا، اور از سر نو حافظ کی تلاش شروع ہوئی، کوئی معقول آدمی نہ ملا تو غم جدائی برداشت کرکے لکھنؤ مدرسۂ فرقانیہ میں بھیج دیا، کچھ دن وہاں گزر رہے، لیکن بھائی صاحب چل گئے، "معارف" بڑے بابا (حضرت ریاضؔ) کے پاس آتا تھا، معارف پڑھتے پڑھتے وہ مولانا سید سلیمان ندوی کے بڑے قائل اور معترف ہو گئے تھے، ہر وقت ان کا ذکر کرتے، اور والدہ سے اصرار کرتے کہ مجھے ندوہ بھیج دیں، جب یہ سوال اٹھا بڑے بابا بھی ان کی پُرزور تائید کرتے نتیجہ یہ ہوا کہ میں ندوہ میں داخل کر دیا گیا، یہ ۱۹۲۲ء کا واقعہ ہے، میری عمر اس وقت ۱۰-۱۱ سال کی تھی، ندوہ میں داخل ہوتے وقت میرے دل میں دبا ہوا ایک شوق یہ بھی تھا کہ مولانا سید سلیمان ندوی کو دیکھوں گا، ـــــــ لیکن وہ وہاں کہیں نظر نہ آئے ـــــــ اب میں اپنے ذہن میں ان کی تصویر تصوّر کے موقلم سے بنانے لگا، ممکن ہے، وہ سیتاپور کے حافظ کلّو کی طرح نابینا اور سیاہ رو ہوں، ممکن ہے وہ خیرآباد کے مولوی حفیظ الدین کی طرح لمبی داڑھی والے اور دراز قد ہوں، ممکن ہے وہ بھوپال کے قاری بختیار کی طرح خوش گلو اور خوش اندام ہوں، ممکن ہے وہ مدرسۂ فرقانیہ کے حافظ معصوم علی کی طرح بڑی بڑی آنکھوں والے اور ہر وقت ہنسنے والے ہوں ـــــــ لیکن وہ کہاں ہیں؟ کیوں نہیں آتے؟ کب آئیں گے؟ ان میں اور ندوہ میں اتنا بُعد کیوں ہے؟ بھائی صاحب تو کہا کرتے تھے ندوہ انہی کی ذات سے قائم ہے ـــــــ

یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے ؟

——— دن گزرتے گئے، یہاں تک کہ تعلیم کا پہلا سال ختم ہو گیا، رفتہ رفتہ سید صاحب کو دیکھنے کا اشتیاق بھی، مرورِ ایام کی نذر ہو گیا ——— البتہ کبھی کبھی ایک بات ضرور دل کو پریشان کرتی تھی، بھائی صاحب ضرور دریافت کریں گے، تم نے سید صاحب کو دیکھا ؟ پھر میں کیا جواب دوں گا ؟ لیکن دنوں کے گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ کھٹک بھی ختم ہو گئی !

ندوہ کا دوسرا تعلیمی سال شروع ہوا، بورڈنگ ہاؤس میں صبح ۹ بجے کھانا ملتا تھا، اور شام کو مغرب کے فوراً بعد کبھی کچھ دیر ہو جاتی کھانے پکنے میں، تو یہ وقت دریائے گومتی کے کنارے کھیل کود اور بات چیت میں صرف ہوتا، گومتی اور ندوہ میں صرف ایک سڑک حائل ہے ۔

ایک روز کھانے میں کچھ دیر تھی، اور لڑکے مختلف ٹولیاں بنائے ہوئے، ادھر ادھر سیر گشت کر رہے تھے، ندوہ میں حفظ مراتب اور چھوٹے بڑے کا بہت خیال رہتا تھا، ایک چھوٹا لڑکا ایک بڑے لڑکے کا اتنا ہی احترام کرتا تھا، جتنا ایک چھوٹا بھائی بڑے بھائی کا کر سکتا ہے، چنانچہ جب ٹولیاں بنتی تھیں، چھوٹوں اور بڑوں میں حد فاصل قائم رہتی تھی، تھوڑی دیر میں دیکھتا کیا ہوں، ایک بڑے طالب علم عبد السلام صاحب صفا کے ساتھ ایک وجیہ اور خوش شمائل مولانا ڈائننگ ہال کی طرف بڑھ رہے ہیں، اور بہت سے بڑے لڑکے ادب و تمیز سے پیچھے پیچھے چل رہے ہیں، ان صاحب کی وضع ندوہ کے عالم اساتذہ سے بالکل مختلف تھی، سر پر سفید براق عمامہ، سیاہ داڑھی، شیروانی کے تمام بٹن گلے تک لگے ہوئے، ہاتھ میں ایک چھڑی، چہرہ دل آویز، سحر انگیز آنکھیں، پتلے پتلے ہونٹ آواز نہ پست نہ بلند، لیکن اس میں ایک خاص قسم کا وقار، ہونٹ تبسم سے آشنا، زبان جواب دینے میں مصروف، باتیں کرنے والے طالب علموں میں ہر شخص بے تکلف بھی، اور مؤدب بھی !

مجھے اشتیاق پیدا ہوا، یہ کون بزرگ ہیں ؟ ایک سے پوچھا، دوسرے سے پوچھا، لیکن کوئی جواب نہیں دیتا، اور وہ قافلہ کے ساتھ ساتھ چلنے میں ہمہ تن منہمک، چند قدم کا فاصلہ تھا، ذرا دیر میں ڈائننگ ہال پہنچ گئے، یہاں پہنچکر معلوم ہوا یہ ہیں مولانا سید سلیمان ندوی، ——— آہا یہ ہیں ؟ اب کیا تھا، بھیڑ کو چیرتا پھاڑتا میں بھی پہنچ گیا، لیکن ہر طرف سے دھکے دے کر نکالا گیا، ——— کوفت ضرور ہوئی، لیکن کوفت پر مسرت غالب تھی، مولانا سید سلیمان کو دیکھ لیا، گھر پہنچوں گا تو سب سے پہلے بھائی صاحب کو "آنکھوں دیکھا حال" سناؤں گا !

اب سید صاحب بار بار ندوہ آنے لگے، اور انہیں دیکھ دیکھ کر جی خوش ہونے لگا، لیکن یہ فصل بہار جلدی ختم ہو گئی، جلد ہی اندازہ ہو گیا، چھوٹے لڑکوں کے لئے سید صاحب درشت مزاج بھی ہیں، اور سخت گیر ممتحن بھی، ذرا سی غلطی پر رکھائی سے ٹوکتے ہیں، اور (ایک مرتبہ نہیں) ہر ملاقات میں اگلا پچھلا سبق ضرور پوچھتے ہیں، یہاں یہ کیفیت کہ سالانہ امتحان وبال جان بنا ہوا تھا، یہ بار بار کا امتحان دینے پر کون تیار ہوتا ؟ نتیجہ یہ ہوا کہ سید صاحب سے جی کھٹا ہو گیا، طبیعت بجھ گئی، اب وہ آتے تو خوشی نہ ہوتی، طبیعت منغص ہو جاتی، ——— نہ جانے کس غلطی پر ٹوک بیٹھیں، نہ جانے کیا سوال کر ڈالیں ؟

یہ کیفیت میری ہی نہیں کئی بڑے طالب علم بھی اس مرض میں مبتلا تھے، مثلاً سید سعید اشرف صاحب ندوی کا شمار طلبائے کبار میں ہوتا تھا، عربی ادب پر طالب علمی ہی کے زمانہ میں اچھا درک حاصل کر لیا تھا، برجستہ عربی تقریر اور فی البدیہہ عربی تحریر کے لئے

اکثر اساتذہ کی طرف سے وہ دوسرے معزز مہمانوں کے سامنے پیش کئے جاتے، سیّد صاحب ان کی خاصی قدر کرتے تھے، لیکن یہ

نے تاب وصل دارم نے طاقتِ جدائی

کی مصیبت میں گرفتار رہتے، نمایاں اور ممتاز طالب علم تھے، لہٰذا کبھی بکر پتّوں کی آڑ میں نہیں چھپ سکتے تھے، اتفاق کی بات سالانہ امتحان میں مضمون میں اچھے نمبر حاصل کئے، لیکن فلسفہ کے مضمون میں چند نمبروں سے فیل ہو گئے، مہتمم صاحب کی سفارش پر معتمد تعلیمات یعنی سید صاحب نے ترقی دے دی، ترقی حاصل کرنے کے بعد، پہلی مرتبہ سعید اشرف صاحب سیّد صاحب کے سامنے آئے، سید صاحب نے چھوٹتے ہی سوال کیا،

"کہیئے امتحان میں پاس ہو گئے آپ"؟ ——— بڑا چُبھتا ہوا سوال تھا! کسی اور نے یہ سوال کیا ہوتا تو شاید سعید اشرف صاحب، علی الاعلان، اپنے "پاس" ہونے کا اقرار کر لیتے، لیکن یہ سوال وہ کر رہا تھا جس نے ترقی دی تھی، سعید اشرف صاحب سٹ پٹا گئے، بے ساختہ فرمایا،

"جی میں "مترقی" ہوں ——— !"

سید صاحب نے فوراً ٹوکا،

"مترقی" کس کو کہتے ہیں؟ ——— ذرا اس لفظ کی تشریح تو کیجئے!"

اگر کسی جلسۂ عام میں سعید اشرف صاحب کے فیل ہونے کا بہ بانگ دہل اعلان کیا جاتا تو بھی شاید ان کی یہ حالت نہ ہوتی، جو اس وقت نظر آ رہی تھی! جواب دیا وہ بھی غلط! ——— اور حالت یہ کہ زبان لڑکھڑا رہی تھی، پاؤں کانپ رہے تھے، اتنے میں کاشغری صاحب آ گئے، اور سعید صاحب کی جان بچی، ——— لیکن جان بچی کہاں، وہ تو جا چکی تھی! بہت دیر کے بعد، بلکہ بہت دنوں کے بعد واپس آئی! ——— !

شروع میں جتنا حسنِ ظن میرے دل میں سید صاحب کا تھا وہ اب دہشت اور خوف میں تبدیل ہو گیا، ڈرانے کے لئے، مولانا محمد سلیم، مولانا کلیم احمد، اور مولانا محمد شبلی فقیہ کیا کم تھے، کہ ایک اور ہستی نمودار ہو گئی، جس سے ڈرنا من جملۂ واجبات بن گیا! ——— مجھے اگر فطرت کی طرف سے کچھ ذہانت عطا ہوئی تھی، تو وہ صرف اس کام میں صرف ہونے لگی کہ میری اور سیّد صاحب کی بورڈنگ کے کمرہ یا تعلیم کے درجہ میں مڈبھیڑ نہ ہونے پائے، اور جہاں تک مجھے یاد ہے، میں اس مقصد جلیل میں پوری طرح کامیاب رہا، یعنی کبھی اس کی نوبت نہیں آئی کہ میں ان کی زد پر آ گیا ہوں، انہوں نے مجھے ٹوکا ہو، یا میرا امتحان لیا ہو، لیکن بکری کی ماں کب تک خیر منا سکتی تھی، کئی سال بعد ایک روز آمنا سامنا ہو ہی گیا، میں غالباً درجۂ چہارم میں پڑھتا تھا، ایک روز دفعتہ سیّد صاحب تشریف لے آئے، اور بجائے اس کے کہ حسب معمول امتحان لیں، دریافت فرمایا،

"اس درجہ میں رئیس احمد کون لڑکا پڑھتا ہے؟"

اس اعزاز پر سب کی نظریں میری طرف اٹھ گئیں، ——— اور اس ابتلا پر میری نظریں جھک گئیں، ——— اب کیا ہوگا؟ میں اپنی جگہ بت بنا کھڑا رہا، سید صاحب میرے قریب ہی کھڑے تھے، اور زیادہ قریب آ گئے، فرمایا،

"ماجد میاں[1] تمہاری ذہانت اور سلامت روی کی تعریف کرتے ہیں، تم مجھ سے کیوں نہیں ملتے؟"

---

[1] مولانا عبد الماجد دریابادی! ——— مولانا سے میرے لگاؤ اور تعلق کا واقعہ بجائے خود ایک داستان ہے جس کا یہ موقع نہیں،

میں نے عرض کیا،

"اب حاضر ہوا کروں گا!"

بات ختم ہوگئی، سیّد صاحب تشریف لے گئے، اور میں سوچنے لگا، یہ تو بڑی مشکل ہوئی، ماجد میاں میں اور سیّد صاحب میں زمین آسمان کا فرق ہے، وہ شگفتہ روئی سے ملتے ہیں، ہنستے ہیں ہنساتے ہیں، امتحان کبھی نہیں لیتے، صرف ایک مرتبہ امتحان لیا تھا، اَللّٰہُ یَسْتَھْزِءُ بِھِمْ وَیَمُدُّھُمْ فِیْ طُغْیَانِہِمْ پڑھ کر یعْمَھُوْن کے معنی پوچھے تھے، لیکن میری گھبراہٹ دیکھ کر خود ہی جواب دے دیا، اور پھر کبھی اس طرح کی کوئی بات نہیں کی، اپنے ساتھ تانگہ میں بٹھا کر کبھی فرنگی محل، لے جاتے ہیں کبھی امانظر تک ایجنسی، راستہ بھر اچھے اچھے اشعار سناتے ہیں، مزے مزے کی باتیں کرتے ہیں، اُن سے تو نبھ رہی ہے، لیکن یہ؟ —— یہ ضرور کسی لفظ کی تعلیل، کوئی گردان، کسی جملہ کی ترکیب، کسی بیڈھب لفظ کے معنی پوچھیں گے، اور ذراسی غلطی پر چھاڑ کر رکھدیں گے پھر کیا ہوگا؟ لیکن اسی زمانہ میں ایک واقعہ ایسا پیش آیا جس نے میری دہشت نکال دی، اور میری مشکل حل کردی۔

ہوا یہ کہ ایک روز سید صاحب درجہ میں تشریف لائے، انہوں نے چاک سے بلیک بورڈ پر لکھا،

"حسب ذیل الفاظ چھوٹے چھوٹے عربی جملوں میں کھپایئے:-

(۱) چھری، (۲) میز، (۳) ہیٹ، (۴) دیا سلائی، (۵) لوٹا،

سب لڑکے سر جھکا کر لکھنے کی کوشش کرنے لگے، میرے پاس میرے ایک ہم وطن دوست بیٹھے تھے، وہ ٹوٹے پھوٹے جملے تو کسی نہ کسی طرح بنا لیتے تھے، لیکن اللہ اور رسول کے علاوہ شاید کوئی عربی نام انہیں یاد نہیں تھا، جب اس طرح کا مرحلہ پیش آتا، وہ ساتھ والوں کے حافظہ سے فائدہ اُٹھا کر کام چلا لیتے، آج میری باری تھی، وہ میرے پاس تشریف فرما تھے، میں ابھی ایک جملہ بھی نہیں لکھ پایا تھا کہ اختر نے ٹھوکا لگایا، اور رازدارانہ انداز میں سرگوشی کرتے ہوئے پوچھا،

"چھری کی عربی کیا ہے؟"

میں نے کہا،

"سکّین، —— لیکن اب نہ پوچھنا، خود میری جان پر بنی ہوئی ہے، اور اگر کہیں باتیں کرتے سیّد صاحب نے دیکھ لیا تو اور غضب ہوجائے گا،! —— لیکن اختر ایسی باتیں سننے کے عادی نہیں تھے، جو مطلب کی نہ ہوں، تھوڑی دیر میں پھر انہوں نے ٹھوکا لگایا، اور پوچھا،

"میز کی عربی کیا ہے؟"

میں نے کہا، "العنقدس"

انہوں نے لکھ لیا، —— پھر دریافت کیا،

"ہیٹ کو کیا کہتے ہیں؟"

میں نے جواب دیا، "الخزاطیس"

یہ بھی جلدی سے لکھ لیا، شاید وہ ایک ہی دفعہ میں سب الفاظ لکھ لینا چاہتے تھے، پھر فوراً سوال ہوا،

"اور دیا سلائی؟"

میں نے پورے اطمینان کے ساتھ بتایا "الحمراء"

یہ بھی نوٹ کر لیا، اب ایک ہی لفظ رہ گیا تھا، پوچھا،

"لوٹا؟ ـــــ لوٹے کو کیا کہتے ہیں؟"

میں نے محبّت بھری نظروں سے انہیں دیکھ کر کہا،

"الغبراء لکھ لو!"

بیچارے نے پوری سعادت مندی سے یہ بھی لکھ لیا!

اس پندرہ منٹ کے بعد ہم سب نے اپنی اپنی کاپیاں سید صاحب کی خدمت میں پیش کر دیں، غلط جملے کاٹ دئے قابل اصلاح جملوں پر اصلاح دے دی، سب کی کاپیاں مل گئیں، لیکن اختر صاحب یونہی بیٹھے رہے، سیّد صاحب نے پوچھا

"یہ کاپی کس کی ہے؟"

اختر صاحب انعام کی امید میں کھڑے ہو گئے، سید صاحب نے انہیں ایک نظر دیکھا، اور فرمایا،

"یہاں آئیے!"

خوش خوش پہنچے، سیّد صاحب نے پوچھا،

"آپ نے یہ الفاظ کس لغت میں دیکھے ہیں؟"

کہیں دیکھے ہوتے تو بتاتے، چُپ! ـــــ اب کی سید صاحب نے بارعب اور بلند آواز میں فرمایا،

"آپ الفاظ تصنیف کرتے ہیں؟ ـــــ!"

اختر صاحب کی سٹی گم ہوگئی، لیکن فوراً ہی وہ اعلائے کلمۃ الحق پر تُل گئے، انہوں نے میری طرف اشارہ کرکے بڑے معصوم لہجہ میں فرمایا،

"انہوں نے بتائے ہیں!"

اب میری پیشی ہوئی، سید صاحب نے ایک تبسّم کے ساتھ پوچھا،

"یہ کیا حرکت تھی؟"

میں نے کہا، ـــــ "پہلا لفظ میں نے صحیح بتایا تھا، اور منع کر دیا تھا، اب نہ پوچھنا، لیکن یہ پوچھتے گئے، میں نے بھی جو جی میں آیا بتا دیا!"

سید صاحب نے شفقت بھری نظروں سے مجھے دیکھا، مسکرائے، اختر کو کاپی دی، اور واپس چلے گئے!

اس تبسّم نے مجھ سے کہا، "سیّد صاحب کو تم نے غلط سمجھا ہے!" میں نے مان لیا، اور ان کی خدمت میں حاضر ہونے لگا، البتہ اتنی احتیاط ضرور کرتا تھا، قبل اس کے کہ سید صاحب کوئی سوال مجھ سے کریں، میں خود کوئی اشکال بیان کرکے انہیں جواب دینے پر مجبور کر دوں!

زمانہ آگے بڑھ رہا ہے! میں بھی اُس کے ساتھ ساتھ چل رہا ہوں!

ندوہ کی زندگی میری رگ رگ میں سرایت کر چکی ہے، ندوہ کے سانچہ میں اپنے آپ کو ڈھالنے کی مسلسل کوشش کر رہا ہوں، سید صاحب سے اب اجنبیت نہیں رہی، اُنس پیدا ہو گیا ہے، وہ آتے ہیں تو وقت کا زیادہ حصّہ انہی کی خدمت میں صرف کرتا ہوں

اُن کے حلقۂ درس میں بیٹھتا ہوں، اُن سے استفادہ کرتا ہوں، ان کی تقریریں سنتا ہوں، ان کے مضامین پڑھتا ہوں، ان کی کتابیں پڑھتا ہوں، جو بات سمجھ میں نہیں آتی، بے تامل پوچھتا ہوں، وہ میری تقریریں سنتے ہیں، اصلاح دیتے ہیں، تیاری کے اصول بتاتے ہیں، مغز اور مواد کی طرف متوجہ کرتے ہیں، مضامین دیکھتے ہیں، حوصلہ افزائی بھی کرتے ہیں، نکات بتاتے ہیں، رخ بدلنے کی کوشش کرتے ہیں، ایک مرتبہ ہم چند دوست ان کی دعوت کرتے ہیں، وہ از راہ شفقت تشریف لاتے ہیں، اسی زمانہ میں "نگار" میں میرا ایک چھوٹا سا مضمون چھپا ہے، اس کا ذکر کرتے ہیں، اور فرماتے ہیں، یہ مضمون اگر زیادہ تیاری کے ساتھ تم لکھتے تو مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہو سکتا تھا، میں جواب میں ندوہ پر اور خود ان پر تنقید کر ڈالتا ہوں، میں گستاخ لب و لہجہ میں کہتا ہوں ——
ندوہ میں صرف کتابیں پڑھاتا ہے، اور کچھ نہیں سکھاتا، آپ کو مولانا شبلی نے تیار کیا، ہمیں کوئی تیار نہیں کرتا، وہ آپ کو عنوانات دیتے تھے، ماخذ بتاتے تھے، پھر کانٹ چھانٹ کرتے تھے، ہم نہ لکھیں تو کوئی اکساتا نہیں، لکھیں تو بڑھاتا نہیں، ہم خود ہی اپنے معلم ہیں، خود ہی مربی، خود ہی ہدایت کار، جی چاہے لکھیں، جی چاہے نہ لکھیں، خواہ امام بخاری پر لکھیں، خواہ ٹیگور پر، ہم سبزۂ خودرو ہیں، خود ہی اُبھرے ہیں، خود ہی دب جائیں گے، آپ کی طرح تھوڑی کہ قدم قدم پر استاد کی ہدایت، رہنمائی، اصلاح، ——

عبدالسلام صاحب قدوائی دم بخود تھے، حامد علی، ہر دکی طرح خاموش اور "پا بہ گل" —— کیونکہ اصل میزبان وہی تھے، —— اور میں اپنی کہے چلا جا رہا تھا! —— یقین تھا آج سید صاحب ضرور خفا ہوں گے، اور اس گستاخی پر بری طرح ڈانٹیں گے لیکن میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو ان کے ہونٹوں پر تبسم کھیل رہا تھا، آنکھوں سے شفقت کی بارش ہو رہی، بلکہ اگر میں یہ کہوں تو شاید مبالغہ نہ ہو کہ اعتذار کا رنگ بھی جھلک رہا تھا!

پھر بڑی شفقت کے ساتھ فرمایا،

—— "ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے، —— انتظار کیجئے!"

اور کچھ مدت گزر گئی! ——!

مولانا عبدالحلیم صاحب صدیقی تفسیر قرآن کا درس دیتے تھے، شمس العلماء مولانا حفیظ اللہ صاحب "حجۃ اللہ البالغہ" پڑھاتے تھے، مولانا سید علی زینبی اصول فقہ کی کتاب "توضیح تلویح" پڑھاتے تھے، مولانا عبدالودود صاحب اعظمی ابن سینا کی کتاب "نجاۃ" کا درس دیتے تھے، اور یہ حضرات، اپنے اپنے فنون کی اقلیم پر شہریاری کرتے تھے، اپنے موضوع پر سند سمجھے جاتے تھے، سید صاحب کی عظمت دل میں تھی، عربی ادب پر ان کی مہارت کا سکہ بیٹھا ہوا تھا، لیکن اس کا وہم و گمان بھی نہیں تھا، کہ وہ صحیح معنی میں "جامع معقول و منقول" ہیں، ایک مرتبہ مولانا صدیقی کے گھنٹہ میں تشریف لائے، اور قرآن کے "ربط آیات" پر ایک ایسی دل نشین اور مدلل و مسکت تقریر فرمائی، کہ آنکھیں کھل گئیں، کتاب الاغانی کی وہ حکایت یاد آ گئی کہ ایک مشہور گویا، ابراہیم موصلی، اپنے فن کار لڑکے اسحٰق موصلی کو لے کر ایک مشہور گویئے معبد کے پاس پہنچا، اور استدعا کی، کچھ سنائیے، اس نے نئی لے میں نیا راگ سنایا، واپسی میں بیٹے سے باپ نے پوچھا،

"کہو بیٹے، کیسا پایا تم نے اس مغنی کو؟"

بیٹے نے کہا، "پدر محترم، آج سے پہلے تک دنیا میں آپ سے اچھا کوئی مغنی میری نظر میں نہ تھا، لیکن معبد کا گانا سُن کر آپ ہیچ رہ گئے!"

باپ نے بیٹے کی پیٹھ ٹھونکی، اور بہت سا انعام دیا، مجھ سے اگر مولانا صدیقی سید صاحب کے درس کے بارے میں پوچھتے تو میں وہی کہتا، جو اسحٰق نے اپنے باپ ابراہیم سے کہا ـــــ خواہ مولانا میری پیٹھ ٹھونکتے یا سر ـــــ!

مولانا حفیظ اللہ خود سید صاحب کے استاد تھے، اور سید صاحب ان کا بے حد احترام کرتے تھے، لیکن ایک مرتبہ حجۃ اللہ البالغہ کے درس میں "حضیرۃ القدس" پر سید صاحب نے جو تقریر فرمائی، وہ آج تک کانوں میں گونج رہی ہے، مولانا حفیظ اللہ دوسروں کے کمالات کا اعتراف کرنے میں بڑے بخیل تھے، علامہ شبلی کے معاصر تھے، اور ان کا مذاق اڑایا کرتے تھے، سید صاحب کے بھی وہ زیادہ قائل نہیں تھے، البتہ جب ہم انہیں یہ یاد دلا دیتے تھے کہ وہ آپ کے شاگرد بھی تو ہیں تو ذرا مان جاتے تھے، لیکن آج کی تقریر وہ بھی کامل محویت اور استغراق کے ساتھ سُن رہے تھے، اس انہماک اور استغراق میں تاثر تھا، بیزاری، اور اکتاہٹ نہ تھی! ـــــ توضیح تلویح، اور نجات کے اسباق میں بھی بارہا سید صاحب تشریف لائے، اور ہم پر نہیں ہمارے اساتذہ پر اپنا نقش بٹھا کر واپس گئے!

واقدی کے روایات حوالہ کے کام میں آتے تھے، بڑے بڑے مصنفین اس کی ثقاہت اور استناد کو تسلیم کرتے تھے، لیکن سید صاحب نے کتب اسماء الرجال کا غائر مطالعہ کرنے کے بعد واقدی پر جو تنقیدی مقالہ لکھا، اس نے اگرچہ علمی دُنیا میں ایک ہنگامہ پیدا کر دیا، لیکن بالآخر اصحاب علم وخبر کو ماننا پڑا، واقدی کیسا مجروح راوی تھا، اور اس کے روایات کے ضعف کا کیا عالم تھا؟

۱۹۳۰ء کی اسٹرائک، ندوہ کی سب سے زیادہ ہنگامہ خیز اور انقلاب انگیز اسٹرائک تھی! ایک معمولی سی بات پر طلباء اور منتظمین میں تصادم ہوا، بات بڑھی، نوبت اسٹرائک تک پہنچ گئی، تفصیل کا یہ موقع نہیں، اسٹرائک کے "رنگ لیڈر" خارج کر دیے گئے، جن میں ایک ان سطروں کا لکھنے والا بھی تھا ـــــ لیکن اتنی نرمی رکھی گئی کہ اگر معافی مانگ لیں، تو داخلہ کا امکان ہے!

ہم دو تین ساتھی معافی مانگنے پر تیار نہیں ہوئے، لہٰذا داخلہ بھی نہیں کیا گیا، اسی اثنا میں سید صاحب تشریف لے آئے، اس اسٹرائک پر سب سے زیادہ برہم سید صاحب کو ہونا چاہئے تھا، اس لئے کہ معتمد تعلیمات وہی تھے، اُن سے ملاقات ہوئی، تو ایسا معلوم ہوا جیسے ہم نے کوئی قصور ہی نہیں کیا تھا، اور اگر کیا تھا تو وہ اسے معاف بھی کر چکے! ـــــ اس فضا میں جی کھول کر گفتگو ہوئی، انہوں نے معافی کا سوال ہی نہیں اٹھایا، اور بہ حیثیت معتمد تعلیمات ہمارے داخلہ کے احکام جاری کر دئے، اور اعظم گڑھ واپس تشریف لے گئے، جب تک سید صاحب لکھنؤ میں رہے کوئی بھی نہ بولا، ان کے جاتے ہی مہتمم صاحب کی جبین پیشانی اور زیادہ ابھر آئی، ناظم صاحب کا رنگ عتاب اور زیادہ چوکھا ہو گیا، پروفیسر عبدالباری صاحب بھی بجا طور پر ہم سے بہت زیادہ نالاں، بیزار، اور برہم تھے، اور لکھنؤ میں تشریف رکھتے تھے، ان کی یہ برہمی بھی ناظم صاحب اور مہتمم صاحب کے پلڑے کا وزن بن گئی، نتیجہ یہ ہوا، کہ سید صاحب کے حکم پر عمل نہیں کیا گیا، ہمارے لئے یہ بات خلاف توقع نہ تھی، لہٰذا صدمہ بھی نہیں ہوا، سید صاحب کے لئے تھی، انہیں صدمہ بھی ہوا، لیکن وہ کسی سے لڑنے کے عادی نہیں تھے، ہر وار اپنے قلب ناتواں پر سہہ لیتے تھے، خواہ دل وجگر کا کچھ ہی عالم ہو، دوستوں اور رفیقوں، اور ماتحتوں کا یہ وار بھی انہوں نے سہہ لیا، کچھ روز کے بعد وہ پھر لکھنؤ تشریف لائے، اور حسب معمول نواب علی حسن خاں ناظم ندوہ کے ہاں ٹھہرے، ہم بھی وہاں پہنچے، یہ ممکن نہ تھا کہ سید صاحب لکھنؤ میں ہوں، اور ہم ان سے نہ ملیں، بہت ملول ومغموم، اور متاثر تھے آنکھیں چار کر کے بات نہیں کر رہے تھے، میں نے عرض کیا،

"اب جامعہ ملیہ کا قصد ہے! ڈاکر صاحب کو ایک خط لکھ دیجئے!"

سید صاحب نے فوراً ڈاکٹر ذاکر صاحب کے نام ایک پُر اثر خط لکھا، اور ان سے استدعا کی کہ زیادہ سے زیادہ مراعات عطا فرمائیں۔

دوسرے یا تیسرے دن وہ پھر اعظم گڑھ روانہ ہوگئے، چار باغ اسٹیشن پر میں پہنچانے گیا، گاڑی چھوٹنے میں ابھی دیر تھی، ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں، پھر یک بیک بڑی شفقت سے میری پیٹھ پر ہاتھ رکھا، اور فرمایا،

"جب میں ندوہ چھوڑ کر پونہ روانہ ہو رہا تھا، تو مولانا شبلی نے مجھ سے کہا تھا، 'سلیمان، اگر میرا بس چلتا، اور میرے اختیار میں ہوتا تو تمہیں پونہ نہ جانے دیتا، تمہیں اپنے پاس رکھتا'۔۔۔۔۔ یہی میں تم سے کہتا ہوں!"۔۔۔۔۔ میں نے پُرنم آنکھوں سے اپنے شفیق استاد کو دیکھا اور کچھ نہ کہہ سکا،۔۔۔۔۔ کہہ سکنے کی سکت ہی کہاں رہ گئی تھی؟

دلی پہنچنے کے بعد میں نے سید صاحب کو ایک مفصل خط لکھا، جس میں جامعہ کے کوائف درج تھے، اور کچھ اپنی ذاتی پریشانیوں کا تذکرہ تھا، خلاف معمول اس خط کے جواب میں تاخیر ہوئی، حیرت تھی ایسا کیوں ہوا؟۔۔۔۔۔ آخر کافی انتظار کے بعد ایک روز سید صاحب کا گرامی نامہ آیا، تحریر فرمایا تھا،

"خط میں دیر اس لئے ہوئی کہ میں اپنی جیب سے تمہاری کچھ خدمت کرنا چاہتا تھا!"۔۔۔۔۔ میرے خط میں اشارۃً بھی اس "خدمت" کا مطالبہ نہیں تھا، لیکن نہ جانے کیوں انہوں نے اس کی ضرورت محسوس فرمائی،۔۔۔۔۔ غور فرمایئے، یہ شفقت اور توجہ اس شخص کے ساتھ تھی جو بغاوت کے جرم میں اپنی مادر علمی سے نکالا گیا تھا!

جامعہ جانے کے بعد ندوہ سے اب کوئی علاقہ باقی نہیں رہ گیا تھا، لیکن،

چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد،

کے مصداق، ہم چند دوستوں نے انجمن طلبائے قدیم کا احیا کیا، اور جلسہ سالانہ کا اعلان کر دیا کہ فلاں تاریخوں میں ندوہ میں ہوگا، اور سید صاحب اس کی صدارت فرمائیں گے!۔۔۔۔۔ بڑا شاندار جلسہ ہوا، اور جو لوگ یہ سمجھ کر خوش ہو رہے تھے کہ سید صاحب نے ہمیں عاق کر دیا ہے، وہ یہ دیکھ کر بہت غمگین ہوئے، کہ سید صاحب نہ صرف ہمارے طلب کئے ہوئے جلسہ میں موسم سرما کی شدت کا مقابلہ کرتے ہوئے زحمت سفر برداشت کر کے شریک ہوتے ہیں بلکہ اس کی صدارت فرماتے ہیں، اور ان کی صدارت میں وہ تمام تجویزیں منظور ہوتی ہیں جو ہماری طرف سے پیش کی جاتی ہیں!

جلسہ کئی روز تک جاری رہا، جلسہ کے اوقات کے علاوہ بھی سید صاحب سے نیاز حاصل ہوتا رہا، ایک روز عصر کے وقت میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا، نواب صاحب اپنی کوٹھی کے برآمدہ میں رونق افروز تھے، اُن کے قریب ہی ایک کرسی پر سید صاحب تشریف فرما تھے، اور کوئی نقشہ اُلٹ پلٹ کر دیکھ رہے تھے، دیکھتے دیکھتے وہ نقشہ میری طرف بڑھایا، اور نواب صاحب کے سامنے محبت بھرے لہجہ میں فرمایا،

"یہ ندوہ کی تازہ عمارتوں کا نقشہ ہے، دیکھئے۔۔۔۔۔ ممکن ہے ان کی تکمیل آپ ہی کے ہاتھوں ہو!"

اتنے میں جگر مرادآبادی تشریف لے آئے، وہ بھی نواب صاحب ہی کے ہاں ٹھہرے تھے، نواب صاحب نے پوچھا،

"کوئی نیا شعر؟"

جگر صاحب نے فرمایا ؎

ریاض کراچی (۱۱ ہم) مارچ ہم ۱۹۵ء

خار کو گل، اور گل کو خار، جو چاہے کرے
تو نے جو چاہا کیا، اے یار جو چاہے کرے

تھوڑی دیر کے بعد میں اٹھا، سید صاحب نے پوچھا،
"کہاں کا قصد ہے؟"
میں نے عرض کیا "ذرا ندوہ تک جاؤں گا!"
فرمایا "میں بھی چلتا ہوں!"
نواب صاحب نے کہا، "موٹر لے لیجئے!"
سید صاحب نے فرمایا "نہیں یونہی ٹہلتا ہوا جاؤں گا!"
لال باغ سے جہاں سید صاحب ٹھہرے ہوئے تھے، ندوہ تک کافی مسافت ہے، لیکن وہ پا پیادہ چلنے پر تیار ہوگئے، پا پیادہ چلنے کی مصلحت آگے چل کر سمجھ میں آئی، راستہ بھر ندوہ کے حال و مستقبل کے بارے میں گفتگو فرماتے رہے، اس گفتگو میں اُمید بھی تھی، اور حوصلہ بھی!

تھوڑی دور چلنے کے بعد قیصر باغ کی طرف سے، ایک موٹر تیز رفتاری سے ناک کی سیدھ آتی ہوئی دکھائی دی، سید صاحب، گفتگو میں محو تھے، انہوں نے موٹر کی طرف دھیان نہیں دیا، جب وہ قریب آگئی، تو میں سید صاحب کے سامنے آگیا، اور انہیں پیچھے ہٹادیا، موٹر زن سے نکل گئی، سید صاحب چلتے چلتے کھڑے ہوگئے، کئی منٹ تک کھڑے رہے، پھر جب سانس سنبھل گیا تو آگے بڑھے، عجب تو نہیں اب اندازہ ہوتا ہے کہ قلب اس زمانہ سے کمزور ہو چلا تھا!

جامعہ میں چند سال تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۳۴ء میں یک بیک میں مولانا شوکت علی کے ساتھ بمبئی پہنچ گیا، اور روزنامہ خلافت کی کرسیٔ ادارت پر بغیر کسی سابقہ تجربہ کے بٹھا دیا گیا، خلافت کمیٹی، یا دوسرے الفاظ میں مولانا شوکت علی، اور سید صاحب کے تعلقات میں کچھ جھول پیدا ہوگیا تھا، کیونکہ سیاسی مسلک دونوں بزرگوں کا جداگانہ ہوگیا تھا، بمبئی ویسے بھی ان کے راستہ سے دور تھا، اس طرف آنا شاذونادر ہی ہوتا تھا، لیکن کبھی کبھی آبھی جاتے تھے، اور جب آتے تھے تو جی بھر کے شرف حضوری حاصل کرنے کا موقع دیتے تھے، ایک مرتبہ وہ بمبئی تشریف لائے اور پروفیسر نجیب اشرف ندوی ایم اے کے دولت کدہ پر مقیم ہوئے، ایک روز فرمایا،
"ندوہ کا تم پر حق ہے!"
میں نے کہا، "ضرور ہے!"
فرمایا "کیا دیتے ہو ندوہ کو لاؤ!"
[illegible] میں جو کچھ تھا نذر کردیا، بہت خوش ہوئے، نجیب صاحب اس وقت تشریف نہیں رکھتے تھے، وہ آئے تو ان سے خاص طور پر ذکر کیا، دوسرے روز نجیب صاحب سے ملاقات ہوئی، تو کہنے لگے،
"بڑے گن گا رہے ہیں سید صاحب تمہارے کیا دے دیا ہے تم نے انہیں؟"
میں نے عرض کیا "چند کھوریں!"

نجیب صاحب بڑے بذلہ سنج اور شگفتہ مزاج شخص ہیں، میرے اس جواب پر کہنے لگے،
"ہمی پر مذاق کی مشق کرو گے ؟"
میں نے کہا، غالباً جنگ تبوک کا واقعہ ہے کہ رسول اللہ ؐ نے جہاد کے لئے صحابہؓ کرام سے مالی ایثار کا مطالبہ کیا، حضرت عثمانؓ نے بہت کچھ پیش کر دیا، حضرت عمرؓ اپنی آدھی پونجی لے آئے، حضرت ابو بکرؓ سب کچھ لائے، اور رسول ؐ کے قدموں پر ڈال دیا، دوسرے صحابہؓ نے بھی حسب امکان و مقدرت بہت کچھ دیا، ایک صحابیؓ کے پاس کچھ نہیں تھا، چند کھجوریں تھیں، انہوں نے وہی پیش کر دیں، رسول اللہ ؐ اس ہدیہ پر اتنے مسرور ہوئے کہ جملہ مال و زر پر آپ ؐ نے وہ کھجوریں بکھیر دیں، سید صاحب ایک مذہبی کام ندوہ ——— کے لئے چندہ طلب کر رہے ہیں، یہ زرداروں کا شہر ہے، لوگ بہت کچھ دے چکے ہوں گے، بہت کچھ دیں گے، بھلا میں ان کا کیا مقابلہ کر سکتا ہوں، چند سکّے تھے، وہ نذر کر دئے، یہ کرم ہے کہ انہوں نے اتنی بے حقیقت بات کا آپ سے ذکر کیا،

نجیب صاحب مسکرائے، کہا" بڑے استاد ہو، یہ نسخہ ہمیں نہ بتا دیا پہلے سے !"

ایک مرتبہ تحریک پاکستان کے عین عالم شباب میں سید صاحب بمبئی تشریف لائے، بمبئی کی جمعیتہ العلماء سالانہ جلسہ کر رہی تھی، اور سید صاحب اس کے صدر منتخب ہوئے تھے، میں مسلم لیگ اور پاکستان کے فدائیوں میں تھا، سید صاحب خلافت ہاؤس کے اسی کمرہ میں ٹھیرے تھے، جو کبھی مولانا شوکت علی کا مسکن رہ چکا تھا، میں بھی ملنے کے لئے گیا، جمعیت کے چند مقتدر اصحاب تشریف فرما تھے، یہ وہ لوگ تھے جن کی میں اپنے اخبارات میں مخالفت کرتا تھا، میرے سامنے انہوں نے سید صاحب سے میری شکایت کی، کہ دیکھئے جعفری صاحب پاکستان کی حمایت کے جوش میں ہم لوگوں کی سخت مخالفت کرتے ہیں۔ — مجھے یہ بات بہت بُری معلوم ہوئی میں نے ذرا تلخ لہجہ میں کہا،

"ہاں کرتا ہوں، لیکن یہ نہ بھولئے کہ میں صرف آپ کے مسلک کی مخالفت کرتا ہوں، اور آپ اپنے مخالفوں پر کفر کے فتوے صادر کرتے ہیں، میں مخالفت کے باوجود مولانا ابو الکلام، مولانا کفایت اللہ اور مولانا حسین احمد کا بے حد احترام کرتا ہوں، ان کے اختلاف کو اجتہادی اختلاف جو حسن نیت پر مبنی ہوتا ہے، قرار دیتا ہوں، اور آپ ——— ؟ آپ قائد اعظم کو بدترین خلائق ثابت کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں، میں ذاتیات میں نہیں الجھتا، اور آپ کا سارا زور شور ذاتیات ہی پر ہے، میری سمجھ میں یہ بات کسی طرح نہیں آتی کہ جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، وہاں وہ اپنی آزاد اور خود مختار حکومت کیوں نہ قایم کریں؟ آخر عبارت النص، ولالت النص، اشارۃ النص کس بنیاد پر آپ اس جائز اور مستحسن مطالبہ کی مخالفت کرتے ہیں ؟"

آج بڑا نازک موقعہ تھا، دل دھڑک رہا تھا، کہیں سید صاحب برہم نہ ہو گئے ہوں، لیکن آج بھی ان کے ہونٹوں پر وہی شفقت آمیز تبسّم موجود تھا، جو آج سے بہت پہلے میں نے ایک موقعہ پر ندوہ میں دیکھا تھا!

پاکستان بن گیا! ——— !

لاکھوں آدمی اِدھر سے اُدھر ہو گئے، انہی میں ایک میں بھی تھا، یہاں آنے کے بعد ہندوستان سے رشتہ منقطع ہو گیا ہندوستان کی شخصیتوں سے جدائی ہو گئی، ہندوستان کے ادارے چھوٹ گئے ——— سید صاحب کی یاد دل میں تھی،

لیکن یہاں آکر حالات نے کبھی اس کا موقع نہ دیا کہ انہیں خط لکھ سکوں۔

ایک روز دفعتہً میں نے یہ خبر سُنی کہ سید صاحب تشریف لائے ہیں! جمعہ کی نماز جس مسجد میں سید صاحب نے پڑھی، وہیں میرے ایک عزیز ابوالحسن صاحب نے بھی پڑھی، نماز کے بعد وہ میرے واسطہ سے سید صاحب سے ملے، سید صاحب نے فرمایا،

" آپ ملنے آگئے، لیکن وہ نہ آئے ——!"

انہوں نے آکر مجھ سے کہا، میں دل میں بہت نادم ہوا، اور اپنے آپ پر لعنت ملامت کرتا رہا، لیکن عجیب اتفاق کہ پھر بھی نہ جا سکا، ایک روز حکیم نصیر الدین ندوی نے سید صاحب کی دعوت کی!

حکیم صاحب میرے محبوب دوستوں میں ہیں، آج سے نہیں، ندوہ کے درجۂ اوّل سے، —— ان کا حکم رد نہ کرسکا، دعوت میں گیا، سید صاحب تشریف لاچکے تھے، میں نے سلام کیا، انہوں نے معانقہ کیا، میں دور ہٹ کر بیٹھ گیا، انہوں نے پاس بلاکر بٹھایا، "دید و شنید" ہاتھ میں تھی، اس کی ورق گردانی فرمارہے تھے، حکیم صاحب نے وہ صفحہ کھول دیا، جس میں ان کا ذکر تھا، اسی نشست میں مضمون پڑھ لیا، پھر مسکرا کر کتاب بند کردی،

اسی مجلس میں ایک صاحب سے معلوم ہوا، کہ لاہور میں مولانا مودودی نے سید صاحب کی دعوت کی، اور دریافت کیا، "سنا ہے، حکومت نے آپ کو تعلیمات اسلام بورڈ کا صدر بنا دیا ہے!"

سید صاحب نے پوری سنجیدگی سے فرمایا،

"ایجاب ہوچکا ہے، قبول باقی ہے!"

حکیم نصیر الدین صاحب سراپا جذب وکشش شخصیت کے حامل ہیں، پھر ایثار، محبت، خلوص، اور وضعداری کے صفات ملنزاد، ندوہ میں سید صاحب سے حکیم صاحب کو زیادہ واسطہ نہیں رہا، اس لئے کہ وہ ابھی "چھوٹے" طالب علم تھے، نیز کچھ ہی عرصہ بعد وہ طبیہ کالج دہلی چلے گئے، لیکن کراچی میں سید صاحب پر چھاگئے تھے، سید صاحب نے ان کی طبیعت کو سمجھ لیا تھا، انہوں نے سید صاحب کے مزاج کو پا لیا تھا، سید صاحب ان پر بے انتہا التفات صرف فرماتے تھے، اور وہ سید صاحب پر، پروانہ وار قربان ہوتے تھے، سید صاحب انہیں مکدّر دیکھ کر خود مکدّر ہوجاتے، اور وہ سید صاحب کی ذراسی تکلیف یا بےچینی اپنے لئے ناقابل برداشت محسوس کرتے تھے!!

ٹنڈو والہ کوم میں مجلس ندوۃ العلوم کا جلسہ ہوا، واپسی جس گاڑی سے ہوئی اس کے مسافروں میں سید صاحب، حکیم صاحب، راقم الحروف اور کئی دوسرے لوگ تھے، گاڑی مسافروں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی، لہٰذا ہر شخص الگ الگ ڈبہ میں بیٹھا، کراچی کے صدر اسٹیشن پر میری اور حکیم صاحب کی ملاقات ہوئی! —— یوں تو کئی بار ہوئی، میں قطب کی طرح اپنی جگہ پر بیٹھا تھا، وہ ہر اسٹیشن پر اترتے تھے ایک مرتبہ سگریٹ کی ڈبیہ پھینک گئے، ایک مرتبہ پانی کے کچھ قطرے —— وضو کرنے کے بعد —— پھینک گئے، —— لیکن صدر کے اسٹیشن پر اطمینان سے ملاقات ہوئی، میں نے دیکھا کافی پریشان اور گھبرائے ہوئے سے نظر آرہے ہیں، پوچھا کیا بات ہے؟ کہنے لگے سید صاحب پر تنفس کا دورہ پڑا ہے، سید صاحب گھر روانہ ہوگئے، حکیم صاحب اسٹیشن سے ٹیکسی کرکے اپنے دواخانہ گئے، اور جتنی بھی قیمتی اور مفید ادویہ ممکن ہو سکی تھیں، انہیں لے کر سید صاحب کے حضور میں پہنچ گئے!

آخری علالت کے دوران میں اپنی بدقسمتی کے باعث میں حاضر نہ ہوسکا، اتفاق کی بات حکیم صاحب بھی نہ جاسکے، ——

ایک روز خود سید صاحب نے حکیم صاحب کو فون کیا، اور بڑے شاعرانہ الفاظ میں یاد کیا، یہ فوراً پہنچے، سید صاحب نے کہا، دیکھیے! انہوں نے معائنۂ طبی شروع کیا، دوران معائنہ میں پیٹ دبایا، اور پوچھا، درد تو نہیں ہوتا؟ فرمایا،
"ان انگلیوں سے میں درد محسوس کرسکتا ہوں؟"

آہ! وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں

دماغ نے اپنا خزانہ کھول دیا، جتنا لکھ چکا ہوں، اس سے کئی گنا زیادہ لکھ سکتا ہوں، جی بیقرار ہے، کہ جو کچھ یاد ہے سب لکھ ڈالوں، لیکن کاغذ پر کنٹرول ہے، اپنے سے زیادہ دوسرے لکھنے والوں کے جذبات کا پاس ہے، اب یہ داستان ختم کرتا ہوں، خدا نے موقع دیا تو انشاءاللہ پھر کبھی یہ داستان سناؤں گا!

(بقیہ بزم ریاض از صفحہ ۱۰۵)

اس وقت ان کا ایک محبت نامہ مورخہ ۱۷ مئی ۱۹۴۳ء میرے سامنے ہے جو دارالمصنفین اعظم گڑھ سے میرے نام دارالادب پھلواری شریف ضلع پٹنہ کے پتے پر روانہ کیا گیا تھا۔

"ملک مبین" پر میرا ایک رسالہ "اللہ الثمین لملائکۃ الیمین" کے نام سے رسالہ البیان امرتسر مارچ ۱۹۴۳ء میں چھپا تھا، میں نے وہ پرچہ دفتر البیان سے ان کی خدمت میں بھجوا دیا تھا، اس کو دیکھ کر انہوں نے اپنے اس محبت نامے میں اس کے بعض مضامین سے اتفاق اور بعض سے اختلاف ظاہر فرمایا ہے، مگر زیادہ تر اتفاق ہی فرمایا ہے، چنانچہ آخر مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں۔

"آپ میرا مختصر مضمون جو رسائل چراغ علی کی تنقید میں ہے، اور جو جولائی ۱۹۱۹ء میں چھپا ہے، مزدور پڑھ لیں، تاکہ اس مصرعہ کی صداقت معلوم ہو،
متاع من ز نہاں خانۂ ازل بردہ است"

میں نے بھائی صاحب رحمہ اللہ کی خدمت میں جو اُن کے اس محبت نامے کے جواب میں روانہ کیا تھا اس مصرعہ کا جواب یوں عرض کیا تھا۔

من نہ چیزے ز نہاں خانۂ اخواں بُردم
آنچہ بردم زعیاں نامۂ قرآں بُردم

افسوس ہے کہ وہ رسائل چراغ علی کی تنقید مجھ کو آج تک نہ مل سکی، اور میں اس وقت تک اس سے استفادہ حاصل کرنے سے محروم ہی ہوں۔

بھائی صاحب ممدوح رحمہ اللہ کا ایک کارڈ بھی اس وقت میرے سامنے ہے جو ۱۵ اپریل ۱۹۴۹ء کا لکھا ہوا دارالقضاء بھوپال سے ڈھاکہ کے پتے پر میرے ایک خط کے جواب میں آیا تھا، اس میں حضرت مولانا حافظ محمد ظہور الحق محدث پھلواروی رحمہ اللہ کی کتاب "تسویلات الفلاسفہ" کا ذکر ہے کہ اس کا ایک نسخہ انہوں نے کہیں سے حاصل کیا تھا جو ندوۃ العلماء کے کتب خانے، یا

(۱۲۲)

از سید علی اکبر بی اے، ایل ایل بی

سید سلیمان ندوی

علامہ سید سلیمان ندوی کی رحلت سے ایک پورے عہد کی تاریخ خاموش ہوگئی، وہ عہد جس نے اُردو لٹریچر میں ایک نئی روح پھونکی، ملت اسلامیہ کے نظام اجتماعی کو ایک نیا طرز فکر بخشا۔ اور جو علمی اور عملی جد و جہد اور سعی پیہم کا ایک بے نظیر عہد تھا۔ وہ ۱۸۸۵ء میں پیدا ہوئے وفات کے وقت اُن کی عمر ۷۰ سال کی تھی۔

برصغیر ہند و پاک میں اندر ہی اندر جو نیا طوفان اُبھر رہا تھا ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں اس نے پوری طاقت پکڑی اور ۱۸۸۵ء اس کا نقطۂ عروج تھا۔ حالات زمانہ تیزی سے بدل رہے تھے اور ہماری تہذیب اور ہماری ثقافتی و تمدنی زندگی کے ہر نشان کے مٹ جانے کے آثار پیدا ہو چکے تھے، نئے ماحول نے اپنا تانا بانا بُننا شروع کر دیا تھا، ہماری معاشرتی اور اقتصادی زندگی کا نظام ڈگمگا سا گیا تھا اور ہمارے روایتی ملی نصب العین کی جگہ مغرب کے ایک نئے تصور قومیت نے اپنی جگہ بنانی شروع کر دی تھی۔ یہی وہ زمانہ تھا جب انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد پڑی، نظریہ یہ تھا کہ برصغیر میں برطانوی اقتدار کو مضبوط سے مضبوط تر بنایا جائے، انگریز جانتے تھے کہ برطانوی ملوکیت اس وقت طاقتور نہیں ہو سکتی جب تک کہ قومی تصورات کے بدلنے کی راہیں نہ نکال لی جائیں اور ملک کے باشندوں میں نظریاتی تبدیلی پیدا نہ ہو جائے، کانگریس کا خاکہ لارڈ ڈلہوزی اور لارڈ ڈفرن نے تیار کیا تھا اور بنیاد مسٹر ہومس آئی۔ سی۔ ایس کے ہاتھوں پڑی تھی، اصل مقصد یہ تھا کہ ایک خاص ماحول تیار کیا جائے، تعلیم و تربیت کے وہ انداز پیدا کئے جائیں کہ ملک کے باشندوں اور ان کی آنے والی نسلوں کے ذہنوں سے اس روایتی قومی اور وطنی تصور کو مٹا دیا جائے جو صدیوں سے ان کے فکر بلکہ طرز فکر کی روح بن چکا تھا، دراصل یہ خواب لارڈ میکلے کا تھا، وہ جانتا تھا کہ بزور شمشیر اس جاگتی ہوئی دُنیا میں جبر و استبداد کی حکومت زیادہ دنوں تک قائم رکھی نہیں جا سکتی اور اس لئے وہ ایک نیا نظام ترتیب دینا چاہتا تھا، جس کے اندر ملک ہندوستانیوں کا ہو، حکومت ہندوستانیوں کی ہو، حکمراں ان کا اپنا ہو مگر ذہن و فکر اور طرز حکومت ولایتی ہو، وہ جانتا تھا اور صحیح جانتا تھا کہ ذہنی و فکری غلامی بڑی دیر پا ہوتی ہے۔

اس نئی اسکیم کا مقصد یہ تھا کہ وطنی قومیت کا ایک غلط تصور ہندوستانیوں کے دماغ میں اُتار دیا جائے، یہ تصور اُس روایتی تصور سے بالکل علیحدہ تھا جس نے صدیوں پہلے ہندوستانیوں اور مسلمانوں کو کتنے ہی گرداب سے صاف نکال لیا تھا۔ اس اسکیم کا قطعی یہ مقصد نہ تھا کہ ہندوستانیوں کو اس نام نہاد فکر کی ترقی یافتہ سطح پر لا کھڑا کیا جائے جو مغرب کے ذہنی اُپج کا نمونہ تھی۔ بلکہ یہ ایک سوچی سمجھی منظم سازش اور سیاسی چال تھی جس کا مقصد صرف یہ تھا کہ ہندوستانیوں کی اپنی ذہنی و روحانی ارتقا اور اس کے سارے نظام فکر کو درہم برہم کر دیا جائے، اُس کے توازن کو بگاڑ دیا جائے، اس کا کامیاب تجربہ انھیں رومۃ الکبریٰ کی تاریخ سے حاصل ہو چکا تھا سلطنت روما بیرونی حملوں سے اس قدر تباہ نہیں ہوئی تھی جتنی وہاں مسیحیت کے عروج نے داخلی انتشار اور تفرقہ پیدا کر کے اس کو تباہ و برباد کیا۔"

۱۸۵۷ء کے انقلاب کی ناکامی کے بعد مسلمانان ہند پر بڑا نازک اور صبر آزما دور گذرا، بغاوت کے مقدمے ان کے علماء و زعماء پر بار بار چلائے گئے، انھیں پھانسی کے تختے پر چڑھایا گیا یا عبور دریائے شور کی سزائیں دی گئیں۔ ایسی نازک صورت حال اور افراتفری میں دل شکستہ مسلمان قوم کو دوبارہ منظم و متحد کرنا بڑا کٹھن کام تھا، اُن کو سنبھالنے اور سمیٹنے کے لئے سرسید نے اپنی تعلیمی تحریک جاری کی اور محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے نام سے ایک مرکز قائم کیا، اس کے بعد ہی ۱۸۹۲ء میں ایک دوسرا ادارہ مجلس ندوۃ العلماء کے نام سے قائم کیا گیا، جس کے بانی مجاہد کبیر حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے خلفاء حضرت مولانا محمد علی مونگیری، مولانا شاہ سلیمان پھلواری، مولانا احمد حسن کانپوری اور مولانا لطف اللہ علی گڑھی وغیرہ تھے۔ ان صوفیوں نے سارے برصغیر کے علماء اور دیگر اسلامی فرقوں کو متحد و منظم کرنے کی جدوجہد کی تاکہ اسلام کو اور اسلامی طرز فکر اور تصورات و نظریات کو مسیحیت کے زہرناک تیروں کا مستقل نشانہ بنے ہوئے تھے، بچایا جائے، انھیں اور راسخ و استوار کیا جائے، اور کاروان اسلام کو ہوشمندی کے ساتھ جادہ پیمائی کے لئے آگے بڑھایا جائے۔

اس وقت جبکہ مسلمان سیاست کے نام پر اپنی کوئی تنظیم نہیں کر سکتے تھے کیونکہ باغی سمجھے جاتے تھے اور مستقل عتاب میں تھے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ یہ دونوں بڑی اور اہم تحریکیں "تعلیم" کے نام پر شروع ہوں، محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس اور مجلس ندوۃ العلماء اگرچہ دو علیحدہ علیحدہ تنظیمیں تھیں مگر درحقیقت فکر و نظر اور مقاصد کے اعتبار سے دونوں ایک تھیں، مقصود دونوں کا اسلامی تصورات کا تحفظ، اسلامی تعلیمات اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا قیام تھا اور سارا ہندوستان اسی ایک آواز سے گونج رہا تھا۔

اس عالم انتشار و اضطراب، بے اطمینانی و بے اعتباری میں چند زعماء نے اُمید کی جو شمع جلائی تھی اس کی دُھندلی سی روشنی میں سید سلیمان ندوی نے آنکھیں کھولیں اور ہوش سنبھالا۔ وہ ایک ممتاز صوفی گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے والد ماجد مولانا حکیم شاہ ابوالحسن صاحب اپنے زمانے کے ایک بڑے صوفی بزرگ تھے، سید صاحب اپنی نوعمری میں دیسنہ (بہار) سے پھلواری شریف (بہار) آئے، جہاں انھیں اس دور کے محققین اور علوم اسلامیہ کے اساتذہ کرام کی شستہ و پاکیزہ صحبت ملی۔ علامہ سید سلیمان ندوی کے لئے یہ پہلا موقع تھا۔ جب محققین اسلام سے ان کے براہ راست تعلقات پیدا ہوئے اور یہیں سے ان کے دل میں صحیح اسلامی طریق زندگی اور اسلامی معاشرت کے رواج و ترقی کے لئے سعیٔ بلیغ کی لگن لگی، ۱۹۰۱ء میں وہ ندوہ چلے گئے جہاں ان کے دیرینہ سرپرست بزرگ و مربی حضرت مولانا شاہ سلیمان پھلواری مہتمم تعلیمات تھے، جن کی پاکیزہ صحبت و سرپرستی علامہ ندوی کی خفتہ صلاحیتوں کو جگانے اور اس جوہر خالص کو جو ان کے اندر مضمر تھا چمکانے میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ حضرت شاہ سلیمان پھلواری کی وفات پر جو مضمون سید صاحب نے لکھا تھا اس میں اپنے زمانۂ تعلیم کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ دلچسپ واقعہ لکھا ہے جو مختلف حیثیتوں سے ذہن میں رکھنے کے قابل ہے لکھتے ہیں :-

"ان کی بزرگانہ عنایات اور حوصلہ افزائیوں نے میری علمی ترقیوں میں مدد دی، اس زمانے میں نواب محسن الملک مرحوم دارالعلوم ندوۃ العلماء کے معائنے کیلئے تشریف لائے تھے، شاہ صاحب نے مجھے اور میرے ہمدرس مولانا ظہور احمد وحشتی شاہجہانپوری کو امتحاناً پیش فرمایا تھا۔ میں نے نواب صاحب کے خیر مقدم میں عربی میں ایک قصیدہ لکھا تھا، شاہ صاحب نے یہ کہکر مجھے پیش کیا کہ یہ میرے عزیز ہیں اور آپ کو اپنا قصیدہ سُنائیں گے۔ نواب صاحب نے مزاحاً فرمایا کہ جب یہ آپ کے عزیز ہیں تو میں انکا امتحان نہیں لوں گا کہ امتحان سے پہلے ہی "ایمان" لا چکا۔ شاہ صاحب نے فرمایا تو اور بھی یہ امتحان سے بالاتر ہیں، میں نے اپنا قصیدہ پڑھا جو افسوس ہے کہ اب موجود نہیں، تو نواب صاحب نے فرمایا کہ میں اس پُرانی ادب دانی کا قائل نہیں، عربی کا کوئی اخبار منگوایئے اُس کو یہ

پڑھیں تو البتہ، اس زمانے میں اللواء اور المؤید عربی کے مشہور اخبار تھے اور میں نے ان کو پڑھا اور صحیح ترجمہ کیا تو بے حد خوش ہوئے، شاہ صاحب بھی بے حد محظوظ ہوئے اور اُس زمانے کے اخبارات "وکیل" "وطن" "کرزن گزٹ" میں نواب صاحب کے اس معائنے کی جو کیفیت چھپوائی اُس میں میرا ذکر خاص طور سے فرمایا۔ یہ اخبارات میں میرا پہلا ذکر تھا، ان کی اس تحریر میں ایک فقرہ یہ بھی تھا کہ ملک و ملت کی خدمت کے لئے انشاء اللہ صوبۂ بہار ہر دور میں ایک سلیمان پیش کرتا رہے گا"

یہ سید صاحب کے ندوہ پہونچنے کے تیسرے سال ۱۹۰۳ء کا واقعہ ہے جسکو آج پورے پچاس سال ہو گئے۔

اس واقعہ سے جہاں سید صاحب کی تربیت و تعلیم اور ذہانت و فطانت پر روشنی پڑتی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں عربی زبان اور ادب پر کتنی قدرت ان کو حاصل ہو چکی تھی، وہیں اس پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ ندوۃ العلما اور محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے قائدین خود بھی علوم اسلامیہ پر کتنا عبور رکھتے تھے اور اس زمانے میں قیادتِ ملّی کا معیار کتنا بلند تھا۔

مولانا شبلی جب حیدرآباد سے مستعفی ہو کر ندوۃ العلما کے معتمد تعلیمات منتخب ہوئے تو اُن کی نگاہ توجہ بھی سید صاحب کی طرف مبذول ہوئی، ندوہ سے فارغ التحصیل ہو کر سید صاحب وہیں ادیب (عربی کے پروفیسر) مقرر ہوئے اور رسالہ "الندوہ" کی ادارت بھی ان کے سپرد کر دی گئی، وہ ۱۹۰۸ء سے مولانا شبلی کی وفات تک ان کی مؤرخانہ تحقیق و تفتیش اور تصنیف و تالیف میں ان کے ساتھ وابستہ اور شریک اور معاون رہے، اس طرح سید صاحب کی شخصیت میں بے مثال جامعیت پیدا ہوئی۔ اور ان کے اندر محققانہ نکتہ رسی، مورخانہ وسعت نظری، بے مثال سیرت نگاری، صوفیانہ رمز شناسی، اسلام کی سچی لگن، اہل دل صوفی کی دلسوزی و وسیع المشربی اور اصلاح ملت کی تڑپ جیسی صفات جمع ہو گئیں، وہ قدیم پر بھی حاوی تھے اور جدید سے بھی آگاہ تھے، وہ اپنے ماضی سے بھی مربوط تھے اور مستقبل پر بھی نگاہ رکھتے تھے۔

۱۹۱۲ء سے ۱۹۵۳ء تک برصغیر ہند و پاکستان کی کوئی اہم تحریک، کوئی اہم تنظیم یا کوئی اہم ادارہ، تعلیمی ہو یا تحقیقی سیاسی ہو یا معاشری، قومی ہو یا بین الاقوامی ایسا نہیں تھا جس نے سید سلیمان ندوی کو اپنانے کی کوشش نہ کی ہو اور ان کی شرکت و شمولیت کو اپنے لئے باعثِ تقویت اور باعثِ فخر تصور نہ کیا ہو۔

۱۹۲۰ء میں تحریک خلافت کی طرف سے ہندوستان سے جو وفد لندن گیا تھا وہ مولانا محمد علی، سید سلیمان ندوی اور ڈاکٹر سید حسین پر مشتمل تھا۔ انگلستان اور یورپ کے دیگر ممالک کے دورے پر جب تک یہ وفد رہا اسلام کے یہ مقتدر فرزند ہندوستان کی سب سے بڑی مسلم آبادی کے نقطۂ نگاہ اور نظریۂ فکر کی ترجمانی کرتے رہے، اس لئے کہ دُنیا میں ملّت اسلامیہ کی سب سے بڑی آبادی اسی برصغیر میں آباد تھی، یہاں آپ پھر دیکھیں گے کہ ندوۃ العلما اور علی گڑھ کے فرزندوں ہی کے ہاتھ میں آزادیٔ ہند اور خلافت اسلامیہ دونوں کی عنانِ قیادت تھی۔

موتمر عالم اسلامی کا پہلا اجلاس جب مکہ معظمہ میں ہوا تھا تو سید صاحب اس کے نائب صدر منتخب ہوئے تھے، ۱۹۴۹ء میں موتمر عالم اسلامی کا اجلاس جب کراچی میں ہوا تو اس نے بھی یہ ضروری اور باعث فخر سمجھا کہ سید صاحب جیسے پُرانے طوفانی و انقلابی رہنما کی سرپرستی حاصل رہے، اسکے دو سال بعد اسی کراچی میں دُنیائے اسلام کے مفکرین اور علماء کا ایک اور اجتماع "احتفال" کے نام سے ہوا، جس کے تین اجلاس الحاج مفتی اعظم فلسطین، آیۃ اللہ محمد حسین آل کاشف الغطاء، اور علامہ سید سلیمان ندوی کی صدارت میں منعقد ہوئے، جب علماء اور مفکرین اسلام کے اس اجتماع نے ایک اپنی مستقل عالمی جماعت کی تشکیل کی تو سید صاحب بالاتفاق اسکے صدر منتخب کئے گئے، اس احتفال کا بڑا مقصد یہ تھا کہ عالم اسلام کے علماء، محققین و مفکرین کی توجہ اس اہم مسئلے کی طرف مبذول

کرائی جائے کہ زمانۂ جدید کے تقاضوں کے مطابق فقہِ اسلامی کی جدید تشکیل ضروری ہے۔

سید صاحب کی نظر میں فقہِ اسلامی کوئی جامد شے تو نہیں تھی مگر اربابِ فن بجائے "عطائیوں" کی دخل اندازی اور شوق فرمائیوں کے خطرات بھی ان کی نظروں میں تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ قیام ندوۃ العلماء کے مقاصد میں ایک اہم مقصد یہ بھی تھا کہ فقہِ اسلامی کی ازسرِنو تشکیل و تدوین کی جائے، مولانا شاہ سلیمان پھلواری کی اُس تقریر کی جو ندوۃ العلماء کے پہلے اجلاس میں علماء کے فرائض کے نام سے اسی مسئلہ پر ہوئی تھی، اگرچہ اُس وقت بعض علماء نے اس کی مخالفت بھی کی تھی مگر یہ امر واقعہ ہے کہ یہ تقریر روحِ رواں کی طرح برابر زندہ رہی۔

اس کے بعد ۱۹۲۶ء میں جبکہ ندوۃ العلماء کا سالانہ اجلاس مسیح الملک حکیم اجمل خانصاحب کی زیرِ صدارت منعقد ہوا تھا، مسیح الملک نے پھر اپنے خطبۂ صدارت میں اس اہم ضرورت کی طرف ملتِ اسلامیہ کی توجہ مبذول کرائی کہ ساری دنیا میں حیاتِ اسلامی کی عام ترقی اور سرفرازی کے لئے یہ بے انتہا ضروری ہے۔

پھر ۱۹۳۲ء کے اجلاس آل انڈیا مسلم کانفرنس کی صدارت کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد اقبال ؒ نے اکابرِ اسلام کو دعوت دی اُنھوں نے کہا "میری تجویز ہے کہ علماء کی ایک اسمبلی قائم کی جائے جس میں ایسے وکلاء بھی لازماً داخل ہوں جنہوں نے جدید علم القانون کی تعلیم حاصل کی ہو، اس کا مقصد یہ ہے کہ اسلامی قوانین کا تحفظ کیا جائے، اُن کی نئی تعبیر کی جائے مگر اس شرط کے ساتھ قوانین اسلامی کے بنیادی اصولوں کے اندر جو روح مضمر ہے اس کے ساتھ ساتھ پوری پوری وابستگی قائم رہے۔ مسلمانانِ ہند کے لئے اس تجویز کی جو خالص سیاسی اہمیت ہے اس سے قطع نظر ہمیں یہ خوب اچھی طرح یاد رکھنا چاہیئے کہ دنیائے جدید پر ۔ مسلموں اور غیر مسلموں ضمیت ۔ اسلام کے قانونی لٹریچر کی لازوال و غیر فانی قدر و قیمت ابھی تک منکشف نہیں ہوئی ہے اور نہ سرمایہ دارانہ نظام رکھنے والی اُس دُنیا پر اس کی اہمیت ہی واضح ہوئی ہے، جس کے اخلاقی معیار و اصول ـــ انسانیت کے قابو سے عرصہ ہوا نکل گئے ہیں"۔

الغرض مفکرینِ اسلام بیشتر اس نظریئے کی بالاتفاق حمایت کرتے رہے مگر اس اہم کارنامے کی انجام دہی کے لئے ایک خاص ماحول اور آزاد فضا کی ضرورت تھی۔ قیامِ پاکستان کے بعد اسلام کی اس اہم خدمت کی انجام دہی کے لئے بہترین راہ نکلی، علمائے اسلام، اربابِ بصیرت، ماہرینِ قوانین جدید کے کچھ افراد سید صاحب کے گرد جمع ہوئے اور سید صاحب نے موجودہ حالات اور جدید تقاضوں کے مطابق فقہِ اسلامیہ کی ازسرِنو تشکیل و تدوین کے لئے سارے عالمِ اسلام سے امداد و حمایت کی اپیل کی، اس اپیل کا نہ صرف پُرجوش خیر مقدم کیا گیا بلکہ دور دراز ملکوں سے مفکرین و اکابرینِ ملت اجتماع العلماء میں شرکت کے لئے کراچی آئے، اگر اس کام کی بنیاد کچھ پہلے پڑ گئی ہوتی تو آج دستور سازی کے مسائل اور یہ ساری مشکلات آسان ہو چکی ہوتیں جن سے پاکستان اور دوسرے اسلامی ممالک دوچار ہیں۔

سید صاحب کی یہ ایک بہت ہی عظیم الشان خدمت تھی، ان کی ذات ایک اعلیٰ محقق، اسلامی تاریخ، اسلامی تمدن و معاشرت اور علم السیاست کی خدمت اور علومِ اسلامیہ کے ماہر کی حیثیت سے موجودہ اور آنے والی نسلوں کے لئے ہمیشہ نشانِ راہ ثابت ہوگی۔

اب وقت کا سب سے اہم تقاضا یہ ہے کہ اس عظیم مقصد اور عظیم کارنامے کو آگے بڑھایا جائے جس کے لئے سید صاحب نے اپنی ساری زندگی وقف کر دی کیونکہ اب اسی کی کامیاب تکمیل پر ہمارے ایمان و ایقان کی نیک نامی کا انحصار ہے اور جو ہماری

موجودہ زندگی کی تمام تر پیچیدگیوں اور اضطراب وانتشار کا واحد علاج ہے۔

سید صاحب کے مشن کی تکمیل اور اُن کے چھوڑے ہوئے ادھورے کام کو پورا کرنے اور ان کی موزوں یادگار قائم کرنے کی اس سے بہتر کوئی صورت نہیں کہ ایک ادارہ تحقیق وتصنیف قائم کیا جائے جو اسلام کے اس بہادر اور مجاہد فرزند کی شایانِ شان ہو۔

۱۹۳۳ء میں علامہ اقبال نے سید صاحب کے متعلق لکھا تھا:۔

"آج سید سلیمان ندوی ہماری علمی زندگی کے سب سے اونچے زینے پر ہیں، وہ عالم ہی نہیں امیر العلماء ہیں، مصنف ہی نہیں رئیس المصنفین ہیں، ان کا وجود علم وفضل کا دریا ہے جس سے سینکڑوں نہریں نکلی ہیں اور ہزاروں سوکھی کھیتیاں سیراب ہوئی ہیں۔"

ہم ایک عظیم الشان شخصیت سے محروم ہو گئے ہیں، معرفت وعلوم اسلامیہ کا ایک انمول خزانہ ہم سے چھین لیا گیا ہے لیکن ہم مایوس ہرگز نہیں ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ علامہ سید سلیمان ندوی کا پیغام ہمیں سچے اسلامی تصورات کی اساس پر جدید تعمیر ملت کی جدوجہد میں ہمیشہ روشنی دکھاتا رہے گا۔

بقیہ بزم ریاض صفحہ ۱۱۱

دار المصنفین اعظم گڈھ میں ہے، میری کتاب مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی سلمہ اللہ تعالیٰ نے ان کو نہیں دی۔

اور پاکستان کے عربی رسالہ الضمیر کے متعلق تحریر فرمایا ہے کہ

" زبان اچھی ہے، مگر خیالات تمام تر وہی ہیں جو بلاد اسلامیہ میں عصر جدید کے اثر سے رائج ہیں

آنچہ استاد ازل گفت ہماں می گویم

کاش کہ مسلمان اسلام کو سمجھیں اور اپنا خالص اسلامی تمدن پیدا کریں اور اپنے افکار دنیا کو دیں۔"

آخر میں مولانا عبد الرحمٰن کاشغری سلمہ اللہ تعالیٰ کا ذکر فرماتے ہوئے ان کو سلام لکھا ہے، اور یہ کہ آپ کے خط سے ان کی خیریت معلوم ہوئی۔

افسوس ہے کہ جب وہ پاکستان پہنچ گئے تو میری مصروفیت اس قدر رہی کہ یہاں ان سے خط وکتابت کا سلسلہ جاری نہ رکھ سکا؛ خیال بار بار آیا، مگر وہ صرف خیال ہی رہا، اس کا موقع نہ ملا کہ اس خیال کو عملی جامہ پہنا سکوں، کیا معلوم تھا کہ وہ اس قدر جلد ہم لوگوں سے جدا ہو جائیں گے!

جمعیۃ علمائے اسلام کی صدارت کے لئے وہ ایک بار جو سلہٹ کے ارادے سے ڈھاکہ تشریف لائے تھے تو کئی گھنٹے کی ملاقات رہی تھی، ذہاباً بھی اور ایاباً بھی، مگر دوسری بار جو تشریف لائے، تو میں علیل تھا، اور ان کو میری علالت کی خبر نہ ہو سکی، اور مجھ کو ان کی قیام گاہ کا پتہ نہ مل سکا، اس لئے نہ میں جا سکا، نہ وہ تشریف لا سکے، اور نہ میں اپنی علالت کی خبر ان کو دے سکا۔

بہر حال ان کی شخصیت ایک زندۂ جاوید شخصیت تھی، وہ اگرچہ جسمانی حیثیت سے ہم لوگوں کے سامنے نہیں ہیں، مگر ان کے علمی بیش بہا کارنامے ہم لوگوں کے پاس موجود ہیں، اس لئے ان کے یہ علمی کارنامے ان کو زندۂ جاوید رکھنے کیلئے کافی ہیں، دُنیائے علم ان کو کبھی نہیں بھول سکتی۔ اور طالبین علم ان کی تصنیفات سے ہمیشہ مستفید ومستفیض ہوتے ہی رہیں گے، یہ علمی کارنامے ان کے صدقات جاریہ ہیں۔ والباقیات الصالحات خیر عند ربک ثواباً وخیر املا

سید الملت رح کا ماتم

صلاح الدین احمد ندوی

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

مولانا سید سلیمان ندوی جنہیں رسالت مآب سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک لکھنے کا فخر حاصل ہے، ۲۲ر اور ۲۳ر نومبر ۱۹۵۳ء کی درمیانی شب میں اس عالم آب و گل کو الوداع کہا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

گلشن سیرت میں جس کے دم سے آئی تھی بہار ۔۔۔ اے دریغا چل بسا دنیا سے وہ سیرت نگار

سید سلیمان ندوی کی وفات سانحہ عظمیٰ ہے۔ اس سانحہ ارتحال پر جس قدر رنج و ملال کیا جائے کم ہے۔ سید سلیمان ندوی مرحوم کے انتقال سے ہم محزون و مغموم ہیں، ان کی وفات ہمارے لئے باعث الم اور ان کی جدائی ہمارے لئے ناقابل برداشت ہے۔ سید سلیمان ندوی کی وفات سے جو خلا واقع ہوا ہے اس کا پر ہونا صدیوں میں ممکن نہیں۔

سید سلیمان صرف سیرت نگار ہی نہ تھے، صرف مورخ ہی نہ تھے، صرف ادیب ہی نہ تھے، صرف شاعر ہی نہ تھے، صرف محدث ہی نہ تھے، صرف فقیہ ہی نہ تھے، صرف ماہر علم الرجال ہی نہ تھے، صرف خطیب و انشاء پرداز ہی نہ تھے، صرف استاد و مدرس ہی نہ تھے، صرف معلم و مبلغ ہی نہ تھے، صرف متکلم و مناظر ہی نہ تھے بلکہ سید سلیمان ندوی ان تمام علوم و فنون کے ماہر تھے، خلاصہ تھے، نچوڑ تھے، عطر تھے اور حق تو یہ ہے کہ

علم دین و حکمت و دانش کا ایسا اجتماع
جلوہ گر ہوتا ہے اک پیکر میں صدیوں میں کہیں

وہ مجدد وقت اور شیخ کامل تھے، پیر تھے، مرشد تھے، صاحب حال اور صاحب قال تھے، صاحب دل اور صاحب نظر تھے، خادم تھے، مخدوم تھے، مصنف تھے، مؤلف تھے، صوفی تھے، شاعر تھے، بزم شبلی کے بلبل تھے، میدان خطابت کے طوطی تھے، آقا تھے، مولیٰ تھے، نقی تھے، ولی تھے، علی تھے، اور سب سے بڑھ کر واقف اسرار ربانی تھے۔

وہ امام ابن تیمیہ اور ابن رشد تھے، فخرالدین رازی اور جنید و شبلی و بسطامی تھے، عبد العلی بحر العلوم تھے، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی تھے، عبد المقتدر اور ملا محمود تھے، ملا نظام الدین اور ملا محب اللہ بہاری تھے، خسرو تھے، فیضی تھے، ضیاء برنی اور ابو الفضل تھے، فاروق چریا کوٹی اور شبلی نعمانی تھے۔

وہ پاک باز و پاک طینت تھے، فراخ دل و فراخ چشم تھے، خوش فہم و خوش مذاق تھے، بے کینہ و بے ریا تھے، مجلی تھے، مصفی تھے، نرم خو و نرم مزاج تھے، عابد شب زندہ دار تھے، اور سب سے بڑھ کر وہ انسان تھے، تو ایسے انسان کی وفات خاندان کا ماتم نہیں،

شہر کا ماتم نہیں، ملک کا ماتم نہیں، پاک و ہند کا ماتم نہیں، قوم مسلم کا ماتم نہیں بلکہ مجد و شرافت کا ماتم ہے، سنجیدگی و متانت کا ماتم ہے، عقل و زرافت کا ماتم ہے، فکر و اصابت کا ماتم ہے، آزادی و حریت کا ماتم ہے، اخلاق و ایثار کا ماتم ہے، علم و فن کا ماتم ہے، ایک عارف معارف ربانی کا ماتم ہے، ایک گلشن رسالت کے عندلیب خوشنوا کا ماتم ہے، ایک دین مبین کا غمخوار کا ماتم ہے، ایک صدق و صفا اور خدمت و ایثار کے پیکر مجسم کا ماتم ہے اور سچ تو یہ ہے کہ جگر گوشۂ رسول کا ماتم ہے، جس کے غم میں آج عرب و عجم اور پاک و ہند کی علمی دنیا سوگوار ہے ؎

جس کے لب پر دم بدم اللہ ہی اللہ تھا
آہ! رخصت ہو گیا وہ عابد شب زندہ دار

استاذی و سیدی و مولائی! بزرگوں نے آپ کے لئے مرثیے لکھے، علماء نے آپ کے فراق میں آہ جگر سوز کھینچی، جاننے والوں نے آپکے اوصاف گنائے، ملنے والوں نے آپکے احسانات یاد کئے، مگر آپ اُس دنیا میں ہیں جہاں اِس دنیا کی مدح و ستائش کی حکایتیں نہیں پہونچتیں ؎

داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
ایک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

سید صاحب نے اپنے استاد علامہ شبلی کی وفات پر یہ مرثیہ کہا تھا۔ آج جب میرا استاد اس خاکدان فانی سے اُٹھ گیا ہے تو وہی میری زبان پر بھی جاری ہے ؎

شام اقبال گذشتہ مقطع عہد سلف — شمع بزم محبت آخر نشان زندگاں
جس کی ہر رائے تھی آزار ملت کا علاج — جس کی ہر تجویز قومی زندگی کی پاسباں
پیکر آرائے سخن جس کا دماغ نکتہ در — مرکب پرواز معنی جس کی پانچوں انگلیاں
اب ہمیشہ کیلئے وہ آہ ہم سے چھوٹ گیا — دلئے ناکامی ہمارا قافلہ اب لٹ گیا

افتخار احمد بلخی

ایک مکتوب

کرم فرمائے محترم جعفری صاحب سلاماً و تحیۃً

آفتاب طلوع ہونے کے بعد ایک خاص نقطہ (نصف النہار) تک اپنے ارتقاء و عروج کا سلسلہ جاری رکھتا ہے، پھر اس کا زوال شروع ہوتا ہے، تا آنکہ رات کی تاریکیاں اُس کی ساری ضیا پاشیوں پر چھا جاتی ہیں، شب و روز کا ہمارا یہ مشاہدہ ہے، یہ اللہ کی بے شمار آیات میں سے ایک عظیم الشان آیت اللہ ہے، نہ جانے کتنی آنکھیں لیل و نہار کی اس دوڑ کا مشاہدہ کر چکی ہیں، کتنی ہی آنکھوں کے سامنے یہ ہو رہا ہے اور نہ جانے ابھی کتنی آنکھیں اسے دیکھیں گی، آفتاب کا یہ نظامِ طلوع و غروب چشمہائے عبرت کے لئے اپنے اندر بے انتہا بصیرتیں رکھتا ہے، طلوع و ارتقا اور اقبال و عروج پھر زوال و غروب کی بعینہٖ یہی کیفیت انسانی کاکشاں کشاں قیامت کی طرف رواں ہونے کی ہے،

جب انسانیت و آدمیت کا آفتاب اس کرۂ زمین پر طلوع ہوا تو اس کے بعد اپریل ۱۱ھ تک اس کی ارتقائی حرکت تھی، اس عرصہ میں ہر وہ شخصیت جو انسانی آبادی میں ابھری اور اس نے اپنی صلاحیتوں، اپنے کمالات اور خدا کی طرف سے ودیعت شدہ اپنی رحمتوں اور برکتوں کے انوار سے انسانیت پر ضیا پاشیاں کیں، جب وہ پردۂ عالم سے روپوش ہو گئی تو ایسا نہ ہوا کہ اس کا بدل انسان کو نہ ملا ہو، اس سے محروم ہو جانے کے بعد انسانیت کو اس کا بدل ملا اور ملتا رہا، اس بدل کا ملتا رہنا مہر انسانیت کے رو بزوال نہ ہوتے ہوئے اسکی ارتقائی رفتار تھی، تا آنکہ آفتاب انسانیت اپنے نصف النہار تک پہونچ گیا۔

حضرت آدمؑ دُنیا سے تشریف لے گئے، حضرت نوحؑ کی شخصیت میں انسان کو آدمؑ کا بدل مل گیا، حضرت نوحؑ کے بعد حضرت ابراہیمؑ کی ذاتِ مقدسہ انسان نے پالی، حضرت ابراہیمؑ کے بعد حضرت اسحاقؑ و حضرت یعقوبؑ و حضرت موسیٰؑ و حضرت عیسیٰؑ وغیرہ انبیاء و رسل (علیہم الصلوٰۃ والسلام) اپنے پیش رو کے بدل کی حیثیت میں انسانیت کو پروان چڑھانے کیلئے ملتے رہے، انسان کھوتا رہا اور پاتا رہا، ایسا کبھی نہ ہوا کہ اس کی گم شدہ متاع کا عوض اسے نہ مل گیا ہو، اس طرح آفتاب انسانیت اپنے نصف النہار کیطرف مُسلسل رواں دواں تھا، پھر حضرت عیسیٰؑ کے بعد ذات رسالتمآب (صلی اللہ علیہ وسلم) جیسی نعم البدل ہستی انسانیت کو نصیب ہوئی، یہ وقت تھا آفتاب انسانیت کے نصف النہار پر پہونچ جانے کا۔

آفتاب نصف النہار پر پہونچکر فوراً ہی زوال کی طرف مائل نہیں ہو جاتا، بلکہ نقطۂ عروج اور میلان زوال کے درمیان زمانہ کا ایک وقفہ حائل ہوتا ہے، دورِ نبوی آفتاب انسانیت کے نصف النہار پر قیام کے دوران جلوہ ریزیوں کا وقفہ تھا، پھر انسان سے یہ نعمت و رحمت لے لی گئی، اب انسانیت کے آفتاب کو زوال شروع ہوا، اور ہوتا گیا، پھر ایسا کبھی نہ ہوا کہ آگے بڑھنے والی انسانیت کی رفتار اپنے نقش سابق کا بدل پیش کر سکی ہو، اب جب بھی انسان نے کھویا، اُسے اُس کا عوض نہ مل سکا، انسان ابو بکرؓ سے محروم ہوا، پھر اس کو ابو بکرؓ کی شخصیت نہ مل سکی، وہ عمر فاروقؓ سے محروم ہوا، سینۂ انسانیت پر ایک زخم لگا، جو ناسور بنا اور آج تک وہ ناسور گہرا ہی ہوتا جا رہا ہے،

علیٰ ہٰذا القیاس عثمان رضؓ و علی رضؓ خالد رضؓ و طلحہ رضؓ زبیر رضؓ و ابو عبیدہ رضؓ اور ابن زبیر رضؓ و ابن عبد العزیز رضؓ (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کے بعد کبھی ایسی ہستی کا نمود و ظہور نہ ہو سکا جو اپنے پیش رو کی خالی جگہ پر فٹ آ گئی ہو، زمانہ آگے بڑھتا رہا، انسان اپنی بضاعتوں سے محروم ہوتا رہا اور نعم البدل تو کیا، بدل بھی وہ نہ پا سکا، ابو حنیفہؒ و شافعیؒ اور مالکؒ بن انس و احمد بن حنبلؒ، غزالیؒ و ابن تیمیہؒ اور شیخ سرہندیؒ و شاہ ولی اللہؒ اور سید احمد بریلویؒ و شاہ اسمٰعیلؒ (رحمہم اللہ تعالیٰ) کی ہستیوں میں سے ہر ذاتِ مقدسہ ایسی تھی کہ اس کی رحلت کے بعد آنے والی ہستی اپنی عظمت مرتبہ و جلالتِ شان کے باوجود اپنے پیش رو کے خلا کو پورے طور پر نہ بھر سکی، علامہ اقبالؒ اور اکبر الٰہ آبادیؒ کو مسلمانوں کی آنکھیں تلاش کرتی ہی رہیں گی، علامہ شبلی نعمانی کی نیابت و جانشینی مولانا سید سلیمان ندویؒ نے کی، مگر کیا مرحوم سید صاحب کو شبلی نعمانیؒ کے مکمل بدل کی حیثیت سے پیش کیا جا سکتا ہے؟ اس طرح مولانا سید سلیمان ندویؒ کی وفات کے بعد ان کا بدل میسر نہ آ سکے گا۔

انسانیت کا یہ قافلہ اسی طرح اپنی منزل کی طرف رواں رہے گا، بچھڑنے والے بچھڑتے رہیں گے، اور شریک ہونے والے کارواں میں آ آ کر ملتے رہیں گے، مگر انسانیت کا "ہر نقش سابق اپنا جو مقام چھوڑے گا وہ مقام اسی طرح بغیر کسی "قائم" کے رہ جائیگا، تا آنکہ انسانیت جس کا نام ہے اس کی عمارت کھوکھلی ہو چکی ہوگی، اس میں اتنے خلا پیدا ہو چکے ہوں گے کہ اسے منہدم ہو جانے سے کوئی چیز روکنے والی نہ ہوگی اور ساری عمارت نیچے آ رہے گی، وہ وقت ہوگا عرصۂ حشر کا۔

یہ ہے، جعفری صاحب! میری وہ دلیل جس کی بنا پر میں نے آپ سے کہا تھا کہ اب سید صاحب جیسی کسی شخصیت کے وجود سے ہمیں مایوس رہنا چاہیئے، اور آپ نے مجھ سے میرے اس خیال کی دلیل طلب فرمائی ہے۔

آپ نے مجھ سے دریافت کیا ہے کہ سید صاحب مرحوم کا کونسا علمی کارنامہ میری نظر میں مرحوم و مغفور کا شاہکار کہلانے کا مستحق ہے۔ اس طرح کا موازنہ اور موازنہ کے بعد پھر کوئی فیصلہ کرنا، مجھ جیسے تہی دامن انسان کا کام نہیں، اربابِ فضل و کمال اور بالغ نظر حضرات کو یہ زیب دیتا ہے کہ وہ اس معاملہ میں اپنی آراء کا اظہار فرمائیں، لیکن آپکے ارشاد و اصرار سے مجبور ہو کر، اپنی بے مائیگی کے اعتراف کے ساتھ اس معاملہ میں مختصر طور پر لب کشائی کی جرأت کر رہا ہوں، خدا کرے آپکا مقصود اس سوال سے میرا امتحان لینا نہ ہو ۔۔۔؟

اس میں کوئی شُبہ نہیں کہ سیرۃ النبیؐ کی تالیف و تدوین سید صاحب کا ایک عظیم الشان کارنامہ ہے، اسی طرح "خطباتِ مدراس" اپنی قوت استدلال، زورِ بیان اور ذات رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم سے مصنف کی عقیدت و شیفتگی کے اعتبار سے آپ اپنی نظیر ہے، مگر میری نظر میں سید صاحب کی ارض القرآن ان کی ساری تصانیف سے ایک امتیازی نوعیت و حیثیت رکھتی ہے، جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے اس موضوع پر اُردو یا عربی میں اس سے پہلے کوئی کتاب نہ تھی، ارض القرآن سید صاحب کا ایک اجتہادی کارنامہ ہے "ایک اختراعِ بدیع" ہے، ایک ایسی شاہراہ ہے جس پر ان سے پیشتر کسی مصنف کا گزر نہ ہوا۔ اگر سید صاحب کوئی کتاب تصنیف نہ فرماتے اور دُنیا کو محض ارض القرآن دیدیتے تو صرف یہی تصنیف اپنے مصنف کی جامعیت کا علمی دُنیا سے اعتراف کرا لینے کے لئے کافی تھی، یہ ایک کتاب سید صاحب کے تاریخ پر عبور، قرآن میں دقتِ نظر، ان کی جغرافیہ دانی، قوتِ محاکمہ، ناقدانہ استدلال، بالغ نظری اور وسعتِ معلومات کی ساری حیثیتوں کی ایک ایسی جامع کتاب ہے جو اپنے تو اپنے اغیار کو بھی خراج تحسین و تصویب پیش کرنے پر مجبور کرتی ہے، یہی نہیں بلکہ یہ کتاب سید صاحب کی انشاء و ادب میں مہارت پر بھی بہترین شاہد ہے۔

پھر یہ کہ ارض القرآن کا مطالعہ کرنے والے اس سے جس طرح علم کے ان گوشوں سے مستفید ہوتے ہیں، اسی طرح ان پر قوموں کے عروج و زوال کے اسباب و علل بھی منکشف ہو جاتے ہیں، ساتھ ہی وہ اس حقیقت کو بھی پا سکتے ہیں کہ قوموں اور سوسائیٹیوں کے بناؤ اور بگاڑ

سیّد صاحب کا ایک نجی خط

(رئیس احمد جعفری کے نام)

عزیزی   سلمکم اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ، ہاں بیشک رمضان المبارک میں بھی تمہارا ایک خط آیا تھا، اور اب پھر تمہارا مفصل خط ملا، جس منزل میں اب تم ہو، یہ منزل ہر ایک طالب علم کی راہ میں ملتی ہے، اُس وقت تک چونکہ دُنیا کے نشیب و فراز اور کاموں کے عملی تجربوں اور خیالات کی عملی دقتوں سے واقفیت نہیں ہوتی، اس لئے وہ اپنے لئے ہر طرف اپنے کام کے لئے آزاد میدان پاتا ہے اور سب کچھ سوچتا ہے اور سب کو کرنا چاہتا ہے، لیکن جب ناکامیاں ہوتی ہیں، ٹھوکریں کھاتا ہے، تب ہٹ کر ایک راستہ پر چلتا ہے اور دنیا کو دارالخیال نہیں، بلکہ دارالعمل سمجھتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ کام کا خیالی خاکہ ہمیشہ عالمگیر ذہن میں آتا ہے، اور یہی وہ چیز ہے کہ ہماری ہر چیز آل انڈیا ہوتی ہے، ہم سمندر میں حرکت پیدا کرنا چاہتے ہیں جو ناممکن ہے، اور اسی لئے ہمارا کوئی کام جو آل انڈیا کی صورت میں ہے کامیاب نہیں، اگر کوئی ایک جگہ، ایک مرکز پر کسی ایک کام کو لے کر بیٹھے اور سب کچھ اس پر نثار کردے تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔

مسلمانوں کی حالت جیسی منتشر، پراگندہ اور غیر منظم اس وقت ہے ویسی کبھی بھی نہ تھی، ہم میں کوئی "مسلمان رہنما" نہیں، سب کسی نہ کسی چیز کے بھوکے ہیں، یہی سبب ہے کہ سب بھوکے ایک ایک روٹی کے لئے آپس میں لڑتے ہیں، جو کل کہتے ہیں وہ آج نہیں، اور جو آج کہہ رہے ہیں وہ کل نہیں کہیں گے، ذاتی اغراض کو قومیت کا لباس پہنا کر منصۂ شہرت پر جلوہ دیتے ہیں، اور ہم احسنت اور جزاک کا شور تحسین بلند کرتے ہیں۔

عزیز من! ہندوستان کے مسلمانوں کا مستقبل تمام دنیا کے مسلمانوں سے زیادہ غور کے لائق ہے ہندوستان کا سیاسی مستقبل کچھ بھی ہو مگر بہر حال یہاں اسلامی سلطنت نہ ہوگی، نیز یہ بھی مسلّم ہے کہ اکثریت کا قانون اکثریت کو حکمراں طبقہ بنا دیتا ہے، ایسی حالت میں ہندوستان میں مسلمانوں کی ہر چیز کس مپرسی میں پڑ کر فنا ہو جائے گی، اگر اس کی دیکھ بھال اور حفاظت کا سامان نہ ہو، ہمارے لئے "اسلام" اصلی چیز ہے اسی کے وجود کا نام مسلمانوں کا وجود اور اسی کی ترقی کا نام مسلمانوں کی ترقی ہے، بنابریں ہماری اصلی کوشش یہی ہونی چاہئے کہ ہم ہندوستان میں اسلام کو زندہ، باقی اور ترقی دینے کی کوشش کریں، اسی سے اکثریت کا

مسئلہ بھی حل ہوگا، یعنی اب ہندوستان کی فتح "محمود غوری کی طرح ملکوں، شہروں اور قلعوں کی فتح سے نہ ہوگی، بلکہ اہلِ ہند کے قلوب کی فتح سے ہوگی، یہی اس دور کا اصلی کام ہے۔

نظم امامت و امارت کا میں خود معتقد ہوں، اور اس کو بہت بڑا کام سمجھتا ہوں، مگر یہ چیز کم ازکم صوبہ متحدہ میں جہاں سینکڑوں دیوتا ہیں قائم نہیں ہوسکتی ورنہ ان کے موروثی و آبائی تنگاؤں میں خزاں آجائے گی۔

اچھے اخبار کی اشاعت بہت مفید و کارآمد آلہ کار ہے، بشرطیکہ یہی اصل مقصد قرار نہ پا جائے، مگر اس کے لئے بڑے سرمایہ کی ضرورت ہے، اور انگریزی داں اسٹاف بھی چاہیئے اس کا کچھ بندوبست ہے؟

میرے ذہن میں یہ آتا ہے کہ ندوہ کے ماتحت یا الگ ایک" دارالارشاد " قائم کروں، جس میں دارالمصنفین کی طرح چند مخلص افراد اپنے چوبیس گھنٹے پورے اخلاص، ایثار اور انہماک کے ساتھ کام کریں چھوٹے چھوٹے ایسے رسالے لکھیں جو اردو، ہندی، انگریزی میں طبع ہوں اس کا اپنے مذاق کا ایک تجارتی دارالاشاعت ہو جس میں اس قسم کا تمام سنجیدہ لٹریچر جمع ہو، ماہوار رسالہ ہو، جو انگریزی میں بھی ہو تو کیا کہنا، اسی کے ماتحت یہ تحریک ہو کہ انجمن شبان المسلمین شہر شہر طلبہ قائم کریں جس میں کھیل اور کلب کے دوسرے سامانوں کے ساتھ اسلامی لٹریچر کا کتب خانہ بھی ہو، ہر ہفتہ وہاں ایک اسلامی وعظ ہو قرآن پاک کا مسلسل درس ہو اور اس طرح نوجوانوں کو نوجوان مسلمان ہندوستانی بنایا جائے۔

میں کوشش کروں گا اور مجھے یقین ہے کہ کچھ دنوں میں یہ بھی ایک مستقل صیغہ ہوجائے گا اس تجویز پر تم اور تمہارے ہم خیال عزیز غور کریں، لعل اللہ یشرح لذالک صدورکم۔

یہ جاننے کے لئے کہ قوم تم سے کیا چاہتی ہے ایک خط بھیجتا ہوں۔ والسلام

سید سلیمان

۲۵- اپریل ۱۹۳۶ء

بقیہ بزم ریاض

کراچی ۱۲ فروری ۱۹۵۸ء

مکرمی جناب رئیس صاحب سلام ورحمت

رسالہ ریاض کی مقبولیت پر مبارکباد، شوکت علی نمبر کو اہل نظر نے جس قدر پسند کیا، اس کا اندازہ تو خود اس نمبر کے دیکھنے ہی سے ہوگیا تھا کہ

ایں طلعت زیبا بکشد چشم دو عالم

لیکن فروری کے شمارے میں مکاتیب کو دیکھ کر یقین ہو گیا کہ قیاس غلط نہ تھا۔

مکاتیب کے سلسلہ میں ایک مسئلہ مولانا شوکت علی مرحوم کے خاندان کے متعلق بھی زیر بحث آگیا ہے، اور جناب محمد ایوب صاحب نے میری تحریر کا حوالہ دیا ہے،

مجھے یہ نہیں معلوم کہ وجہ کیا تھی مگر یہ واقعہ ہے کہ اصغر علی خاں کے گھر میں رہنے والوں یعنی مولانا شوکت علی کے خاندان کو رام پور کے پٹھان شیخوں کا خاندان کہا کرتے تھے، شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ رام پور میں پٹھانوں کے بعض خاندان کو

(بر صـ ۱۳۵)

معارفِ سلیمانیہ

سیّد صاحب کا غیر مطبوعہ کلام

(۱)

شعلے اٹھیں ہزار تجلی مگر کہاں ⁂ یہ آگ ہے ضرور مگر طور کی نہیں
سمجھیں مرے کلام کو جو ہوشمند ہیں ⁂ مستی مری یہ بادۂ انگور کی نہیں
ہر ضربِ تیشہ ساغرِ کیفِ وصالِ دوست ⁂ فرہاد کی جو بات ہے مزدور کی نہیں

باقی انا کا ہوش ابھی حق کے ساتھ ہے
ہے بے خودی تمام ابھی منصور کی نہیں!

(۲)

چاندنی چھٹکی ہوئی جسکی ہزاروں دل میں ہو ⁂ وہ فروغِ نورِ عالم اس مہ کامل میں ہے
لفظ بیگانہ بھلا کیا ترجمانی کر سکیں ⁂ شوق بے اندازہ پیچیدہ وہ میرے دل میں ہے
واکرائے مجنوں تو اپنے دیدہ مشتاق کو ⁂ لیلیٰ پردہ نشیں ہر پردۂ محمل میں ہے
جد و جہدِ دید میں ہو، ذوق و شوق و لطفِ دید ⁂ حاصلِ ہر سعیٔ، میری سعیٔ لاحاصل میں ہے
آہی جائیگا کبھی اُس تک بھی ساقی دورِ جام ⁂ منتظر بیٹھا ہوا جو بھی تری محفل میں ہے

منزلِ مقصود ہے راہِ طلب کا ہر قدم
وہ سرِ منزل ہے جو اب تک رہِ منزل میں ہے!

کتب خانۂ اسکندریہ

ایک نئی علمی تحقیق!

کتب خانۂ اسکندریہ کے متعلق نفیاً اور اثباتاً ہر پہلو سے اس قدر بحثیں ہو چکی تھیں کہ بظاہر اب کوئی نیا پہلو بحث کا نظر نہیں آتا تھا۔ لیکن ایک انگریز اہلِ قلم نے اس مسئلہ کے اُس پہلو پر قلم اُٹھایا جس کی طرف کسی مخالف یا موافق کی نظر اب تک نہیں اُٹھی تھی! کتب خانۂ اسکندریہ کے متعلق جو داستان تصنیف ہوئی ہے اُس کے ہیرو کا نام یحییٰ نحوی ہے۔ یحییٰ نحوی ہی حضرت عمرو بن العاص کی خدمت میں آتا ہے اور وہی ان سے کتب خانہ کے حاصل کرنے کی اجازت چاہتا ہے، وہی کتب خانہ کی تاریخ ان سے بیان کرتا ہے اُسی کی اجازت طلبی کی بنا پر حضرت عمرو بن العاص اس کتب خانہ کے متعلق حضرت عمر بن خطاب سے حکم چاہتے ہیں، حضرت عمر اس کے جلانے کا حکم دیتے ہیں اور اسکندریہ کے قدیم اور نایاب کتب خانہ کو اسکندریہ کے حماموں میں چھ مہینہ تک آگ سلگانے کی خدمت سپرد ہوتی ہے اب تک اس قصّہ کی تردید وتکذیب میں جن یورپین اور مسلمان مورخین نے دلائل قائم کئے تھے اُن سب کے متعلق یحییٰ نحوی کے متعلق یہ مسلّم تھا کہ وہ اس عہد میں موجود تھا اور ممکن ہے کہ وہ اس قصّہ کا ہیرو قرار پا سکے لیکن مسٹر بٹلر نے اپنی تصنیف "فتح مصر" میں جہاں اسکندریہ کے متعلق یہ ثابت کیا ہے کہ عربوں کی فتح سے پہلے یہ کتب خانہ برباد ہو چکا تھا، وہاں سب سے بڑی دلیل یہ قائم کی ہے کہ اس روایت کے (جس میں کتب خانہ کا عربوں کے ہاتھ سے برباد ہونا بیان کیا گیا ہے) وضعی اور جعلی ہونے پر سب سے زیادہ قطعی شہادت یہ ہے کہ اس روایت کا ہیرو یعنی یحییٰ نحوی کا اس عہد میں وجود تاریخی اسناد کے بالکل مخالف ہے اور اگر وہ اس عہد میں موجود ہو تو اس کی عمر ایک سو تیس برس سے بہت زیادہ تسلیم کرنی پڑے گی،

لندن کے اخبار ٹائمز میں ایک مضمون نگار نے جرجی زیدان اڈیٹر الہلال کی تصنیف "تاریخ مصر جدید" کے حوالے سے کتب خانۂ اسکندریہ کی نسبت کہا تھا کہ وہ مسلمانوں کی راہ سے برباد ہوا، مسٹر بٹلر نے ۲۵ جون سنہ ۱۹۱۱ء کے ٹائمز میں اس مضمون کی بڑی دھجی اڑائی، وہ کہتے ہیں:

> نہایت تعجب کی بات ہے کہ لوگ پھر از سر نو اس واقعہ کو دُہرا رہے ہیں کہ عمرؓ نے اسکندریہ کا کتب خانہ جلا دیا، اور یہ بھی تعجب سے خالی نہیں کہ اس قسم کے مضامین ٹائمز جیسے وسیع اخبار میں شائع ہوں، میں سمجھتا ہوں مضمون نگار نے اس مسئلہ پر علمی اور تاریخی دونوں پہلوؤں سے غور نہیں کیا ہے، اور اگر کرتا تو اس کو معلوم ہو جاتا کہ جن چیزوں کو وہ دلائل جدید سمجھ رہا ہے وہ اس موضوع کی پیش پا افتادہ باتیں ہیں جن پر اس مسئلہ کی تحقیق میں اعتماد نہیں کیا جا سکتا
>
> میں نے اپنی تصنیف "فتح مصر" میں اس بحث کے متعلق ایک خاص باب قائم کیا ہے جس میں واضح دلائل سے

حسب ذیل نتائج ثابت کئے گئے ہیں -

(۱) کتب خانہ اسکندریہ کے جلانے کا واقعہ یورپین تصنیفات میں فتح مصر کے پانچسو برس بعد شائع کیا گیا ہے اس کی اشاعت کرنے والے عبد اللطیف بغدادی، جمال الدین قفطی، ابو الفدا اور مقریزی ہیں اور اس میں بھی شک نہیں کہ ابو الفرج نے اپنی روایت عبد اللطیف سے حاصل کی ہے، یہ تحقیق کوئی جدید امر نہیں ہے بلکہ پہلے سے یہ مشہور و معروف و متداول ہے

(۲) اس واقعہ کے متعلقات جو بیان ہوتے ہیں وہ اس کو واقعیت سے دور کر دیتے ہیں،

(۳) اس واقعہ کا ہیرو یوحنا (یحییٰ) فیلیپونوس ہے اور یہ عربوں کے مصر فتح کرنے سے بہت پہلے مر چکا تھا۔

(۴) اسکندریہ میں دو عظیم الشان کتب خانے تھے، ایک عجائب خانہ کا کتب خانہ اور دوسرا سیراپیم کا کتب خانہ، اس واقعہ میں جس کتب خانہ کا نام لیا جاتا ہے وہ ضرور ہے کہ انھیں دونوں کتب خانوں میں سے ایک ہو لیکن پہلا کتب خانہ جولیس سیزر کے معرکہ میں مسلمانوں کے فتح مصر سے چار سو برس پہلے برباد ہو چکا تھا، دوسرے کتب خانہ کے متعلق تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ یا تو ۳۹۱ سنہ ہجری میں وہ دوسری جگہ منتقل ہو گیا تھا یا اسی سنہ میں وہ تلف ہو گیا تھا اس بنا پر ۶۴۲ سنہ ہجری میں یعنی مسلمانوں کے مصر فتح کرتے وقت اسکندریہ میں کسی کتب خانہ کا وجود نہ تھا، پانچویں چھٹی اور ساتویں صدی کی تصنیفات میں اسکندریہ کے کسی کتب خانہ کا ذکر نہیں ہے،

(۵) اگر کتب خانہ فتح اسکندریہ کے وقت وہاں موجود ہوتا تو اس کو اس زمانہ صلح میں جو اسکندریہ کو مسلمانوں کے سپرد کر دینے سے پہلے رومیوں کو از روئے معاہدہ دوسری جگہ منتقل کرنا آسان تھا، کیونکہ معاہدہ کی ایک دفعہ یہ تھی کہ بیش قیمت چیزیں رومی اپنے ساتھ لے جا سکتے ہیں، دریا کا راستہ اس زمانے میں بالکل کھلا ہوا تھا

(۶) اگر بالفرض یہ کتب خانہ دوسری جگہ منتقل ہوتا یا برباد کر دیا جاتا تو اس زمانے کا مشہور مورخ جان نیکیوس اس واقعہ کے ذکر سے خاموش نہ رہتا -

ان وجوہ کی بنا پر اڈیٹر الہلال نے کوئی ایسی بات نہیں کہی جو نئی ہو بلکہ یہ وہی پرانی اور پری بات ہے، اور مضمون نگار نے آپ کے اخبار کے کالموں میں اپنی جہالت کے ثبوت کے علاوہ کوئی تاریخی دلیل نہیں پیش کی جس سے واقعہ کا ثبوت ہو۔

مسٹر بٹلر جن تحقیقات تک پہنچے ہیں اُن میں یحییٰ نحوی کے زمانۂ وجود کے علاوہ اور تمام باتیں اس سے بہ دلائل بار بار ثابت کی جا چکی ہیں، ہم مسٹر بٹلر کے اُن دلائل سے واقف نہیں ہیں جن سے انھوں نے یحییٰ کے زمانہ مصر میں موجود نہ رہنے پر استدلال کیا ہے -

سید سلیمان

(الندوہ - دسمبر ۱۹۱۱ء)

بقیہ بزم ریاض

اپنے نسب پر بڑا ناز تھا، اور وہ کسی اور کو پٹھان تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ رام پور میں بڑے بوڑھوں کی زبانی یہ بھی سنا تھا کہ یہ لوگ اصل شیوخ عراقی ہیں، مولانا کے دادا علی بخش خاں صاحب ولد محبوب بخش کو سرکار انگریزی سے خطاب خانی ملا تھا، اس وقت سے یہ لوگ "خان" کہلانے لگے۔

مولانا کے چچا زاد بھائی حافظ احمد علی خاں شوق رام پوری مرحوم نے تذکرۂ کاملان رام پور میں اپنے خاندان کا بڑی تفصیل کے ساتھ لکھا ہے، لیکن اس سے ان کا سید ہونا تو ثابت نہیں ہوتا، خدا جانے کسی صاحب نے انہیں سید کیسے لکھ دیا - والسلام

سید عبد القدوس ہاشمی

علامہ سید سلیمان ندوی اور پاکستان کے تین سال

غلام محمد ایم۔اے عثمانیہ

پسِ منظر

یہ ۴۲-۱۹۴۳ء کا ذکر ہے، مسلم لیگ ترقی کے آخری مراحل طے کر رہی ہے مگر حصولِ مقصد میں کھٹکا اب بھی لگا ہوا ہے قوم پرست مسلمان گو اپنا وقار کھو چکے ہیں مگر جمعیت علمائے ہند کی پشت پناہی ان کو سہارے ہوئے ہے۔ اِدھر لیگ میں اس جمعیت کے مقابلہ کی کوئی جماعت موجود نہیں ہے گویا لیگی فوج کا قلب کمزور ہے، مگر مشکل یہ درپیش ہے کس جرنیل کو اس کیلئے آمادہ کیا جائے جس کے جھنڈے تلے علماء کی فوج صف آرا ہو سکے، لامحالہ پہلی نظر علامہ سید سلیمان ندوی پر پڑی جو سطوت ذاتی، اصابت فکری اور عظمت علمی میں اپنی نظیر نہ رکھتے تھے اور معرکۂ "خلافت" میں جن کے جوہر کھل چکے تھے۔ مگر علامہ ۱۹۲۶ء کے بعد سے عملی سیاست سے کنارہ کش ہو چکے تھے، لیگ کے بہی خواہ ان کو دوبارہ اس میدان میں نہ لا سکے، حتیٰ کہ مولانا ظفر احمد عثمانی نے بھی مجبور کرنا چاہا تو علامہ نے ان کو اس جواب سے لاجواب کر دیا کہ "آپ ہی کے بزرگ (مراد مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ) مجھ کو جلوت سے خلوت میں لے آئے اور اب آپ چاہتے ہیں کہ مجھے اس خلوت سے نکال کر پھر جلوت میں لے آئیں" —— غرض جب یہ کوشش ناکام ہوئی تو لوگوں نے مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کو تاکا، کچھ تامل کے بعد مولانا عثمانی نے "جمیعت علمائے اسلام" کی کمان اپنے ہاتھ میں لی اور ربِ رحیم ان کی روح کو ہمیشہ مسرور رکھے کہ مولانا نے اس منصب کا پورا حق ادا کیا۔

پاکستان جب بن چکا تو مولانا عثمانی صوبۂ بنگال کی طرف سے مرکزی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور مولانا اور ان کے رفقاء کی کوشش سے مارچ ۱۹۴۹ء میں وہ "قرار دادِ مقاصد" پاس ہوئی جس کی رو سے دستور پاکستان کا کتاب و سنت میں ڈھالنا ناگزیر ہو گیا، لیکن اب ان ماہرین کی ضرورت تھی جو دستور اسلامی کے مہتم بالشان کام کو انجام تک پہنچا سکیں یہاں کے ارباب حل و عقد اور مولانا عثمانی رح کی تجویز پر یہ طے پایا کہ پانچ علماء پر مشتمل ایک بورڈ تشکیل دیا جائے جو دستوری سفارشات کو اصول شرع پر قائم اور حدود شرع میں باقی رکھ سکے اس کے لئے اہل نظر کی نظر پھر جامع علوم جدید و قدیم علامہ ندوی ہی پر پڑی اور آپ نے علامہ کا اسم گرامی اس بورڈ کی صدارت کے لئے تجویز فرمایا، یہ سب کچھ علامہ کے بلا ایما محض بہ اُمید منظوری ہوا، بورڈ کے اور ارکان ڈاکٹر محمد حمید اللہ، مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی پروفیسر عبدالخالق اور مجتہد جعفر حسن منتخب ہوئے، پیرس سے ڈاکٹر صاحب آ گئے، اور حضرات تو پاکستانی ہی تھے۔ اگست ۱۹۴۹ء سے بورڈ نے اپنا کام شروع کیا مگر صدر بورڈ کی آمد کا مسئلہ ابھی باقی تھا

آمد

حکومت پاکستان کی طرف سے علامہ کے نام دعوت نامہ جاری ہوا جو اس وقت ریاست بھوپال کے عہدہ

قاضی القضاۃ پر فائز تھے —— علامہ جنہوں نے خون پسینہ ایک کرکے دار المصنفین اعظم گڑھ کو بار آور بنایا اور ارض پاک بھیا کے بعد جو زمین دائمی خواب گاہ کے لئے ان کو محبوب تر تھی، جن کی ذات ہزاروں صاحبان علم و تقویٰ کا مرجع اور جن کا وجود ہندوستانی مسلمانوں کی دینی سرپرستی اور روحانی پشت پناہی کا باعث بنا ہوا تھا، پاکستان آنے کا فیصلہ اس آسانی سے کیسے کرسکتے تھے، ایک صورت البتہ ہوسکتی تھی کہ ان کو اس بات کا یقین ہوجاتا کہ یہاں کا قیام ملتِ اسلامیہ کے لئے ہندوستان کے قیام سے زیادہ مفید ہے اور یہ کہ اس نوزائیدہ مملکت کے رہنماؤں میں ملی ترقی کا جذبہ موجود اور کام کرنے کی تڑپ پیدا ہے، چنانچہ حکومت کی طرف سے جو دعوت نامہ جاری ہوا اس کے جواب میں صاف یہ تحریر فرمایا کہ حکومت کا مقصود اصلاً کچھ کام کرنا ہے یا محض نام و نمود؟ پہلے کام کا تیقن دلایا جائے تاکہ آنے نہ آنے سے متعلق غور ہوسکے! اس کا جواب بھی حکومت نے محض رسمی طور ہی پر دیا جس سے علامہ کی تشفی نہ ہوئی اور علامہ نے پھر کام کے تیقن پر زور دیا اور جواب کے منتظر رہے —— اسی زمانہ میں بعض حضرات نے علامہ کو خطوط لکھے اور پاکستان تشریف لانے پر زور دیا۔ چنانچہ راقم کے ایک عریضہ کے جواب میں یہ تحریر فرماتے ہیں:

"حالت یہ ہے کہ ہر دو جگہ میرے وجود کے لئے احباب مصر ہیں، اپنی حالت یہ ہے کہ عدم صحت اور ضعف قویٰ سے بھی اور طبیعت کے اقتضا ر سے بھی اختلاف و منازعت سے گھبراتا ہوں" (۱۸ جنوری سنہ ۵۰ء)

دن گزرتے گئے، موسم حج قریب آیا، ۲۲ اگست سنہ ۱۹۴۹ء کو علامہ زیارت حرمین کے لئے روانہ ہوگئے، یہ وہی سال تھا جس میں پاکستان سے ایک وفد خواجہ شہاب الدین وزیر داخلہ کی سرکردگی میں حجاز گیا تھا اور مولانا ظفر احمد عثمانی بھی اس کے ایک رکن تھے —— ۲۹ دسمبر سنہ ۴۹ء کو علامہ حج سے فارغ ہوکر ہندوستان لوٹ آئے۔

علامہ کے بڑے داماد سید ابوعاصم صاحب اڈوکیٹ سنہ ۴۸ء ہی میں کراچی آچکے تھے، علامہ کو اپنی چہیتی صاحبزادی جوان دونوں علیل بھی تھیں! اور نواسوں سے ملے ہوئے ایک عرصہ ہوا تھا اور محبتِ پدری جوش زن تھی، چنانچہ راقم کے ایک مکتوب میں یہ مضطربانہ جملہ تحریر فرمایا تھا "ان کیلئے دل بے چین رہتا ہے کیوں کر ان کے پاس پہنچوں؟" —— غرض عارضی طور پر پاکستان آنا چاہتے تھے لیکن ہند و پاکستان کے تعلقات آج کل کی طرح استوار نہ تھے کہ آمد و رفت بہ آسانی ہوسکتی —— ادھر ۱۳ دسمبر سنہ ۴۹ء کو مولانا عثمانی کی رحلت ہوچکی تھی اور ارکان بورڈ اور خود حکومت وقت کو علامہ کا انتظار تھا، انتظار کی مدت کو ختم نہ ہوتا دیکھ کر مولانا احتشام الحق یہاں سے بھوپال روانہ ہوئے علامہ سے ملاقات کی، یہاں کے احوال سنائے، مولانا عثمانی رح کے بعد علماء کے انتشار کا ذکر بھی کیا اور ملک میں عموماً اور اسمبلی میں خصوصاً ایک صاحب بصیرت اور موثر شخصیت کی ضرورت واضح کی، ساتھ ہی حکومت کی نیک نیتی اور مخلصانہ انتظار کا یقین دلایا —— ان سب کے باوجود علامہ جیسی صاحبِ بصیرت شخصیت ان باتوں پر سو فیصد یقین کرکے کوئی قطعی فیصلہ کیسے کرسکتی تھی۔ عارضی طور پر آنے کا وعدہ فرمایا، مولانا واپس آگئے اور علامہ کی آمد کا مژدہ سنانا

۱۴ جون سنہ ۱۹۵۰ء کو علامہ ندوی رح کراچی وارد ہوئے مگر اس حالت سے کہ بجز چند جوڑے کپڑوں کے اور کچھ ساتھ نہ تھا، صاحبزادہ سلمان سلمہ البتہ ساتھ تھے جو یوں بھی ہر سفر میں ساتھ ہی رہتے تھے، علامہ دلی سے لاہور اور لاہور سے کراچی آرہے تھے، لاہور میں مولانا ابو الاعلیٰ مودودی نے علامہ کو چائے پر مدعو کیا تھا، اس ضیافت کے وقت علامہ سے ایک سوال یہ بھی کیا گیا کہ کیا آپ نے "بورڈ تعلیمات اسلامی" کی صدارت کی پیش کش قبول فرمالی ہے؟ کم سخن اور صاحبِ عظمت

ہستی نے ظریفانہ اور پُرمعنی جواب دیا کہ

"ایجاب ہوچکا ہے، قبول باقی ہے"

مُستقل قیام اور بورڈ میں عدم شرکت کی وجہ

علامہ جس وقت کراچی پہنچے ہیں، لیاقت علی خاں مرحوم امریکہ کے تاریخی دورہ پر گئے ہوئے تھے۔ یہ بات قرین مصلحت سمجھی گئی کہ وزیراعظم سے پہلے بالمشافہ گفتگو ہوجائے تاکہ بورڈ میں شرکت یا عدم شرکت کا حتمی فیصلہ ہوسکے۔ اور شرکت کے فیصلہ کی صورت میں ہندوستان جاکر مع اہل وعیال دوبارہ یہاں تشریف لائیں۔ وزیراعظم مرحوم کی واپسی میں پہلے تو کافی دیر ہوئی اور آنے کے بعد بھی مہینہ بھرتک ملاقات کی صورت نہ نکل سکی یا کسی وزیر نے اس کا موقع نہ آنے دیا۔ اس دوران میں علامہ نے ملک کے حالات کا اندازہ لگایا اور ان کو اپنے خیال کی صحت پر یقین آتا گیا کہ حکومت کو محض ان کے نام کی ضرورت ہے، کام مطلوب نہیں اور یہ کہ یہاں کا ماحول مصالحانہ خدمت کے لئے سازگار نہیں بلکہ مخالفانہ جدوجہد کی ضرورت ہے جس کے لئے وہ اپنی افتادِ طبع اور ضعفِ قویٰ کی وجہ سے قطعاً آمادہ نہ تھے، چنانچہ کئی بار مختلف محفلوں میں فرمایا کہ

"مجھے چیمبر پریکٹس آتی ہے، پبلک پریکٹس نہیں آتی۔"

غرض فضا کی عدم موافقت اور مدت قیام کے قریب الختم ہونے کی وجہ سے واپسی کا عزم فرمالیا اور پوری تیاری کرلی مگر ایک طرف بعض محبین کا قیام پر مسلسل اصرار اور دوسری طرف دفتر ہندوستانی ہائی کمشنر کی بے التفاتی سے بندھا ہوا اسباب کھول دیا گیا، اسی دوران میں علامہ نے انجمن ترقی اردو کی جانب سے منعقدہ ایک جلسۂ عام میں جس کی صدارت ڈاکٹر محمود حسین (اسٹیٹ منسٹر) نے کی تھی، ایک محققانہ مقالہ "ہندوستان کے نومسلم حکمراں" کے عنوان سے پڑھا جس کے بعد پہلی مرتبہ صدر جلسہ نے تالیوں کی گونج میں یہ اعلان کیا کہ علامہ ندوی پاکستانی بن چکے ہیں اور اب ہندوستان واپس نہ جائیں گے۔ اس طرح غیر اختیاری طور پر علامہ کا یہاں قیام ہوگیا اور پھر دسمبر ۱۹۵۰ء میں اہل وعیال بھی آگئے — چونکہ قصد وارادہ کے بغیر یہاں مستقلاً قیام ہوگیا اس لئے علامہ کو جائداد اور مال کا کافی نقصان برداشت کرنا پڑا۔

اس واقعہ کے بعد مرحوم قائد ملت سے علامہ کی ایک ملاقات ہوئی، وزیراعظم نے بورڈ کی شرکت پر اصرار کیا علامہ نے تحریری طور پر "شرائط تقرر" (Terms of reference) کا مطالبہ کیا۔ ادھر وزیراعظم کا اصرار رہا کہ پہلے بورڈ میں شرکت فرمالیں پھر سب کچھ ہوجائے گا ادھر علامہ اپنی بات پر جمے ہوئے تھے، اب بات طے ہوتی تو کس طرح؟ اس کے بعد علامہ نے بورڈ میں شرکت کئے بغیر "بورڈ تعلیمات اسلامی" کی مرتبہ رپورٹ کو ملاحظہ فرماکر اپنی رائے ظاہر فرمادی اور اب تو بظاہر بورڈ میں شرکت کی ضرورت اور بھی باقی نہ رہی، مگر وزیراعظم مرحوم مختلف ذرائع سے شرکت پر برابر زور دیتے رہے، یہاں تک کہ علامہ نے شرکت کا ارادہ فرمالیا — ان دنوں بنیادی اصولوں کی پہلی کمیٹی کی سفارشات چھپ چکی تھیں جن میں برطانوی پارلیمانی سسٹم اور اسلامی اصولِ آئین میں تطبیق دینے کی ناکام کوشش کی گئی تھی اور یہ سفارشات نہایت مایوس کن سمجھی جارہی تھیں۔ "بورڈ تعلیمات اسلامی" کے مشوروں کو اس میں قطعاً نظرانداز کیا گیا تھا، ان حالات میں جب علامہ نے بورڈ میں شرکت کا ارادہ فرمایا تو ارکان بورڈ نے علامہ کو یہ کہہ کر شرکت سے باز رکھا کہ پیدا شدہ صورتِ حال کی بنا پر وہ خود بورڈ سے مستعفی ہورہے ہیں، علامہ چپ ہورہے، مگر بجز ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے

کسی نے استعفیٰ نہ دیا۔ اس کے بعد علامہ عجیب کشمکش میں ڈالے گئے' ایک گروہ کا اصرار تھا کہ بورڈ میں ضرور شرکت کریں، دوسرا گروہ کہتا تھا کہ ہرگز نہ کریں۔ اسی کشاکش اور ذہنی کوفت میں علامہ کے تقریباً دو برس گزر گئے' پھر کراچی کی "گراں زندگی' ذرائع آمدنی کا فقدان' معیارِ رہائش کی بلندی اور اہل و عیال کا ساتھ ان سب باتوں کے یکجا ہونے" سے جو تکلیف پہنچی ہوگی وہ الگ ہے' مگر واہ رے تحمل و توکل کہ عالمانہ وقار اور شانِ استغنیٰ میں ذرہ برابر فرق نہ آیا' اس ادا پر سب حیران تھے! ورنہ کراچی نے کتنی ذی علم اور باوقار ہستیوں تک کو مکان' دوکان' فیکٹری وغیرہ کے "الاٹمنٹ" اور "پگڑی" کے پیچ وخم میں ڈال کر رسوا کیا ہے' اناللہ

۳۱ علماء کی کمیٹی

گزرچکا کہ بنیادی اصولوں کی کمیٹی نے اپنی رپورٹ شائع کردی تھی اور "بورڈ" کی سفارشات کو اس میں قطعاً نظر انداز کردیا گیا تھا' اس لئے ضروری سمجھا گیا کہ پاکستان کے ہر مکتبِ خیال کے علماء کو جمع کرکے اسلامی دستور کا ایک خاکہ حکومت اور عوام کے آگے رکھ دیا جائے اور اس طرح علماء اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوں' چنانچہ دسمبر ۵۰ء میں مختلف اسلامی فرقوں کے ۳۱ علماء کا کراچی میں اجتماع ہوا اور حضرت علامہ رح کی ممتاز صدارت و رہبری میں اس کمیٹی نے تین چار دن کے اندر ایک دستوری خاکہ پیش کیا جس پر اربابِ حکومت حیران رہ گئے اور اس کامیاب اقدام پر علامہ کے نام مبارکبادی کے خطوط اور برقیے جاری کئے — یہی ایٹم بم تھا جس سے حکومت کی پیش کردہ رپورٹ نابود ہوگئی۔

لاکمیشن کا قیام

علامہ رحمۃ اللہ علیہ کی نظر بہت غامض تھی' کراچی اور پاکستان کے دوسرے مقامات پر جہاں جہاں بھی علامہ کو موقع ملا آپ نے اس بات پر زور دیا کہ نہ تو تنہا دستور سے کوئی مملکت "اسلامی مملکت" بن جاتی ہے اور نہ اس میں کوئی انقلابی شان پیدا ہوسکتی ہے' جب تک کہ اس ملک میں قانونِ اسلامی رائج نہ ہوجائے جس سے رعایا شب و روز دوچار ہوتی ہے' یہی بات علامہ نے مرحوم لیاقت علیخاں کو بھی سمجھائی اور وہ اس کی صداقت کو پاگئے' چنانچہ ۵۰ء ہی کے اواخر میں مرحوم وزیراعظم نے ایک لاکمیشن کا اعلان کیا جس کے تین ارکان جسٹس رشید' جسٹس میمن اور علامہ سید سلیمان ندوی قرار پائے' اس کمیشن کا فریضہ یہ طے پایا کہ مروجہ قانون پر نظرثانی کرکے اس کو اسلامی قانون کے حصار میں لے آئے — یہ علامہ کا خاموش مگر ٹھوس کارنامہ ہے۔

اس کمیشن کے قیام کے بعد علامہ رح نے اس خیال سے کہ قانونِ اسلامی کی تمام تر ذمہ داری تنہا اُن ہی پر عائد نہ رہے مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کے لاکمیشن میں لئے جانے کی تحریک کی اور اس کو منوالیا —— یہ علامہ کے حزم و احتیاط اور تقویٰ و خشیت کا کھلا ثبوت ہے! —— یہ "لاکمیشن" ملک کے سارے سیاسی مدوجزر کے باوجود اپنے کام میں آج بھی مشغول ہے۔

دارالعلوم ٹنڈو اللہ یار

شیخ الاسلام مولانا عثمانی رح کی آرزو تھی کہ اس نوزائیدہ مملکت میں ایک ایسی درسگاہ قائم کی جائے جس میں علوم دینی کے ساتھ ساتھ مروجہ علوم کی بھی تعلیم دی جائے' اس غرض کے لئے مولانا نے جو کمیٹی بنائی تھی اس میں بھی علامہ ندوی کا اسم گرامی بطور خاص رکھا تھا' اور مولانا ہی کے ایما سے مولانا منتخب الحق صدر شعبۂ اسلامیات اردو کالج نے اس کا ایک خاکہ بھی تیار کرکے پیش کردیا تھا لیکن مولانا رح کی رحلت اور علامہ کے نہ ہونے سے یہ کام آگے نہ بڑھ سکا کچھ عرصہ بعد ایک اہلِ خیر نے ٹنڈو اللہ یار ضلع حیدر آباد سندھ

یں ایک کافی بڑی زمین اور معتد بہ رقم اس کام کے لئے وقف کی! اور مولانا احتشام الحق نے ٹھیک دارالعلوم دیوبند کے ہنج کا ایک مدرسہ قائم کردیا اور اسی کو مولانا کی تمناؤں کا ثمر سمجھے' پھر جب علامہ سید سلیمان ندوی کراچی تشریف لائے تو ان کو اس کا سرپرست بنایا مگر کچھ ہی عرصہ بعد جب علامہ کو اپنی مرضی کے تابع نہ دیکھا تو سرپرست کی بارگاہ میں بھی گستاخ بن گئے' علامہ شرافتِ مجسم تھے' خاموشی سے کنارہ کش ہوگئے اور اس کے بعد مدرسہ میں جو کچھ ہوا اور اب اس کی جو حیثیت رہ گئی ہے' وہ ایک داستانِ عبرت ہے' جو ہمارے موضوع سے خارج ہے۔

مدرسۂ ٹنڈو آدم

مدرسۂ مذکور کے قیام کے کچھ عرصہ بعد ندوی حضرات میں بھی ندوۃ العلماء کے طرز پر ایک مدرسہ کے قیام کا خیال پیدا ہوا' ٹنڈو آدم سندھ میں اس کے کچھ مواقع تھے' بعض مقامی ندوی حضرات نے اس کا ایک خاکہ مرتب کیا اس کے نام میں بھی ندوی نسبت کی رعایت رکھی' اور علامہ سے اس کی سرپرستی کی درخواست کی' اب علامہ کی عالی ظرفی کو دیکھئے صاف طور پر فرمادیا کہ دیوبند اور ندوہ سب ہندوستان میں چھوٹ چکے اب ان ناموں سے کیا حاصل ہے اور محض اسی ہنج کے مدرسوں کا قیام بدلے ہوئے حالات میں کیا خاص فائدہ مند ہوسکتا ہے' ضرورت ہے کہ ملک اور قوم کے موجودہ تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے جدید نصاب تعلیم بنایا جائے' مگر اس پر بعض ندوی حضرات نے یہ فرمایا کہ "آپ کی ندویت کچھ کمزور ہوتی جارہی ہے" —— علامہ کی عادت تھی ایک مرتبہ مشورہ تو دے دیتے تھے مگر پھر اصرار کبھی نہ فرماتے تھے —— مدرسہ کا قیام بہرحال طے پایا اور ٹنڈو آدم میں اس کا افتتاحی جلسہ علامہ ہی کی صدارت میں عظیم الشان پیمانہ پر کیا گیا' جلسہ تو بہت کامیاب رہا لیکن بعد کو معلوم ہوا کہ جن بلند عزائم سے اس کا آغاز ہوا تھا وہ معاشی مشکلات کی بنا پر پورے نہ ہوسکے۔

بورڈ میں شرکت

دستوری سفارشات از سر نو مرتب ہو رہی تھیں' اب علامہ کی "بورڈ تعلیمات اسلامی" میں شرکت نہایت ضروری سمجھی گئی' منجملہ اور مخلصین کے مولانا مفتی محمد حسن صاحب (جامعہ اشرفیہ - لاہور) نے بار بار شرکت پر زور دیا اور فرمایا کہ "آپ انجن ہیں' ہم سب ڈبے ہیں' بغیر انجن کے گاڑی چل نہیں سکتی" —— احباب کے اصرار اور وقت کی ضرورت سے مجبور ہو کر بالآخر اپریل ۱۹۵۲ء میں علامہ نے بورڈ میں شرکت فرمائی اور تا آخر حیات اس کے فرائض انجام دیتے رہے۔

جامع مسجد سلیمانیہ

دفاتر معتمدی کے ملازمین کی ایک کالونی کلیٹن کوارٹرز کے نام سے آباد ہے اس کے وسط میں ایک اچھی خاصی وسیع زمین کے ایک گوشہ میں ایک خس پوش مسجد تھی اور یہاں ایک شاندار جامع مسجد کے قیام کا منصوبہ تھا' جب لوگوں نے دیکھا کہ علامہ جیسی بزرگ ہستی کراچی میں تشریف فرما ہے اور حسن اتفاق سے آپ کا قیام اس مسجد سے کچھ زیادہ فاصلہ پر نہیں تو موقع کو غنیمت سمجھ کر صدر مسجد کمیٹی جناب راحت علی رضوی نے جو اس وقت اسسٹنٹ ڈائرکٹر سیول ایوئیشن کراچی تھے علامہ سے درخواست کی کہ اس مسجد کی سرپرستی قبول فرمائیں' جمعہ بھی پڑھائیں اور روزانہ بعد نماز فجر درس تفسیر سے استفادہ کا موقع عطا فرمائیں' درویش دل علامہ نے یہ خدمت قبول فرمائی اور موسم کی سختی نرمی کا خیال کئے بغیر افادۂ خلق میں مشغول ہوگئے' کچھ دنوں بعد کمیٹی نے درخواست کی کہ اس مسجد کا نام "جامع مسجد سلیمانیہ" رکھنے کی اجازت عطا ہو' علامہ اپنی ساری عظمتوں کے باوجود سراپا حیا تھے' نظریں جھکالیں' فرمایا اگر مسجد کا نام ہی رکھنا ہے تو ہمارے حضرت

رحمۃ اللہ علیہ کے نام پر "جامع مسجد اشرفیہ" رکھئے، مگر ارکان کمیٹی نے عرض کیا کہ ہم کو تو آپ سے عقیدت ہے، ہم تو آپ ہی کے نام سے منسوب کریں گے، علامہ خاموش ہوگئے، کمیٹی نے ایک باضابطہ دستور مرتب کیا اور مجوزہ نام کے ساتھ اس کو رجسٹر کرا دیا، خس پوش مسجد کو وسیع کرکے اصل مجوزہ نقشہ کے برابر ایک وسیع چبوترہ اسبسٹاس سے مسقف کیا گیا۔ مصلیوں کی تعداد روز افزوں ہوتی چلی گئی

لقوہ کا گمان

راقم کے اصرار پر علامہ نے تفسیر کے ساتھ ساتھ درس حدیث بھی آغاز فرمایا، جاڑوں کا موسم تھا، کھلی مسجد، چبھتی ہوئی ہوا، علامہ تشریف لائے اور مشکوٰۃ شریف کھول کر حدیث "انما الاعمال بالنیات" تلاوت فرمائی اور اس کی تشریح فرمانے لگے، یکایک آواز پست تر ہوگئی، الفاظ ناقابل فہم ہوگئے، آنکھیں کچھ بند سی ہوگئیں، حاضرین نے محفل برخاست کی، علامہ گھر پہنچائے گئے اور فوراً طبی امداد حاصل کی گئی، ڈاکٹروں کا بیان تھا کہ لقوہ کا ہلکا سا حملہ ہوا تھا مگر زائل ہوگیا، ڈاکٹروں نے آئندہ کے تحفظ کے خیال سے انجکشن کا ایک کورس تجویز کیا، ہفتہ عشرہ میں بات آئی گئی ہوگئی، چہرۂ پُرجمال پر کوئی اثر نہ رہا۔ یہ نومبر ۱۹۵۰ء کا ذکر ہے، اس کے بعد جاڑوں کے ختم تک درس تفسیر و حدیث ملتوی رہا۔

مدرسۃ القرآن اور دائرۃ المصنفین

علامہ کا ہمیشہ سے خیال تھا کہ جب تک ہمارا نظام تعلیم نہ بدلا جائے گا اور جدید و قدیم علوم میں ہم آہنگی نہ پیدا کی جائے گی، دنیا و دین کی تفریق نہیں مٹ سکتی اور جب تک یہ تفریق باقی ہے، ملت اسلامیہ اپنے مخصوص رنگ میں ترقی نہیں کر سکتی، راقم نے خلوت میں بھی علامہ کو اس مسئلہ سے مضطرب بارہا دیکھا ہے، فرماتے تھے کہ دیندار اور انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ کے درمیان جو خلیج حائل ہے جب تک اس کو پاٹا نہ جائے گا، قوم ترقی نہیں کر سکے گی اور اس کے لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ قرآن فہمی کا صحیح ذوق عام تعلیم یافتہ طبقہ کے اندر پیدا کیا جائے، ان کو جدید شیشوں میں قدیم شراب بھر بھر کر پلائی جائے اس کے لئے علامہ کی خواہش تھی عربی داں انگریزی اعلیٰ التعلیم یافتہ اور دینی اعلیٰ التعلیم یافتہ افراد پر مشتمل ایک جماعت کھولی جائے جس میں علامہ قرآن فہمی سے متعلق درس دیا کریں تاکہ ان میں تعلیمات قرآن کی افہام و تفہیم کا صحیح مذاق پیدا ہو ——— جامعہ مسجد سلیمانیہ سے جب تعلق ہوا تو علامہ کو اپنی یہ آرزو پوری ہوتی نظر آئی، اور "مدرسۃ القرآن" کے نام سے علامہ نے ابتدائی درجوں سے لے کر اعلیٰ درجوں تک کا ایک خاکہ اپنے دست مبارک سے مرتب فرمایا، خوش بختی سے یہ قلمی تحریر راقم کے پاس محفوظ ہے اور من و عن درج ذیل ہے :-

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مدرسہ دار القرآن جامع مسجد سلیمانیہ

مقصد : اس مدرسہ کا مقصد قرآن پاک کی تعلیم، تجوید، تبلیغ اور تذکیر ہے۔

شعبے : بالفعل اس کے آٹھ شعبے ہوں گے۔

(۱) مکتب ناظرہ، جس میں بچوں اور بچیوں کو ناظرہ قرآن پاک کی تعلیم دی جائے گی

(۲) حافظ، جس میں بچوں اور بچیوں کو حفظ قرآن پاک کرایا جائے گا۔

(۳) تجوید و قرارت، طلبہ کو قرآن پاک کی تجوید اور تصحیح مخارج علماً اور عملاً سکھائی جائے گی۔

(۴) ترجمہ قرآن : ایسے شائقین کو جو آسان عربی زبان اس غرض سے سیکھنا چاہیں کہ وہ قرآن پاک کے معنی کو عربی زبان میں سمجھ سکیں، ان کے لئے عربی زبان کے ایسے آسان طریقہ تعلیم کا انتظام کیا جائے گا جس سے قرآن پاک کا ترجمہ کر سکیں اور سمجھ سکیں۔

(۵) تذکیر قرآن : روزانہ کسی مناسب مقررہ وقت پر قرآن پاک کے معنی و مطلب کی تشریح تذکیر و نصیحت کیلئے کی جائے گی جس میں عامۃ المسلمین شرکت کر سکیں گے۔

(۶) درس قرآن : عربی یا انگریزی مدارس کے لئے ایسے فارغ التحصیل اشخاص جو عربی جانتے ہوں اور قرآن پاک کی اعلیٰ محققانہ تعلیم حاصل کرنے کا شوق رکھتے ہوں ان کو اس میں شرکت کی اجازت ہوگی

(۷) دارالاشاعت : قرآن پاک کے مباحث و تحقیقات پر مقالات اور محققانہ تصانیف کی نشر و اشاعت

(۸) کتب خانہ : قرآن پاک کی تفاسیر اور متعلقہ علوم و فنون پر جملہ مفید و مستند کتابیں جمع کرنا تاکہ اہل علم ان سے مستفید ہو سکیں۔"

مدرسہ کے ابتدائی چار درجوں کی تعلیم شروع ہوئی (۳۰۰) سے زائد طلباء داخل مدرسہ تھے اور ۱۲ مدرسین اس خدمت پر مامور ہوئے!

گزر چکا کہ جامع مسجد سلیمانیہ ایک وسیع قطعہ اراضی پر تھی علامہ کے ذہن میں دارالمصنفین کی طرح ایک ادارہ قائم کرنے کا خیال تو موجود ہی تھا۔ اب اس خیال کو عمل میں لانے کا موقع نظر آیا — "دائرۃ المصنفین" کے نام سے اس کی ایک اسکیم مرتب فرمائی جواب بھی جناب عاصم صاحب کے پاس موجود ہے۔ یہ تجویز ڈاکٹر حمید اللہ، ڈاکٹر رضی الدین (وائس چانسلر پشاور یونیورسٹی) اور دوسرے علم دوست حضرات کے سامنے رکھی گئی ہر ایک نے پورے تعاون کا وعدہ کیا اور اس کو ملک و قوم کی حقیقی خدمت قرار دیا — اس کے بعد علامہ مسجد کمیٹی کے افراد پر مسلسل زور دیتے رہے کہ جلد از جلد مسجد اور ادارہ کی عمارتوں کا نقشہ مرتب کر کے تعمیر کا کام آغاز کیا جائے گا — مسجد کمیٹی نے علامہ کی نگرانی میں عمارتوں کا نقشہ تیار کروالیا اور اب اس کی منظوری کے مراحل باقی تھے — مسجد کمیٹی کے دستور کے تحت سالانہ انتخاب ضروری تھے، اور ارکان کمیٹی حضرت علامہ کی سرپرستی کے ہوتے ہوئے اس کو محض رسمی طور پر انجام دینا چاہتے تھے اور کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ انتخابات مسجد کمیٹی اور علامہ کے عزائم کے لئے طوفانِ حوادث ثابت ہوں گے۔ انتخابات ہوئے اور مولانا احتشام الحق جو کبھی اس مسجد کے صدر رہ چکے تھے صدارت کے مدعی ہوئے اور دوبارہ کسی طرح اس کے صدر بن گئے اور پہلی مسجد کمیٹی ٹوٹ گئی۔ شائستہ اور علم دوست افراد کی جگہ غیر سنجیدہ لوگوں نے لے لی، مدرسہ اور ادارہ کی اسکیم ختم کر دینی پڑی۔ علامہ کو ان باتوں سے تکلیف یقیناً ہوئی مگر وہ ایک کوہِ تحمل تھے، کچھ نہ فرمایا، بلکہ اس سلسلہ میں کسی نے کچھ کہا بھی تو اس عارف کامل نے یہی جواب دیا "سب کا جواب خاموشی ہے، آخر صبر کی تعلیم کس دن کے لئے ہے؟" ویسے اب مولانا سے علامہ کا قلبی تعلق بالکل منقطع ہو گیا، چنانچہ ۵ ر اکتوبر ۱۹۵۲ء کو جب مولانا اشفاق الرحمٰن کاندھلوی، مولانا احتشام کے سفارشی بن کر حاضر خدمت ہوئے تو علامہ نے ان کو یہ غیر مبہم جواب دیا:

"ان سے کہئے کہ وہ چاہے ۳۶ مسجدوں کی جگہ ۷۴ مسجدوں کی صدارت
وقیادت کریں مگر اب اس دامن سے نہ لپٹیں نہ اُلجھیں"۔

یہ ایک سنجیدہ ہستی کی انتہائی ناراضی کے کلمات تھے، مولانا تک یہ بات یقیناً پہنچی ہوگی، عملاً تو مولانا نے یہی کر دکھایا کہ پھر جنازہ اٹھنے کے وقت تک اس منبعِ فیض کی طرف رُخ نہ کیا، وائے محرومی!..

احتفال علماء

علامہ کی نظر بہت عمیق اور مشاہدہ نہایت وسیع تھا، وہ ممالک اسلامیہ کے ربط واتحاد کے دل سے جویاں تھے اور چاہتے تھے کہ ممالک اسلامیہ میں ایک ایسا مستحکم رشتہ قائم ہو جائے کہ دنیا کی کوئی طاقت پھر ان کی طرف دست آز نہ بڑھا سکے۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے ان ممالک کے سربرآوردہ مفکرین وعلمار کا اتحاد ازبس ضروری تھا، اس کا تذکرہ مرحوم اکثر اپنی نجی مجلسوں میں فرمایا کرتے تھے، اتفاق سے مولانا اسعد القادری جو جمعیت علمائے اسلام کے ایک قدیم کارکن تھے، اس بات کو لے اڑے، اور انھوں نے اس کام کے لئے درپردہ جدوجہد شروع کردی، علامہ ان دنوں لاہور گئے ہوئے تھے، مولانا قادری نے ڈاکٹر محمود حسین وغیرہ سے مل کر یہ باور کرایا کہ یہ علامہ کی خواہش ہے، ڈاکٹر صاحب آمادہ ہوگئے، جب علامہ لوٹ آئے تو قادری صاحب نے ڈاکٹر صاحب وغیرہ کی آمادگی کا تذکرہ کرکے علامہ سے اس اجتماع کی منظوری حاصل کی جس کا نام "احتفال علمائے اسلام" قرار پایا، علامہ فرماتے تھے کہ:-

"میں نے اس وجہ سے دستخط کردئیے کہ ڈاکٹر محمود حسین کر چکے تھے، میں نے ان کا
بیان لاہور میں پڑھا تھا اور خود ڈاکٹر محمود نے اس غلط فہمی میں دستخط کئے کہ
شاید میں کرچکا ہوں، جب ملاقات ہوئی تو پتہ چلا کہ دونوں کو غلط فہمی ہوئی
اور اس کا باعث درمیانی صاحب تھے"۔

جو کچھ بھی ہو بات طے ہو چکی تھی، تنہا علامہ کے دستخط سے بلاد اسلامیہ کے سارے اکابر علمار کے نام دعوت نامے جاری ہوئے اور اس اجتماع کی اطلاع عام ہوگئی ——

مولانا عثمانی مرحوم کے بعد مختلف افراد ان کی جانشینی کے دعویدار تھے اور علمار میں ایک انتشار بپا تھا، جمعیت علمائے اسلام بھی پارہ پارہ تھی، مگر جب ان منتشر اجزاء نے یہ سنا کہ سارے ممالک اسلامیہ کے علمار کا اجتماع ہو رہا ہے اور اس کا سہرا تنہا ایک ہستی کے سر ہوگا تو سوچا کہ پھر جمعیت کا وزن کیا باقی رہ جائے گا؟ سب مل کر علامہ کی خدمت میں آئے اور دستوری موشگافیاں پیدا کیں، ہر ایک کا منشا یہ تھا کہ یا تو یہ اجتماع نہ ہو یا فلاں فلاں صاحب کو بھی نمایاں مقام دیا جائے، علامہ کو اس صورت حال سے بڑی پریشانی ہوئی، مگر ایک مستغنی ہستی کو فاتیات سے کیا واسطہ ہو سکتا تھا، سب کو شریک کار بنا لیا، اس کے باوجود بعض "علمار" میں باہم رسہ کشی جاری رہی اور نتیجتہً جو صاحب اس کام میں آگے آگے تھے، وہ پس پردہ ہوگئے اور جنھوں نے کچھ نہ کیا تھا وہ اُبھر آئے، بہرکیف وقت پر تقریباً سارے نمائندہ علمار جمع ہوگئے اور مفتی اعظم فلسطین اور بعض اور اکابر نے برملا کہہ دیا کہ ہم تو محض علامہ کے دستخط دیکھ کر آئے ہیں۔ اس اجتماع کے ایک اجلاس کی صدارت مفتی اعظم فلسطین نے اور ایک کی حضرت علامہ نے کی، علامہ نے اپنے خطبۂ صدارت میں اس کے جو اغراض ومقاصد بیان فرمائے وہ اُن کے خطبہ سے ترجمہ کرکے ذیل میں پیش ہیں۔

(۱) مسلمانوں میں باہمی تعاون و ربط پیدا کرنا
(۲) مسلمانوں کو توحید اور خاتم النبین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے جھنڈے تلے عملی طور سے متحد و منظم کرنا۔
(۳) ان وسائل و ذرائع کا معلوم کرنا جو اسلامی تحریک کی تقویت و تائید اور اللہ کی زمین میں قیام امن کا ضامن ہو۔
(۴) مسلمانوں کے ہر شہر میں دین اسلام کی نشر و اشاعت اور مسلمانوں کے احوال کی اصلاح اور ان کو دین خالص کیطرف دعوت دینے کی غرض سے عمومی ادارے کی تشکیل و تاسیس!
(۵) دور حاضر کے تقاضوں کے مطابق فقہ اسلامی کی تحقیق و تدوین کے لئے ادارہ کا قیام!
(۶) اسلامی علوم اور علوم جدیدہ کی نشر و اشاعت اور ترقی کے لئے جد و جہد
(۷) ممالک اسلامیہ کے درمیان اساتذہ و طلبا کا تبادلہ
(۸) ممالک اسلامیہ کی سیر و سیاحت اور وہاں کے حالات سے واقفیت کی رغبت پیدا کرنا۔
(۹) ممالک اسلامیہ کے مروجہ شہری و ملکی قوانین کی جگہ فقہ اسلامی کی ترویج کے لئے موثر جد و جہد کرنا۔
(۱۰) اسلامی امور و مسائل سے متعلق اہم ترین اور گراں قدر کتابوں کی تصنیف و تالیف و تدوین۔ اسلامی مقاصد کی نشر و اشاعت اور ایک ایسی جامع کتاب کی تدوین جو تمام ممالک اسلامیہ کے دینی حالات، وہاں کے مدارس ادارے علوم و فنون، اخبارات و رسائل و مجلات، اور علماء و مفکرین کے حالات پر حاوی ہو تاکہ زندگی کا کوئی شعبہ اور اس شعبہ کا کوئی گوشہ چھوٹنے نہ پائے، پھر اس کو ہر اسلامی ملک کی زبان میں طبع و شائع کروانا"

مگر اس کام میں علامہ کو بے حد تعب برداشت کرنا پڑا اور خود غرضیوں اور جاہ پسندیوں کا جو مظاہرہ ان کی نظروں نے دیکھا اس کی بنا پر وہ یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہو گئے کہ

"یوں محسوس ہوتا ہے کہ مسلمانوں سے اجتماعی کام کی صلاحیت جاتی رہی ہے، خود غرضی، نام و نمود اس درجہ بڑھ گیا ہے کہ کوئی اجتماعی کام مشکل ہے" (۲ فروری ۵۲ء)

چنانچہ اس تلخ تجربہ کے بعد پھر علامہ نے کوئی اجتماعی مہم نہیں اٹھائی اور بد نصیب پاکستان امن کی عالمگیر شخصیت اور بے پناہ صلاحیت سے محروم ہی رہا!!

جمعیت علمائے اسلام کی صدارت

عرض کر چکا ہوں کہ شیخ الاسلام کے بعد جمعیت کی صدارت پر اتفاق رائے نہ ہو سکا، مولانا ظفر احمد عثمانی عارضی صدر منتخب تو ہوئے تھے لیکن ان کی مستقل صدارت پر ارکان جمعیت راضی نہ تھے علامہ سے اس سلسلہ میں ایک گروہ نے درخواست کی، علامہ کا جواب خود ان ہی کے حقیقت پرور الفاظ میں سنئیے:

"پولیٹکس بڑی گندہ چیز ہے، میں نے کبھی اس خرقۂ مے آلود کو از خود نہیں پہنا، کبھی محمد علی نے پہنا دیا کبھی شوکت علی نے اور جب کبھی کسی نے پہنایا بھی تو میں نے فوراً اتار پھینکا ؎

حافظ ز خود نہ پوشید ایں خرقۂ مے آلود
اے شیخ پاک داماں معذور دار مارا"

بات اصل یہ ہے کہ علامہ اپنی افتادِ طبع، فطرتِ صالحہ اور مذاقِ اعلیٰ کے لحاظ سے خالص علمی اور محض فکری رہبری کے لئے موزوں تھے، آج کی مروجہ سیاست خواہ وہ "جمیعت علماء" ہی کی کیوں نہ ہو، ان کی طبعِ لطیف پر گراں تھی۔ چنانچہ ایک سیاست زدہ صاحب کو مخاطب کرکے ایک مرتبہ فرمایا :-

"ڈپلومسی (سیاست) کے معنی تو یہ ہیں کہ ہر ایک کو غیر دیانت دار سمجھ کر اس کے ساتھ سلوک کیا جائے اور پھر اگر اس کی دیانت ثابت ہو جائے تو اس کو دیانتدار مانا جائے، اور میرا مسلک یہ ہے کہ ہر ایک کو اچھا اور دیانت دار سمجھا جائے اور پھر اگر اس کی بددیانتی ثابت ہو جائے تو اس سے قطع تعلق کیا جائے۔"

ایک طرف مسلک کی یہ پاکیزگی، دوسری طرف ضعف توٰی کی وجہ سے اب علامہ پبلک پالیٹکس کے لئے قطعاً موزوں نہ رہے تھے ایک مرتبہ مزاحاً فرمایا : "مجھے چیمبر پریکٹس آتی ہے، پبلک پریکٹس نہیں آتی" —— اس سب کے باوجود لوگ جمیعت کی صدارت پر برابر زور دیتے رہے اور بعض قابلِ اعتماد ہستیوں نے بھی اس کو رفعِ انتشار کا واحد حل قرار دیا، اور تعاونِ عمل کا پورا وعدہ فرمایا، اس قدر اصرار کے بعد علامہ کے لئے بجز قبول کے کیا چارۂ کار تھا، صدارت قبول فرمائی، نائب صدر مولانا مفتی محمد شفیع صاحب اور ناظمِ اعلیٰ مولانا خطیب عبدالمتین ہوئے —— مولانا احتشام الحق جنھوں نے بھوپال جاکر علامہ کو خاص اسی منصب کیلئے آمادہ کیا تھا اور آپ کی ذات کو دفعِ انتشار کا تنہا ذریعہ سمجھتے تھے، فوراً کراچی سے سینکڑوں میل دور ملتان پہنچکر چند اپنے علماء کو جمع کرکے ایک نئی جمیعت، کا اعلان کیا، اور اس کے صدر مولانا احمد علی اور خود ناظمِ اعلیٰ ہوئے۔ مگر یہ جماعت کچھ چل نہ سکی اور علامہ رحمتہ اللہ علیہ آخر حیات تک جمیعت علمائے اسلام کے صدر رہے۔

اینٹی قادیانی تحریک

فروری ۱۹۵۲ء میں احراریوں کی کوشش سے ایک مخالفِ قادیانیت کنونشن کی بنا ڈالی گئی، علامہ بھی اس اجتماع میں مدعو کئے گئے، خود مولوی محمد علی احراری لینے کے لئے گھر آئے اور باوجود انکار کے بصد اصرار یہ کہہ کر لے گئے کہ صرف چند منٹ تشریف رکھکر چلے آئیں، باعثِ برکت ہوگا، علامہؒ بہ جبر تشریف لے گئے مگر پہنچنے کے بعد وہاں آپ کی صدارت کی تحریک پیش ہوئی اور باوجود انکارِ مسلسل کے آپ کو "بہ غلبۂ آرا" صدر کنونشن بنایا گیا —— اس فریب کے بعد علامہ نے پھر ان کے کسی اجلاس میں شرکت نہ فرمائی۔

فروری ۱۹۵۳ء میں اینٹی قادیانی تحریک کا راست اقدام شروع ہوا اور اس مذہبی روپ میں سیاسی جد و جہد کے جو مہیب نتائج برآمد ہوئے وہ عالم آشکار ہیں —— علامہ ان دنوں آل پاکستان ہسٹری کانفرنس کی صدارت کیلئے ڈھاکہ تشریف لے جارہے تھے، روانگی سے پہلے آپ نے اپنی جمیعت کے عاملہ کا اجلاس طلب کیا اور بکمالِ فراست یہ قرارداد منظور کروائی کہ راست اقدام سے جمیعت العلماء اسلام قطعاً الگ رہے گی، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

آل پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی

۱۹۵۱ء میں آل انڈیا ہسٹری کانگریس کی طرح پاکستان میں ایک "آل پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی" قائم ہوئی، علامہ بھی اس کے مایۂ ناز رکن بنائے گئے —— ۱۹۵۱ء ہی میں اس کا پہلا اجلاس کراچی میں منعقد ہوا جس کے شعبۂ تاریخ اسلام کی صدارت علامہ نے فرمائی —— اس کے بعد فروری ۱۹۵۲ء میں سوسائٹی کے جنرل سیشن کی صدارت کو اس مؤرخِ اعظم

نے زینت بخشی جو ڈھاکہ میں منعقد ہوا تھا اور خطبۂ صدارت میں بنگلہ زبان کے رسم الخط کی تبدیلی کا مطالبہ کیا تاکہ پاکستان کے مختلف صوبے باہم قریب تر ہو سکیں ـــــ اس تجویز کی گہرائی کو پاکستان دشمن عناصر پہنچ گئے اور ڈھاکہ یونیورسٹی کے طلبہ نے دو دن بعد ہندو قوتوں کا آلۂ کار بن کر علامہ کے خلاف نہایت ہی تہذیب شکن مظاہرہ کیا۔ آپ کی موٹر، جس میں آپ تنہا تشریف رکھتے تھے، گھیر لی اور اس وقت تک اس کو بڑھنے نہ دیا جب تک آپ سے اپنی تجویز واپس لینے کا اقرار نہ کروا لیا ـــــ نادان بنگالی مسلمان اب بھی دوسروں کے اشاروں سے کام کرتا ہے! دشمن اور دوست کی تمیز اب تک اس میں پیدا نہیں ہوئی !! غیر کے اُکسانے پر اپنے محسن کو اذیت پہنچا گیا !!! یہ مذہب دوست مشرقی بنگال کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ ہے۔ مگر بڑی اور مخلص ہستیوں کی ظاہرہ شکست سے بھی سو کامرانیاں پیدا ہوتی ہیں۔ بقول ریاضؔ مرحوم ؎ جہاں ساغر ٹپک دیں چشمۂ زمزم اُبلتا ہے! اس ہنگامہ سے علامہ کی تحریک کو توقع سے کہیں زیادہ شہرت و قوت حاصل ہوئی اور خود بنگال کے اہل فہم حضرات نے اس مخالفانہ مظاہرہ کی خوب مذمت کی اور شکر ہے کہ بعض گوشوں سے اس تحریک کو عملاً اچھالا یا بھی جا رہا ہے ـــ اب ریاضؔ کے شعر کا پہلا مصرعہ بھی پڑھ لیجئے ؎ بنائے کعبہ پڑتی ہے جہاں ہم خشتِ خوں رکھ دیں !!

اور مصروفیات

قیام پاکستان کے بعد دارالخلافہ کراچی میں ایک مرکزی یونیورسٹی کا قیام ضروری تھا، خدا خدا کر کے ۱۹۵۲ء میں یہ یونیورسٹی قائم ہوگئی اور علامہ فیڈرل یونیورسٹی سینٹ کے ممبر بنائے گئے۔

مرکزی یونیورسٹی کے علاوہ پنجاب یونیورسٹی کمیشن اور قائد اعظم کی یادگار میں قائم ہونے والے دارالعلوم کی مجلس مشاورتی کے بھی علامہ ایک رکن تھے اور ان کے اجلاس میں برابر شریک ہوتے رہے۔

مرکزی اسمبلی کے دیندار صدر جناب تمیز الدین خانصاحب نے ایک تبلیغی اسکیم "جمیعت الفلاح" کے نام سے تیار کی۔ علامہ نے اس کو ملاحظہ فرمایا اور تا زیست "جمیعت الفلاح" کی مشاورتی کمیٹیوں میں شریک رہے نیز اس جمیعت کے آرگن "صوت الاسلام" کے ادارتی بورڈ میں بھی آپ کا اسم گرامی داخل رہا۔

مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی تبلیغی جماعت سے علامہ کو خاص ہمدردی تھی، قیام کراچی کے بعد آپ گویا کراچی کی مرکزی تبلیغی جماعت کے سرپرست تھے، وقتاً فوقتاً اجتماع میں شرکت فرما کر ان کی مساعی کو سراہ کر ہمت افزائی فرماتے اور خامیوں پر محاسبہ کر کے راہِ صلاح دکھاتے تھے ـــــ تبلیغی کارکنوں کو بھی علامہ سے گہرا قلبی تعلق تھا

ادارۂ "موتمر عالمی اسلامی" کی رکنیت بھی علامہ نے قبول فرمائی تھی۔

روزانہ عصر سے بعد مغرب تک علامہ کی عام ملاقات کا وقت تھا، اسی وقت طالبان راہِ طریقت بھی حاضر ہو کر فیض صحبت سے مستفید ہوتے تھے ـــــ افسوس ؎ آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

تحریری کام خاطر خواہ کیوں نہ ہوسکا؟

اس کی مندرجہ ذیل خاص وجوہ تھیں:-

(۱) کراچی کا سہ سالہ قیام علامہ کے لئے ایک "مستقل" مجاہدۂ اضطراریہ تھا جس کا اندازہ اس مجمل گفتگو سے ہو چکا ہوگا، اس ذہنی خلفشار کے ساتھ کوئی ٹھوس علمی کام کیونکر ہو سکتا تھا ـــــ علامہ فرماتے تھے کہ میں جب لکھنے لگتا

ہوں تو جنون سے لکھتا ہوں، انتشار کے ساتھ مجھ سے کام نہیں ہوتا۔

(۲) تصنیف تو بڑی چیز ہے علامہ نے کبھی کوئی مضمون بھی سطحی یا سرسری طور پر نہیں لکھا ۔ کراچی آکر علامہ کو کوئی وسیع اور خاطر خواہ لائبریری نہ ملی جہاں بیٹھ کر کچھ کام کر سکتے، حالانکہ لکھنے پڑھنے کا جذبہ اس ضعف عمری میں بھی جوان ہی تھا۔ رحلت سے شاید ہفتہ بھر پہلے ایک صاحب سے فرمارہے تھے کہ "کراچی کے تین برس جس بیکاری میں گزرے ہیں میں نے اپنی عمر کا کوئی حصہ ایسا نہیں گزارا" پھر فرمایا کہ "کوئی اچھی لائبریری ہوتی، بیٹھ کر کام کرنے کا انتظام ہوتا تو "سیرۃ" کی دو ایک جلدیں اور ہو جاتیں!" ــــ یہ تمنا افسوس کہ حسرت ہی بن گئی اور ملت اسلامیہ علامۂ عصر کے رشحاتِ قلم سے محروم رہ گئی!

(۳) تصنیف تالیف سے جس شخص کو کوئی لگاؤ ہے وہ جانتا ہے کہ اس کام کے لئے تنہائی اور پُرسکون ماحول کس درجہ ضروری ہے ــــ کراچی میں علامہ کو جو "کوٹھی" ملی اس میں کل تین کمرے تھے، دو اہل وعیال کے استعمال میں تھے اور تیسرا کمرہ تھا جو علامہ کا ڈرائنگ روم بھی تھا اور بیڈ روم بھی اور اگر کوئی مہمان آجائے تو گسٹ روم (مہمان خانہ) بھی ــــ اب اس کو "اسٹڈی روم" (مطالعہ کا کمرہ) کیسے بنایا جاتا؟ اور کہاں بیٹھ کر کام کیا جاتا؟

(۴) علامہ کے قوائے جسمانی اب جواب دے چکے تھے، کراچی کی آب وہوا اور پاکستانی ماحول اس میں اور معاون ہو گیا تھا، اطباء اور ڈاکٹروں نے غور و فکر اور کثرتِ مطالعہ سے قطعاً منع کر دیا تھا، اور اس کو بقائے حیات کے لئے ناگزیر قرار دیا تھا۔

پاکستانی تحریریں

مذکورہ صورتِ حال کے باوجود علامہ نے مختلف علمی محفلوں کے خطبہ ہائے صدارت، دو تین "وفیات" کے مضامین اور بعض اپنی یا دوسروں کی کتابوں پر مقدمے اور دیباچے تحریر فرمائے ــــ چونکہ "بورڈ آف ایڈیٹرس آف فری ڈم مومنٹ" یعنی مجلس تاریخ تحریک آزادی کے بھی علامہ ایک رکن تھے اس لئے حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ سے متعلقہ مضمون آپ کے ذمہ کیا گیا، علامہ نے شاہ صاحب کی ساری تصنیفات جمع فرمالی تھیں اور اب قلم اٹھانے ہی والے تھے کہ دستِ اجل نے بڑھ کر روک دیا۔

علامہ یہ بھی چاہتے تھے کہ "منصبِ امامت" (مولانا اسمٰعیل شہیدؒ) کا سلیس اردو میں ترجمہ کر کے اس کے مضامین پر تاریخی حاشیوں کا اضافہ کیا جائے، تاکہ حکومت اسلامیہ کی جو تقسیم مولاناؒ نے فرمائی ہے وہ اچھی طرح ذہن نشین ہو سکے، اس غرض کے لئے علامہ نے ترجمہ کا ایک مسودہ راقم کے حوالہ کیا تھا (جو ندوۃ العلماء کے کسی استاد کا کیا ہوا ہے) تاکہ اس کی زبان کو سلیس و بامحاورہ کر کے اور جن حصوں کا ترجمہ رہ گیا ہے اس کی تکمیل کر کے خدمت والا میں پیش کردوں، لیکن "منصب امامت" کا اصل نسخہ باوجود تلاش کے نہ مل سکا اور یہ کام نہ احقر کر سکا اور نہ علامہؒ اس پر حاشیہ چڑھا سکے، کاش دارالمصنفین کے کوئی صاحب اس جانب توجہ فرمائیں ــــ یہ پاکستانی مسلمانوں کے لئے بڑی خدمت ہوگی!!

ان تین سالوں میں علامہ نے اپنی تصنیفات پر نظر ثانی بھی کی اور بعض کتابیں یہاں چھپوائیں بھی ــــ ایک مرتبہ خطبات مدراس، رحمت عالم، رسالہ "اہل سنۃ والجماعت" وغیرہ چھپ کر آئے تھے اور علامہ کے سامنے ان کے کچھ نسخے رکھے تھے، ان کو ملاحظہ فرماتے ہوئے راقم کی طرف مسکرا کر دیکھا اور یہ شعر موزوں کیا ؎

من قماش فروشِ دل صد پارہٗ خویشم — نختے برداز دل گزر دھر کہ زپیشم

علامہ نے دو تحریریں ناتمام چھوڑیں، ایک تو "جمع القرآن" کے عنوان سے مضمون تحریر فرما رہے تھے اور شاید نصف سے زیادہ ہو چکا تھا اور دوسرا مضمون مفتی کفایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات پر ارقام فرما رہے تھے جو ناتمام رہ گیا۔

مرض الموت اور رحلت

علامہ کو بیماریاں بڑی سخت سخت برداشت کرنی پڑی ہیں، بہت عرصہ پہلے گردوں کی تکلیف نے اس قدر ستایا تھا کہ اس سے جاں بری مشکل نظر آتی تھی، پھر ۱۹۴۶ء میں استسقائے قلبی (قلب کے پھیلاؤ) کا عارضہ اس قدر سخت پیش آیا کہ ہفتہ بھر تک بیٹھنا بھی ناممکن ہو گیا تھا فرماتے تھے کہ "ایک ہفتہ تک دیوار کے سہارے سے بس کھڑا ہی کھڑا رہتا تھا" مگر شافی مطلق ابھی اس ذریعۂ فیض کو باقی رکھنا چاہتا تھا، شفائے کلی عطا فرمادی —— کراچی آنے کے بعد اس بیماری نے پھر عود کیا، اوائل ۱۹۵۲ء میں لا کمیشن کے اجلاس میں شرکت کے لئے مری تشریف لے گئے تھے، سردی اور پہاڑی مقام دونوں ناموافق ثابت ہوئے، تنفس قلبی کا شدید دورہ جس کے ساتھ قلب بھی پھیل گیا تھا، لاحق ہوا، راولپنڈی کے فوجی ہسپتال میں تقریباً مہینہ بھر زیر علاج رہے اور پھر کراچی تشریف لے آئے، اس کے بعد سے صحت کا اتار چڑھاؤ چلتا ہی رہا۔ بس ایک "ہمت عالی" تھی جو اس ضعف میں بھی عزائم کو پست نہ ہونے دیتی تھی —— مقامی ڈاکٹروں اور اطباء کا علاج مسلسل جاری رہا اور حکیم نصیر الدین صاحب ندوی (نظامی دواخانہ) نے خصوصیت سے حق محبت و خدمت آخر وقت تک ادا کیا اور علامہ کے دل میں ان کے اس اخلاص کی بڑی قدر تھی،

اگست ۱۹۵۳ء میں اس بیماری نے ناتواں جسم پر پوری قوت سے حملہ کیا، قلب پھیل گیا تھا، بار بار تنفس کے شدید دورے پڑنے لگے، پوری نیند تو ایک عرصہ سے میسر نہ تھی، اس مرتبہ ڈاکٹر کرنل شاہ معالج خصوصی اور ڈاکٹر عبد الصمد جونپوری ان کے شریک علاج تھے، پوری توجہ سے علاج ہوا اور بہ ظاہر بہت جلد حالت سنبھل گئی، مگر کمزوری نے بستر چھوڑنے سے معذور کر رکھا تھا، خود ڈاکٹروں کی ہدایت بھی لیٹے ہی رہنے کی تھی —— خون معلوم ہوتا تھا کہ جسم میں باقی نہیں، آواز پست سے پست تر ہو گئی، ساری مقوی دوائیں اور غذائیں خون اور قوت میں کچھ بھی اضافہ نہ کر سکیں مگر اس سب کے باوجود آخر لمحۂ حیات تک مزاج کی شگفتگی قائم رہی —— نازک مزاج بہت تھے، رحلت سے دو تین روز قبل تنہائی تھی پہلے خود ہی ہنسے پھر راقم سے فرمایا یوں معلوم ہوتا ہے کہ زیب النساء نے یہ شعر میرے ہی لئے کہا تھا ؎

آہستہ برگ گل بفشاں بر مزار ما
بس نازک است شیشۂ دل در کنارہ ما

علامہ کو مایوسی یا پیش گوئی سے بڑی چڑ تھی مگر اس مرض کے دوران میں عین ایسی حالت میں جبکہ صحت ترقی پذیر تھی احقر سے دو ایک مرتبہ بہ اطمینان تمام مسکراتے ہوئے فرمایا کہ

"خدمت کا ثواب حاصل کر لیجئے، باقی ہوگا کچھ نہیں، اب اس بستر سے اٹھنا نہیں ہے"

دنیوی حیات کے آخری دن جناب عاصم صاحب سے بھی فرمایا:

"عاصم میاں تم کو اپنے والدین کی خدمت کا موقع نہ ملا تھا، اچھا ہوا کہ تم نے میری خدمت کر لی"

ان سارے اشاروں کے باوجود ہم ظاہر بینوں کو کبھی یہ وہم نہ ہوا کہ یہ شمع فروزاں آن کی آن میں یوں بجھ جائے گی۔

ہفتہ ۲۱ر نومبر کی رات کو تنفس کا ایک شدید دورہ پڑا مگر صبح ہوتے ہوتے حالت سنبھل گئی، سنا ہے کہ صبح ڈاکٹر نے انجکشن لگایا تو حضرت نے فرمایا:

"اب تو وقت قریب آچکا ہے قلب کچھ دیر اور کھینچ لے جائے گا"

اتوار ۲۲ر نومبر ۱۹۵۳ء (م ۱۵ ربیع الاول ۱۳۷۳ھ) کا پورا دن علامہ ہشاش بشاش رہے، صحت اچھی دیکھ کر اہلیہ محترمہ نے کچھ دیر کے لئے کہیں جانے کی اجازت چاہی، فرمایا:

"ضرور جائیے مگر جلد واپس آئیے، ایک گھنٹہ کا وقت ہے"

اس جملہ کے آخری ٹکڑے پر کسی کی توجہ نہ گئی، یہ باتیں تو اب یاد آآ کر کھٹکتی ہیں، ۵ بجے مستورات چلی گئیں، گھر میں صرف میاں سلمان اور عاصم صاحب تھے —— ۵ بج کر ۳۰ منٹ ہوگئے، مغرب کا وقت آگیا، حضرت اٹھ بیٹھے مگر اشاروں سے نماز ادا کی اور مسکراتے ہوئے صاحبزادے سے فرمایا "آج ہم نے شوکت علی مرحوم کی سی نماز پڑھی ہے"۔ صاحبزادے نے یہ بات نہ سمجھی تو فرمایا "وہ بھی اسی طرح بیٹھ کر اشارے سے نماز پڑھتے تھے"۔ بس یہ نطق سلیمانی کے آخری کلمات تھے، اس کے بعد داہنی کروٹ قبلہ رخ دائیں ہاتھ کو گال کے نیچے دبائے عین مطابق سنت لیٹ گئے اور آنکھیں بند فرمالیں کچھ دیر بعد ہلکی سی تشنجی کیفیت محسوس ہوئی، راقم اور عاصم صاحب کمرہ سے باہر کھڑے باتیں کر رہے تھے میاں سلمان کے بلانے پر میں فوراً اندر گیا، نبض دیکھی چہرہ دیکھا کوئی خاص بات نہ تھی، عرض کیا احتیاطاً ڈاکٹر کو بلوا لیجئے، عاصم صاحب ڈاکٹر کیلئے دوڑے، میاں سلمان ٹیلیفون میں مشغول ہوگئے، راقم کی انگلیاں برابر نبض پر اور نظر چہرۂ مبارک پر تھی، کچھ ہی دیر بعد تنفس میں ایک ہلکا سا جھٹکا لگا اور طائر روح، قفس عنصری سے پرواز کر چکا تھا، اس وقت ساڑھے چھ بجے ہوں گے۔ اللہ اللہ! اپنے محبوب بندہ کی نزاکت طبع کا رب رحیم نے کس قدر لحاظ فرمایا، بس یوں محسوس ہوتا تھا کہ ایک قدم جو اس عالم فانی سے اٹھایا تو ابدی دنیا میں پہنچ گئے، ذرا بھی تو تکلیف نہ ہوئی! رحمۃ اللہ علیہ ——

رحلت کی خبر ریڈیو سے نشر ہوئی اور کچھ دیر میں کافی لوگ جمع ہوگئے، سب کے اصرار پر یہ طے پایا کہ جنازہ صبح اٹھایا جائے، تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ شرکت کی سعادت پاسکیں —— رات آنکھوں میں گزر گئی، صبح نماز فجر کے ساتھ راقم نے علامہ کے ایک مخلص و خادم صوفی محمد ادریس کی مدد سے، ڈاکٹر عبدالحی صاحب کی نگرانی میں اپنے آقا و مولیٰ کو غسل دیا اور ساڑھے نو بجے ہزاروں افسردہ دلوں نے "ڈار منزل" سے جنازہ کو اپنے کندھوں پر اٹھا کر جامع مسجد نیوٹاؤن کے وسیع صحن میں پہنچایا، احقر کی تحریک اور علامہ رحمۃ اللہ علیہ کے پس ماندگان کی تائید سے ڈاکٹر عبدالحی صاحب (خلیفہ مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ) نے جن کو علامہ سے خاص عقیدت و محبت تھی اور جن کے ساتھ علامہ کو بھی نہایت درجہ محبت و بے تکلفی کا تعلق تھا، نماز جنازہ پڑھائی اور ایک عظیم الشان مجمع نے جس میں عوام کے علاوہ علمائے کرام ممالک اسلامیہ کے سفرائے عظام اور دیگر عمائدین شہر شامل تھے شرکت کی سعادت پائی —— نماز کے بعد لوگوں کے شوق زیارت کی بنا پر چہرۂ مبارک کو بے نقاب کیا گیا، سبحان اللہ انوار کی ایک بارش برس رہی تھی، ۱۶ گھنٹے گزرنے کے باوجود یوں معلوم ہوتا تھا کہ ابھی آنکھ لگی ہے، بیمار نہیں صحت مند ہیں، کوئی تکلیف نہیں بلکہ ہر طرح راحت سے سو گئے ہیں، جبھی تو ہونٹوں پر تبسم جھلک رہا ہے! —— جو کوئی دیکھتا تھا اس کا دل علامہ کی رحلت کو جھٹلاتا تھا —— سچ بھی ہے اہل اللہ کی

موت، موت ہی کیا ہے، صرف ایک نقل مکانی! اسفل سے اعلی کی طرف پرواز!! ارنج ومحن سے چھوٹ کر زمرۂ "لایحزنون" میں شرکت!! — کوئی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ اس زیارت میں صرف ہوا، پھر یہاں سے جنازہ عامل کالونی کی اس زمین پر پہنچا جہاں علامہ کے داعی مولانا عثمانیؒ پہلے ہی سے آرام فرما تھے، یہاں پہنچکر شامی سفارت خانہ کے مشیر علمی (لٹریری اٹیچی) جناب ابوالخیر عرقسوسی نے ایک نہایت جامع، فصیح وبلیغ اور دردانگیز تقریر فرمائی اور علامہ کو خراج تحسین ادا کیا، مجمع کے بادقار لوگوں تک سے چیخیں نکل گئیں، اس تقریر کے بعد مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے بھی درد بھرے لہجہ میں حضرت ابوھریرہؓ کا وہ شعر پڑھا جو انھوں نے حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عطا کردہ توشہ دان کے کھو جانے پر کہا تھا ۔ للناس هم ولی الیوم همان ٭ فقد الجراب وقتل الشیخ عثمان - اور فرمایا کہ ابھی مولانا عثمانیؒ کی جدائی کا غم ہلکا نہ ہوا تھا کہ "رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ نشانی" (یعنی علامہ) بھی ہم سے کھوگئی — اس کے بعد شیخ الاسلامؒ کی مزار کے قریب اس مخزن علم وعرفان کے جسم خاکی کو پیوند خاک کر دیا گیا — نور اللہ مرقدہٗ

علامہ کی تمنائیں

سیدی ومولائی علامہ سید سلیمان ندوی قدس سرہٗ کی دو تمنائیں اپنی ذات اور کام سے متعلق تھیں اور دو ملت اسلامیہ پاکستان سے متعلق :-

اپنے متعلق :-

(۱) علامہ کی آرزو تھی کہ ارض پاک مکہ ومدینہ ان کی دائمی خواب گاہ بن جاتی، اور اس کے لئے عزم صمیم رکھتے تھے، راقم سے کئی مرتبہ فرمایا کہ ان دو لڑکیوں کی ذمہ داری سے فارغ ہو جاؤں تو میرا اور اہلیہ کا عزم ہے کہ ہمیشہ کے لئے حرمین شریفین کا قیام اختیار کرلیں آگے اللہ کی جیسی مرضی ہو -

(۲) یہ بھی فرماتے تھے کہ جی چاہتا ہے کہ اپنے سارے مضامین کی، جو منتشر ہیں، فن داری تقسیم کرکے ان کو شائع کیا جائے -

ملت کے متعلق :-

(۳) نظام تعلیم میں ایسی تبدیلی کی جائے کہ ہر شخص ضروریات دین سے واقف ہوتے ہوئے دینوی علوم میں کمال پیدا کر سکے -

(۴) دار المصنفین کی طرح ایک ادارہ قائم کیا جائے تاکہ ملت اسلامیہ میں دین کا صحیح مذاق عام ہو -

پہلی تمنا تو ان کی ذات سے متعلق تھی، کیا عجب ہے کہ حکیم مطلق نے عالم ناسوت میں نہ سہی عالم برزخ میں اس کو پورا فرمایا ہو، باقی تین تمنائیں ان کے شاگردوں، معتقدوں، دوستوں، اور ملت کے ہواخواہوں کو دعوت تکمیل دے رہی ہیں — جو بھی ان تمناؤں کو پورا کرسکے گا وہ علامہؒ کا محسن اور ملت اسلامیہ کا سچا خادم ہوگا، - واللہ الموفق!

بقیہ ایک مکتوب از صفحہ ۱۳۶

میں صالح اور فاسق قیادت کو کتنا بڑا دخل ہوتا ہے، ایک معاشرہ کو اگر صالح قیادت نصیب ہو جاتی ہے تو وہ کس طرح امن وخوشحالی، دیانت وامانت، عدل وقسط اور شرافت وکرامت کا پیکر بن جاتا ہے اور جو معاشرہ خدا ناترس قیادت کا شکار ہوتا ہے، وہ کس طرح ذلت ورسوائی اور بالآخر ہلاکت وبربادی سے ہمکنار ہو جاتا ہے!

والسلام

از سید ابوعاصم

علالت سے وفات تک

علامہ سید سلیمان ندوی

دمِ سرد ہے آہ پر آہ ہے
تسلسل حوادث کا جانکاہ ہے

میری زندگی کا سب سے پہلا بڑا حادثہ میرے والد کی موت تھی۔ ۱۹۴۱ء میں علی گڑھ میں ایم اے اور قانون کے آخری سال میں پڑھتا تھا کہ پہلی اکتوبر کو ان کی معمولی علالت کی خبر نے مجھے بے چین کر دیا اور افتاں و خیزاں تیسری تاریخ کو وطن پہنچا۔ آہ جب گھر پہنچا تو ہر طرف سے آہ و بکا سے میرا خیر مقدم ہوا۔ ماں کی مغموم صورت دیکھ کر کلیجہ پھٹ گیا۔ میری والدہ صبر و ضبط کی مجسمہ بنی ہوئی تھیں۔ معلوم ہوا کہ دوسری اکتوبر کو ساڑھے سات بجے صبح یک بیک رفیقِ حقیقی سے جا ملے۔ اللہ ان پر اپنی رحمتوں کے پھول برسائے۔ انہیں میرا بڑا انتظار تھا۔ لوگ کہتے کہ آپ نے تو منع فرمایا ہے وہ فرماتے "وہ نہیں رُکے گا ضرور آئے گا۔" صبح کو گاڑی آتی تھی۔ ہر روز آدمی کو اسٹیشن بھیجتے۔ حسبِ معمول اس دن بھی آدمی گیا۔ جب وہ لوٹ کر واپس آیا تو انہوں نے پوچھا "عاصم آئے؟" معلوم ہوا "نہیں" کہنے لگے "آج بھی نہیں آئے"۔ تھوڑی دیر بعد وہ سو گئے۔ والدہ نے آہستہ سے کہا "اس قدر جلد سو گئے" لیکن آہ! وہ تو ابدی نیند سو چکے تھے۔

میرے پہنچنے کے دوسرے یا تیسرے دن عم محترم علامہ سید سلیمان ندوی کا مجھے خط ملا۔ مجھے اور میرے چھوٹے بھائی سید ابوخالد دونوں سے خطاب تھا۔

دار المصنفین اعظم گڈھ — عزیزان من دعا

اعظم گڈھ

السلام علیکم و رحمۃ اللہ، کل رشید چچا کا اور رات کو سیل کا تار ملا۔ تار کیا تھا جان حزیں پر بجلی گری۔ تمہارا باپ اور میرا بھائی اس دنیا سے چل بسا! وہ بھائی جس نے ہمیشہ مجھ کو اپنا عزیز ترین بھائی سمجھا اور جس نے آخر وقت مجھ سے سب سے بڑھ کر محبت کی، جس کو میری ہر ادا پیاری اور ہر ترقی پیغامِ خوشی معلوم ہوتی تھی، اس کی قوت سے میں اس دنیا میں قوی دل تھا۔ وہ میرا راز داں، میرا مشیر، میرا جزو کل تھا، افسوس کہ میں اس دنیا میں اکیلا رہ گیا۔

عزیز و تمہاری یتیمی کا داغ کس سے دیکھا جائے گا۔ آؤ آج سے ہم تم ایک نیا رشتہ باندھیں، تم میرے لئے وہی ہو جو تھے، وہ ماں سے محروم تم باپ سے، تینوں میرے لختِ جگر،

جانتا ہوں کہ دنیا یوں ہی رہی ہے اور یوں ہی رہے گی آج وہ کل ہماری باری ہے اس لئے مجھے بھی مسافر ہی سمجھو۔ خدا تم تینوں بھائیوں کو پھلنا پھولنا نصیب کرے۔

اپنی غم نصیب ماں کو میرا اسلام کہو، وہ بڑی صابرہ و شاکرہ ہیں یہ صبر و شکر ان کی زندگی کے اس سب سے بڑے مرحلے میں بھی ان کی مدد کریگا۔

یہ شعر میرے والد مرحوم کی یاد میں چچا جان نے کہا تھا۔

غم زدہ شاہدہ کو دُعا:

عزیزہ۔ تم بھی خدا کہ بھروسہ پر صبر و شکر کی قوت و ہمت دکھاؤ کہ تمہاری ماں کی تسلی اور کم سن بہن کی تشفی کا باعث بن سکو۔

آہ! میں کیا لکھوں ۹ اور ۱۰ رمضان کی دونوں راتوں کو جب میں نے اُن کی صحت جلد و کاملہ کی بارگاہِ الٰہی میں دُعا مانگی تو دونوں دن اُن کے جنازہ کی شکل ہمیشہ ہمارے سامنے آجاتی تھی۔ میں اس خیال کو بزور دفع کرتا تھا اور دُعا مانگتا تھا اور پھر وہی نقشہ سامنے آجاتا تھا۔ اللہ تعالےٰ میرے بھائی کو مغفرت سے نوازے اور بخشش سے سرفراز کرے۔

کل صبح سے میرے گھر میں ایسی اُداسی چھائی تھی کہ لڑکیاں تک اور سلیمان کی ماں تک کہتی تھیں کہ ایسا کیوں معلوم ہوتا ہے۔ بالآخر ایک بجے دن کو تار آیا اور حقیقت کا پردہ چاک ہوا۔ سب دردمند اور سب کی آنکھیں اشکبار ہیں:

عزیزو! خدا پر اعتماد رکھو۔ وہی سب کا سہارا ہے۔ اُسی سے مدد چاہو۔ انسان فانی اُس کی ہر چیز فانی، کُلُّ مَنْ عَلَیْہَا فَانٍ

۱۴ رمضان کو تراویح ختم کر کے ۱۵ رمضان کو دلسنہ کا قصد ہے ۱۶ کو شاید پہنچوں۔

عزیز و دُعا، دردمند و شریک غم
سید سلیمان

۱۲ رمضان سنہ ۱۳۶۰ھ

چنانچہ جب وہ تشریف لائے، تو مجھے کلیجہ سے لگالیا۔ اس دن سے میں نے ان کو اپنا چچا نہیں باپ سمجھا۔ ان کی خوشنودی و رضا میری زندگی کا مقصد بن گیا۔

یوں تو میں ان کے زیر تربیت اس سے پہلے اعظم گڈھ میں معارف میں کام کر چکا تھا لیکن ۱۲ اگست سنہ ۱۹۴۲ء سے میں انسے اور زیادہ قریب ہو گیا اسی سال میں نے پٹنہ میں وکالت شروع کی اور اعظم گڈھ آتا جاتا رہتا تھا میں جب بھی اعظم گڈھ جاتا تو مجھے ایسا معلوم ہوتا کہ یہاں کی شاعرانہ اور پُرسکون زندگی میں بھی ان کے قلب پر نشتر لگتا رہتا ہے۔ لیکن ان کے لبوں پر تبسم کے سوا کچھ نہ ہوتا۔ اس قدر قریب رہنے کی وجہ سے — میں نے دیکھ لیا کہ بعض حقیر اور بے مایہ انسان جب کبھی کسی فرشتہ صفت انسان کے احسان و کرم کا خوگر ہو جاتا ہے تو کس طرح اپنے محسن کے درپے آزار ہوتا ہے۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میری آنکھوں نے وہ دیکھا جس کا دُنیا کو یقین نہیں آسکتا۔ یعنی ان ہی کے احسان و کرم کے پروردہ ان کے طمانیت قلب کے دُشمن بن گئے تھے۔ لیکن اس شرافت علم بردباری کے پُتلے کا یہ عالم تھا کہ جہاں کسی نے اشارتاً بھی شکایت کی اسی کو ڈانٹ دیا۔

سنہ ۱۹۴۳ء میں مجھے اطلاع ملی کہ چچا جان کی طبیعت ناساز ہے۔ سیدھا اعظم گڈھ پہنچا۔ بیچ کا کمرہ حسب قاعدہ فرش و قالین سے مزین ہے مسہری پر چچا جان لیٹے ہیں۔ سب عزیز و اقارب پہنچ چکے تھے۔ مجھے دیکھا مسکرا کر فرمایا۔

کرتا ہوں جمع پھر جگر لخت لخت کو

علالت کی نوعیت یہ معلوم ہوئی کہ سینہ میں شدید درد اٹھا جس نے کئی رات مسلسل سونے نہیں دیا۔ ڈاکٹر حفیظ صاحب کا علاج تھا۔ ان کی تجویز تھی کہ قلبی حرج ہے۔ فوراً بمبئی جا کر علاج ہو۔ ڈاکٹر حفیظ صاحب ہی کے علاج سے جب افاقہ ہو گیا تو مزید جانچ نہ ہو سکی۔

اسی سال جاڑوں میں راقم کے یہاں کبھی کبھی تشریف لاتے۔ رات گلے وقت تھا کہ یک بیک تنفس کی تکلیف شروع ہوئی۔ مگر مالش وغیرہ سے فوراً ہی یہ تکلیف جاتی رہی۔ اس کے بعد یہ شکایت کبھی کبھی ہو جاتی تھی۔ اور معمولی ہومیوپیتھی دواؤں سے چلی جاتی تھی۔ اس وقت اس کی تشخیص نہ ہو سکی کہ اس کی نوعیت کیا ہے۔

ہمیشہ یہی خیال رہا کہ حلق کی خرابی ہے اور سانس کی نالی میں بلغم پھنس جاتا ہے جس سے یہ تکلیف ہو جاتی ہے۔

۱۹۴۶ء میں ایک ایسا ناخوشگوار واقعہ پیش آیا جس نے ان کے قلب و جگر پر بہت ہی بُرا اثر ڈالا۔ اور ان کا دل ٹوٹ گیا۔ مجھے وہ دن یاد ہے کیا ہوا تھا۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہو سکا۔ اس لئے کہ ان کے معمولات میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ہاں اتنا بتا سکتا ہوں کہ وہ کمرے میں ٹہلتے تھے اور کپڑوں کی الماری کے پاس کھڑے ہو کر ایک ایک کپڑا نکالتے جاتے تھے اور والدہ سے صرف اتنا کہتے تھے کہ سامان درست کیجئے اب میں یہاں نہیں رہ سکتا۔ گھر کا ہر فرد سکتہ کے عالم میں تھا کسی کو پوچھنے کی جرأت بھی نہیں تھی۔ خاموشی سے ان کے حکم کی تعمیل ہو رہی تھی۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں بھوپال اور حیدرآباد سے بُلانے کی گفتگو جاری تھی۔ حیدرآباد میں گرچہ تنخواہ زیادہ تھی لیکن بھوپال سے ایک تو شعیب قریشی صاحب مدظلہٗ کا اصرار تھا دوسری طرف بقول شعیب صاحب "قاضی ریاست کا عہدہ تو ان کو اپنی طرف متوجہ نہ کر سکا لیکن تعلیم عربی کی اصلاح کی خدمت کے موقع کو وہ انکار نہ کر سکے"۔ وہ بھوپال میں قاضی القضاۃ اور امیر جامعہ احمدیہ کی حیثیت بُلائے گئے تھے۔ اور بالآخر جولائی ۱۹۴۶ء میں وہ بھوپال تشریف لے گئے اور ۱۹۴۹ء اکتوبر تک مسلسل ان کا قیام وہاں رہا اور صحت اچھی رہی۔ کچھ لوگوں کو ان کے دارالمصنفین چھوڑنے پر اعتراض تھا۔ ان کی مظلومیت کی یہ انتہا ہے کہ۔ خود مظلوم مورد الزام بنایا جا رہا ہے اس کے باوجود اس نے اپنی زندگی میں کبھی بھی ظالم کو بُرا کہنا تو بڑی بات ہے اس کا نام بھی اپنی زبان پر آنے نہیں دیا۔ یہ تو بڑی ہی المناک داستان ہے ؎

کبھی فرصت سے سُن لینا بڑی ہے داستاں میری

یوں تو وہ دو مرتبہ حرمین شریفین کی زیارت کر چکے تھے۔ لیکن ان کے دل میں یہ بات کھٹکتی تھی کہ وہ دونوں سفر سیاسی تھے۔ اس سے پہلے ۱۹۲۴ء اور پھر ۱۹۲۶ء میں وفد حجاز میں ہندی مسلمانوں کے نمائندہ بن کر تشریف لے گئے تھے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ وہ بھی رضائے الٰہی کے لئے نہ تھے لیکن اللہ کے محبوب اور رسول کے عاشق نے ان کے دربار میں صرف انہیں کا نام لے کر حاضری مناسب سمجھی۔ چنانچہ ۱۹۴۹ء اکتوبر میں حج بیت اللہ تشریف لے گئے۔

واپسی شاید دسمبر میں ہوئی۔ راستہ ہی میں طبیعت خراب ہو گئی۔ بمبئی میں یوں تو بہت سے لوگ اپنا مہمان بنانے کے متمنی تھے لیکن بمبئی کے مشہور مخیر تاجر بھائی عزیز صاحب کی بے پناہ محبت سب پر غالب آئی۔ کسی کو سوچنے کا موقع دیئے بغیر وہ ان کو کرسی پر بٹھا کر اٹھا لائے اور اپنی گاڑی میں بیٹھایا اپنے گھر لے آئے۔ جس خلوص محبت اور تن دہی سے انہوں نے تیمارداری کی ہے حق یہ ہے کہ انہوں نے بہت سے قریبی عزیزوں کو بھی شرمندہ کر دیا۔ وہاں ڈاکٹروں کی تشخیص یہ ہوئی کہ دوسری شکایتوں کیساتھ دل بھی بڑھ گیا ہے۔ لیکن انہوں نے اس کو کوئی اہمیت نہیں دی بلکہ یہی کہا کہ اس عمر میں عموماً دل بڑھ جایا کرتا ہے۔

اسی زمانہ میں پاکستان آنے کی خبر گرم ہو چکی تھی۔ ہندوستان کے متعدد اخبار لکھ رہے تھے کہ وہ ہجرت کرنے والے ہیں حالانکہ حقیقت اس وقت صرف اس قدر تھی کہ یہاں سے دعوت ضرور دی گئی تھی مگر انہوں نے اب تک قبول نہیں فرمایا تھا بلکہ پیش کش کی مزید تشریح چاہی تھی۔ وہ بستر پر بیمار تھے۔ لوگ چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے۔ اتنے میں ایک اخبار کے نامہ نگار صاحب تشریف لائے۔ اور انہوں نے سوال کیا "کیا آپ پاکستان تشریف لے جا رہے ہیں؟" اس کے جواب میں انہوں نے صرف یہ شعر پڑھا ؎

رہی نہ طاقت گفتار اور اگر ہو بھی
تو کس امید پہ کہیئے کہ آرزو کیا ہے

نامہ نگار صاحب تو اسی شعر کا مزہ لیتے ہوئے رخصت ہو گئے۔ جب صحت ہو گئی تو وہ بھوپال تشریف لے گئے۔ وہاں سے سبکدوش ہو کر لکھنؤ اعظم گڑھ اور رکابنور میں چند مہینے قیام رہا۔

میں ۱۹۴۸ء کے اوائل ہی میں کراچی آ گیا تھا۔ ان کے یہاں آنے سے پہلے ایک مرتبہ انکے پاس بھوپال والدہ کے انتقال کے وطن اور بھی گیا۔ ان

پاکستان کا مشتاق اور دعاگو پایا۔ مگر ان کے متعلق مجھے یقین نہیں تھا۔ ۱۳ جون ۱۹۵۰ء کی صبح کو میں نے اخبار میں یک بیک یہ خبر پڑھی کہ چچا جان لاہور تشریف لے آئے ہیں اور ۱۴ جون کو کراچی تشریف لانے والے ہیں۔ ہم لوگ کینٹ اسٹیشن گئے۔ اور ان کو ڈار منزل لائے۔ ڈار منزل خواجہ شہاب الدین جوان دنوں وزیر داخلہ تھے ان کی عنایت خاص کی وجہ سے مجھے پہلے ہی مل چکا تھا۔ وہ ایک خاص ولولہ کیساتھ تشریف لائے تھے۔ ان کی گفتگو میں کتنی امید اور کتنی آرزو جھلکتی تھی۔

ڈار منزل جہانگیر روڈ کی ایک شاخ چمن اسٹریٹ پر واقع ہے۔ یہ ایک پچھم رخ کا مکان ہے۔ پھاٹک سے داخل ہوتے ہی سامنے پندرہ فٹ بے آب وگیاہ میدان ہے۔ اس کے بعد پندرہ فٹ کی پختہ صحن ہے۔ اسی سے ملحق تین کمرے سڑک کے رخ پر ایک سلسلے سے ہیں۔ پھاٹک کے سامنے کا کمرہ ملاقات کے لئے مقرر رہوا۔ اس کے بعد بیچ کا کمرہ ان کی خوابگاہ کا بنا۔ اور آخری کمرہ میں میرا قیام تھا۔ یہیں کلیٹن کوارٹرز کے پاس ایک مسجد تھی۔ لوگوں نے اس کا نام جامع مسجد سلیمانیہ رکھنا چاہا۔ انہوں نے اس کو ناپسند کیا لیکن لوگ نہ مانے آخر وہ اسی نام سے مشہور ہو گئی۔ وہاں روز صبح بعد نماز درس قرآن کا سلسلہ شروع ہوا تو اس مرتبہ میں نے ایک بات یہ دیکھی کہ تنفس کا دورہ عموماً رات کو کبھی کبھی پڑ جاتا تھا۔ ہومیوپیتھی دوا سے فوراً سکون بھی ہو جاتا تھا۔ یہ تکلیف کھانے کے بعد تقریر کرنے یا کوئی حرکت کرنے سے ہو جاتی تھی۔ اس سے ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ یہ تکلیف ریاح اور سوءِ ہضم کا فساد ہے۔ اسی لئے ساری توجہ ریاح اور اصلاح معدہ کی طرف رہی۔

ندوہ نے کیا کیا؟ کچھ نہیں کیا۔
ایک سلیمان کو پیدا کیا تو یہی کافی ہے

خطبۂ شبلی اجلاس ندوۃ العلماء ۱۹۱۲ء

ایک مرتبہ مسجد سلیمانیہ میں درس فرما رہے تھے۔ اسی دوران میں ان کی آواز مدھم ہوتی گئی اور انہوں نے گردن جھکا لی۔ فوراً لوگوں نے پکڑ لیا اور اٹھا کر گاڑی پر گھر لائے اور ڈاکٹر میجر حسن کو ٹیلیفون کیا۔ میجر حسن فوراً تشریف لائے۔ لوگوں کو خیال ہوا کہ فالج کا حملہ تھا۔ میجر حسن صاحب نے معائنہ فرمایا۔ سب سے پہلے خون کا دباؤ دیکھا وہ بجائے زیادہ ہونے کے معمول سے بھی کم تھا جس سے اس خیال کی تردید ہوئی۔ تلووں میں تھوڑی سی بے حسی ضرور تھی۔ چچا جان کو شدت سے انکار تھا کہ ان پر کسی قسم کا حملہ تھا۔ وہ کہتے تھے رات کو نیند نہیں آئی تھی اسی لئے آنکھ لگ گئی تھی۔ بہر حال احتیاطی طور پر میجر صاحب نے انجکشن دینے شروع کئے۔ انہوں نے بڑی محبت خلوص اور شرافت کا ثبوت دیا۔ جب میں نے فیس پیش کی اور اصرار کیا تو انہوں نے سختی سے انکار کیا اور فرمایا کہ "مجھے کمانے کے مواقع تو بہت ملیں گے لیکن آپ مجھے اس سعادت اور مسرت سے کیوں محروم کرتے ہیں"۔ حقیقت یہی ہے کہ ان کے دل کی آواز تھی اس میں ذرا بھی رسمی تکلف نہ تھا۔ وہ باوجود بے انتہا مشغول ہونے کے خود تشریف لاتے۔ اور انجکشن دیتے۔ ان کے علاج اور توجہ سے وہ کچھ صحت مند ہو گئے۔ یہ غالباً جنوری ۱۹۵۲ء کی بات ہے۔

۱۹۵۲ء کی گرمیوں میں بنیادی کمیٹی کا اجلاس نتھیا گلی میں طے پایا چچا جان بھی تشریف لے گئے آٹھ ہزار فٹ کی بلندی ان کے قلب و
اعصاب کے لئے ناقابل برداشت ہوگئی اور ان پر تنفس کا شدید دورہ پڑا۔ فوراً ڈاکٹر آئے اور انہوں نے دیکھا اور کہا کہ خون کا دباؤ بہت بڑھا
ہوا ہے۔ خان عبد القیوم خان اور میاں ممتاز دولتانہ نے اپنے خصوصی اثر سے فوجی اسپتال راولپنڈی پہنچایا۔ وہاں کرنل سرور نے معائنہ کیا۔ دل
کافی بڑھ چکا تھا اور سب سے پہلی بار یہ تشخیص ہوئی کہ یہ تنفس کی تکلیف بھی قلب ہی کی وجہ سے ہے وہاں سے لاہور تشریف لائے۔ لاہور کے ایک
تجربہ کار ڈاکٹر صاحب نے بھی وہی تشخیص کیا۔ اور نسخہ تجویز کیا نمک کا سخت پرہیز بتایا۔ اس کے بعد کراچی تشریف لے آئے یہاں ڈاکٹر رحمان
کی طرف رجوع کیا۔ انہوں نے بھی اسی علاج سے اتفاق کیا اور یہ علاج ہوتا رہا اور تنفس جاتا رہا، اور بہت دنوں تک کوئی شکایت نہیں رہی۔
ہاں حکیم نصیر الدین صاحب ندوی نے جو ان کے شاگرد بھی اور شیدائی بھی معالج خاص بھی اور محرم درد دل بھی ہیں ان کی طاقت کی دوائیں ہمیشہ
جاری رکھیں۔

فروری ۱۹۵۳ء میں ڈھاکہ میں مجلس تاریخ کی کانفرنس تھی۔ اس کے صدر منتخب ہوئے۔ ڈاکٹروں کا مشورہ تھا کہ اتنا طویل سفر نہ فرمائیں
لیکن نہ مانے اور بذریعہ طیارہ تشریف لے گئے۔ ڈھاکہ کے خطبہ صدارت میں ایک تاریخی صداقت کے اظہار کے بعد وہاں کے طلبا نے
جو شرمناک سلوک ان کے ساتھ کیا وہ سب کو معلوم ہے۔ ایک نیم جاں قلب کے مریض، ضعیف، کے ساتھ ایسا سلوک انسانیت سے گری
ہوئی بات تھی۔

جلسہ کے بعد میں راحت رضوی صاحب کے یہاں چند دن قیام رہا اور وہاں سے کلکتہ تک ہوائی جہاز اور بذریعہ ریل لکھنؤ ہوتے
ہوئے دہلی پہنچے۔ کہتے تھے کہ راہ میں بختیار پور جنکشن (جہاں سے ہمارے وطن کی ریل مڑتی ہے) پر ریل ٹھہری۔ بہت دیر تک حسرت بھری نگاہ
ڈالتا رہا پٹنہ جنکشن پر مقامی ندوی حضرات تشریف لے آتے تھے۔ کچھ دن لکھنؤ میں قیام رہا اعظم گڑھ سے شاہ معین الدین صاحب سید صباح الدین صاحب بھی
ملنے آئے۔ ان دونوں حضرات کو ان کی ذات سے بڑی والہانہ محبت اس غیر متوقع ملاقات کا ذکر مزہ لے لے کر اپنے خطوط میں مہینوں کرتے رہے اور
پھر نہ ہونے کا گلہ کرتے رہے۔ ان حضرات کو کیا معلوم تھا کہ یہ ملاقات ان کے لئے آخری ثابت ہوگی اور بوئے گل سیر بدیدیم بہار آخر شد کا مصرعہ ان پر صادق آئے گا۔

اپریل ۱۹۵۳ء میں کراچی واپس تشریف لائے کچھ ہی دنوں کے بعد تنفس کا پھر دورہ پڑا۔ وہی انجکشن دیا گیا جس سے سکون ہو گیا
اس کے بعد سیاسی ہنگاموں کا طوفان اٹھا۔ بنیادی کمیٹی کا جلسہ علماء کرام کا اجتماع کیا کچھ نہ ہوا منتیں کیں خوشامدیں کیں رو بیٹھ گیا کہ ان
ہنگاموں سے آپ علیحدہ رہیں ؎

یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں
واں ایک خاموشی تیری سب کے جواب میں

ایک دن تو مجھ سے چڑھ گئے۔ وہ دن تھا اور آخری دن میں نے زبان بند کرلی۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میرے انداز کو دیکھ کر وہ سمجھ
گئے۔ اکثر چھیڑا کرتے تاکہ میں کچھ بولوں لیکن میں نے عہد کر لیا کہ میں ہرگز ان کی گرانی طبع کا باعث نہ بنونگا۔ اس لئے صرف تعمیل حکم میں
نے اپنا دستور بنا لیا۔ کوئی آتا میں اطلاع کر دیتا۔ لوگ آتے اور گھنٹوں بیٹھ جاتے اور ہر قسم کے موضوع پر لمبی لمبی بحثیں ہوتیں سنا کرتا۔
اکثر آنکھیں رو دیتیں۔ چہرہ متغیر ہو جاتا۔ پیشانی پر شکن پڑ جاتی لیکن زبان بہرحال بند رہتی۔

اگست ۱۹۵۳ء کی کوئی تاریخ تھی کہ زکامی کیفیت محسوس ہوئی اور کچھ تنفس کی ہلکی سی تکلیف بھی۔ پھر حرارت آگئی یہی ۹۹
اور ۱۰۰ کے درمیان۔ ڈاکٹر رحمان کے یہاں خود تشریف لے گئے۔ انہوں نے کھانسی زکام کا نسخہ دیدیا۔ دو چار دن میں بخار اتر گیا
لیکن تنفس کی تکلیف بڑھنے لگی ایمینوفائلین کا انجکشن دیا گیا۔ تنفس کم ہوگیا۔ ایک دو دن اسمبلی بھی تشریف لے گئے، لیکن گاڑی میں

اگلی سیٹ پر سرٹیک دیتے۔ میں بے قرار ہوکر پوچھا کوئی خاص تکلیف ہے فرمایا نہیں لیکن مجھے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ گھلتے جا رہے ہیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔ میری خواہش ہوتی کہ ان کو تکلیف نہ کرنی پڑے اور ان کی خواہش ہوتی کہ ان کے لئے کسی کو تکلیف نہ ہو۔ میری خواہش ہوتی کہ ڈاکٹر ان کے پاس آتا لیکن میں ذکر نہیں کرتا۔ اس لئے کہ مجھے جواب معلوم تھا۔ وہ فرماتے مرض مجھ کو ہے یا ان کو اور پھر جو شخص جتنا کرے اس کا احسان ہے نہیں کرے اس کی کوئی شکایت نہیں۔" وہ پوچھتے تم کیسا ڈاکٹر چاہتے ہو۔ میں کہتا مجھے ایسا ڈاکٹر چاہیے جس کو جب جس وقت بلایا جائے فوراً آ جائے خواہ اس کے لئے وہ کوئی فیس لے۔ وہ مسکرا دیتے بات ختم ہو جاتی لیکن دوسرے دن کپڑے پہن کر مجھ سے پہلے گاڑی میں جاکر بیٹھ جاتے۔ اب میری بے بسی دیکھنے کے قابل ہوتی۔ میں تھوڑی دیر تذبذب کی حالت میں کھڑا رہتا نہ کچھ کر سکتا نہ کچھ کہہ سکتا شکست کھاکر گاڑی میں بیٹھ جاتا اور گاڑی چل دیتی۔

ساری تکلیفیں خود اٹھانی ان کی فطرت بن چکی تھی۔ کسی کو ان کی ذات سے تکلیف نہ ہو اس کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ اسی لئے ڈاکٹر کو گھر پر بلانے کی مخالفت کرتے تھے، کوئی ڈاکٹر ان سے فیس نہیں لیتا تھا اور سب انتہائی محبت سے پیش آتے تھے۔ ڈاکٹر فاروقی سے بالکل عزیزوں جیسے تعلقات تھے۔ وہ خود بھی اپنی ذات سے بڑے متواضع اور خلیق انسان ہیں۔ ہمارے گھر میں کسی کو کچھ تکلیف ہو وہ اطلاع ملتے ہی آ جاتے دیکھتے انجکشن لگاتے۔ عثمان صاحب کمپونڈر کو مطمئن کر دیتے عثمان صاحب بھی بڑے ہی شریف اور محبت والے آدمی ہیں۔ ان سب باتوں کے باوجود ان کی خواہش یہی ہوتی کہ کسی کو تکلیف نہ دی جائے۔

ڈاکٹر رحمان کے علاج کو ایک دو ہفتہ ہوا ہوگا کہ ایک دن مختار صاحب نے ٹیلیفون کیا کہ کرنل شاہ سید صاحب کو دیکھنا چاہتے ہیں کس وقت تشریف لائیں۔ میں بہت خوش ہوا۔ کرنل شاہ کے اخلاق کی دل ہی دل میں تعریف کرتا ہوا چچا جان کو مطلع کیا انہوں نے فرمایا "جس وقت جی چاہے تشریف لے آئیں ان کی عنایت ہوگی"۔ چنانچہ اسی دن گیارہ بجے تشریف لائے۔ اور بہت دیر تک معائنہ کرتے رہے۔ میں نے انکی رائے پوچھی۔ انہوں نے پورے وقار اور سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا "میں ابھی کوئی رائے نہیں دے سکتا۔ کل ان کو جناح اسپتال لے آیئے میں ان کے قلب کا اکسرے اور کارڈیوگراف کے بعد کوئی فیصلہ کر دیگا۔ چنانچہ دوسرے دن ٹھیک گیارہ بجے ان کے دفتر پہنچ گیا۔ وہ دفتر میں نہیں تھے۔ چچا جان کو دفتر میں بٹھا دیا اور ڈاکٹر صاحب کی تلاش میں اسپتال کا رخ کیا۔ وہ اسپتال کا چکر لگاکر آ ہی رہے تھے جیسے ہی مجھے دیکھا تیز تیز قدم بڑھاتے ہوئے گلے میں پڑے ہوئے اسٹتھ اسکوپ سے کھیلتے ہوئے دفتر کی طرف تشریف لائے اور بڑی تعظیم و تکریم اور تواضع سے پیش آئے اور دوسرے کمرے میں لے گئے۔ وہاں کارڈیوگراف لیا گیا۔ اور پھر وہاں سے اپنی گاڑی پر دوسری جگہ گیا وہاں ایکس رے لیا گیا۔ اور پھر تیسری جگہ خون کے مختلف جانچ کے لئے خون لیا گیا اور دوسری جانچ مکمل ہوئی۔

اتنی دوڑ دھوپ میں سانس کچھ تیز ہوگئی لیکن بڑے حوصلہ اور ہمت سے سارا کام کراتے رہے۔ گھر پہنچے تو سب لوگوں نے گھیر لیا جیسا کہ ہمیشہ سے قاعدہ تھا۔ جب کبھی وہ باہر سے آتے تھے تو گھر کے سارے افراد ان کے گرد جمع ہو جاتے تھے۔ لوگ تفصیل جاننا چاہتے تھے لیکن وہ چند جملوں میں ساری بات کہ جاتے تھے جس سے گھر کے لوگوں کی تسلی نہیں ہوتی تھی۔ مزید تفصیل اور استفسار کے جواب میں انکا ایک تبسم بس تھا۔ چنانچہ اسی طرح ان سے تفصیل کی فرمائش ہوئی انہوں نے میری طرف اشارہ کر دیا اور خود پلنگ پر بیٹھ گئے۔ اور زیر لب تبسم کے ساتھ اپنی ساری روداد لیٹے لیٹے سنتے رہے۔

دوسرے دن شام کو ڈاکٹر صاحب کا ٹیلیفون آیا کہ میں ساری رپورٹ لے کر خود آؤں گا اور دوا اور علاج تجویز کروں گا۔ چنانچہ جب وہ تشریف لائے اور یہ کہا کہ قلب بڑھ گیا اور اسی کے ساتھ ساتھ قلب کی کسی شریان میں ایک ایسی گرہ بن گئی ہے جس سے دوران خون میں دقت ہوتی اور اسی لئے قلب کو زور لگانا پڑتا ہے اور اسی سے تنفس کی تکلیف ہوتی ہے کم و بیش تشخیص وہی تھی جو سارے اطبا اور

ڈاکٹروں کی تھی۔ انہوں نے ایک ٹیکہ ڈیجاکسن کا اضافہ کیا۔ کچھ دوائیں کھانسی وغیرہ کی بھی دیں۔ دس بارہ دن کے علاج کے بعد حالت بظاہر بھی خاصی معلوم ہونے لگی۔ اب وہ بستر سے ادھر ادھر چلنے پھرنے لگے۔ پاخانہ جو ان کے کمرے سے کچھ دور پر تھا خود سے جانے لگے اور فرماتے کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوتی۔

ڈاکٹروں کی شدید ہدایت تھی کہ کسی کو ملنے نہ دیا جائے تاکہ دل و دماغ کو مکمل آرام نصیب ہو۔ کسی قسم کی علمی اور سیاسی گفتگو میں حصہ نہ لیں صرف انہیں حضرات کو ملنے دیا جائے جن کی باتوں سے دل خوش ہو۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے اپنی عاجزی اور بے بسی کا اظہار کیا اور ان سے استدعا کی کہ آپ خود گوش گذار کردیں۔ چنانچہ ایک دن ڈاکٹر صاحب نے کہنا شروع کیا کہ آپ نے زندگی میں بہت کام کئے ہیں اتنی خدمت کی ہے جتنی کم ہی لوگوں نے کی ہوگی۔ اور ابھی قوم کو آپ کی خدمت کی ضرورت ہے اس لئے کچھ دنوں قومی ملی اور علمی مصروفیتوں سے بالکل علیحدہ ہو جائیے۔ صحت کے بعد انشاءاللہ پھر حصہ لے لیجئے گا۔ انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ کبھی مجھے اور کبھی ڈاکٹر صاحب کو دیکھ کر مسکراتے رہے۔

ان کی علالت کی اطلاع قصداً اخبارات میں نہیں دی تھی۔ اس لئے کہ لوگوں کا ہجوم بس سے باہر ہو جاتا۔ اس پر بھی مشتاقوں، محبوں اور مخلصوں کا تانتا لگا رہتا تھا۔ سمجھدار لوگ صرف دریافت حال کے بعد چلے جاتے تھے۔ میں لوگوں سے کہ دیتا تھا کہ ان کا یہ حال ہے آپ کہیں تو ان کو مطلع کر دوں۔ کچھ لوگ کہتے "میں ان کی خیریت پوچھنے آیا ہوں تکلیف دینے نہیں"۔ بعض لوگوں کو اصرار ہوتا کہ آپ میری آمد کی اطلاع کر دیجئے میں جانتا تھا کہ اگر اطلاع کرائی گئی تو وہ ضرور بلا لینگے۔ اور پھر کچھ نہ کچھ گفتگو بھی ہوگی اور موضوع اور عنوان کی کوئی حد بندی باقی نہیں رہے گی۔

شروع شروع جب لوگوں کو واپس کر دیا گیا اور انہیں علم ہوا تو بہت خفا ہوئے اور فرمانے لگے "تم لوگ مجھے وزیر اعظم بنا دینا چاہتے ہو" مجھے یہ پابندیاں پسند نہیں ہیں۔ میرے پاس جو آتا ہے محبت اور خلوص سے آتا ہے کسی غرض سے نہیں آتا ہے۔ کسی کو نہ روکو۔ چنانچہ جس کی بھی اطلاع کی گئی ضرور بلا لیا گیا اور ان کے جسم ناتواں پر جتنا بھی وہ بار ڈال سکتا تھا اس کو برداشت کرتے اور کبھی تکدر کا اظہار نہیں فرماتے

کراچی یونیورسٹی کے ایک لائق پروفیسر اسلامی تاریخ کے پروفیسر کے تقرر کے سلسلہ میں ان سے مشورہ کرنے کے لئے تشریف لائے انہیں ان کی علالت کا علم نہیں تھا۔ ملازم کے ذریعہ انہوں نے اطلاع کروائی۔ فوراً بلا لئے گئے۔ چچا جان رنج کے ساتھ اس ملک میں علمی فقدان کا ذکر کرنے لگے اور فرمایا "ہمارے پی۔ ایچ۔ ڈی زندگی میں صرف ایک مقالہ لکھتے ہیں اور ساری عمر اسی کو چومتے چاٹتے رہتے ہیں حالانکہ پی۔ ایچ۔ ڈی ہونا صرف اس بات کی سند ہے کہ تم تحقیق کر سکتے ہو محقق نہیں ہو"۔ بعد میں مجھ سے پروفیسر صاحب نے فرمایا کہ علالت کا علم نہیں تھا ورنہ کبھی تکلیف نہ دیتا۔ پھر بھی بیچارے پوری گفتگو کئے بغیر ہی اٹھ گئے۔ لیکن احساس والے لوگ کم ہی آتے

ایک مرتبہ راجشاہی یونیورسٹی کے ایک لیکچرار صاحب تشریف لائے۔ میں نے ان کو ان کی حالت بتا دی کہنے لگے کوئی حرج نہیں میں بھی علیگ ہوں اس تعلق سے آپ ہی کے پاس تھوڑی دیر بیٹھ جاؤں گا۔ چنانچہ مجھ سے برادرانہ گفتگو کرتے رہے اتنے میں چچا جان اندر کے کمرے سے باہر تشریف لے آئے۔ لیکچرار صاحب نے سلام کیا اور انہیں کے ساتھ صوفہ پر بیٹھ گئے مزاج پرسی کے بعد انہوں نے وحدۃ الوجود کا مسئلہ چھیڑ دیا۔ پہلے تو انہوں نے معذرت کی کہ میں اپنی صحت سے مجبور ہوں۔ لیکن تھوڑی دیر بعد خود ان سے نہیں رہا گیا اور تقریباً ایک گھنٹہ تک اس مسئلہ پر روشنی ڈالتے رہے۔ لیکچرار صاحب الجھتے رہے اور ان کی تسلی نہیں ہوئی تھی انہوں نے پھر سوال کیا۔ فرمانے لگے "بھائی بس اب دم نہیں ہاں اس سلسلہ میں سعدی کا صرف ایک شعر سن لیجئے ؎

یکے قطرہ باراں ز ابری چکید — خجل شد چو پہنای دریا بدید
کہ جائے کہ دریاست من نیستم — گر او ہست حقا کہ من نیستم

اس شعر کو سنکر لیکچرار صاحب جھومنے لگے کہنے لگے کہ ہزاروں مرتبہ اس شعر کو سنا تھا لیکن کبھی اس مطلب کو نہیں سمجھا تھا اب میں وحدۃ الوجود کے مسئلہ کو سمجھ گیا۔ آپ سے صرف ایک گذارش ہے کہ کبھی خط وکتابت کی اجازت دیدیجئے۔ فرمایا "بڑے شوق سے" سچ ہے

نہ کتابوں سے نہ کالج کے ہے در سے پیدا
دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

کچھ دنوں کے بعد کراچی کے ایک پروفیسر صاحب تشریف لائے۔ انہوں نے اپنی علمی لیاقت کے متعلق کوئی تحریر چاہی۔ فرمایا کہ یہ تو ایک قسم کی شہادت ہے اور شہادت بغیر ذاتی واقفیت کے دیانتداری کے خلاف ہے" اس کے بعد خاموش ہوگئے۔ پروفیسر صاحب کے چہرے پر افسردگی چھاگئی یہ بھی ان سے دیکھا نہیں گیا آخر میں ان سے سوالات شروع کئے۔ اور وہ جوابات دیتے رہے۔ اس کے بعد انہوں نے پوچھا کہ اس موضوع پر آپ نے کون کون سی کتابیں پڑھی ہیں ان کا نام بتلائے۔ جو انہیں یاد تھا وہ بتاتے رہے۔ اس کے بعد خود عربی انگریزی اردو کتابوں کا نام لے کر پوچھنا شروع کیا۔ بیچارے پروفیسر صاحب کو پسینہ آگیا۔ لیکن انہوں نے نہایت صفائی سے جوابات دئے۔ جو جانتے تھے اس کو بتایا جو نہیں جانتے تھے اس کا اعتراف کرلیا۔ اس کے بعد تحریر کا وعدہ فرمالیا۔ پھر خود اس سوال کا جواب دینے لگے۔ سوال یہ تھا کہ اسلام کے اندر غیر اسلامی عنصر کہاں کہاں سے اور کب داخل ہوا۔ وہ گفتگو کر رہے تھے ٹھہر ٹھہر کر جیسا کہ ان کا ہمیشہ کا قاعدہ تھا لیکن تسلسل کا، عالم تھا۔ جیسے بند ٹوٹ چکا ہے اور سیلاب تھمتے نہیں تھمتا۔ اسی سلسلہ میں قدیم وجدید فلسفہ یونانی فلسفہ اسرائیلیات سارے عالم کے فلسفہ کی تاریخ کی ارتقاء پر سیر حاصل بحث کرتے رہے کس طرح یونانی Logos جس سے Logia وغیرہ مشتق ہیں کلمہ کہلایا اور پھر علم کلام کی بنا پڑی اس دن کی ساری گفتگو بڑی ہی پر از معلومات تھی جو الحمد للہ محفوظ کرلی گئی۔

اسی سلسلہ میں اپنی زندگی کا ایک واقعہ بیان کیا کہ وہ الہلال سے کیوں علیحدہ ہوے۔ فرمانے لگے کہ "ایڈیٹر کی تحریروں اور تقریروں میں انا کی بو آئی تھی۔ میں نے انہیں سمجھایا۔ جب وہ نہیں ملنے تو میں علیحدہ ہوگیا۔ یہی بات یہاں کے ایک مولوی صاحب کی تحریر تقریر اور تحریک میں ہے۔ انا کا نعرہ تو شیطان کا ہے۔ جب دین میں انانیت ہو اس سے گمراہی کا شدید خطرہ ہے پھر فرمانے لگے کہ شروع میں مرزا غلام احمد نے بھی آریوں کے خلاف اس کی ت کی تھی اور ہمارے علماء نے انکی مدد کی۔ اگر ہمارے علماء نے اسی وقت ان کی امداد نہ کی ہوتی تو اتنا زور نہ پکڑ سکتا تھا۔ اس کے بعد پنجاب کی تحقیقاتی کمیٹی کے سامنے ایک جماعت کے ایک رکن کا بیان سنایا اور اپنی دلی تکلیف کا اظہار فرمایا کہنے لگے کہ مزاج شناس رسول ہونیکا دعویٰ آج تک کسی نے نہیں کیا تھا۔ پھر اپنی تشویش کا اظہار فرمایا کہ اسلام کے اندر ایک نئے فرقہ کی بنیاد پڑ رہی ہے"

میں بار بار کھانے کے لئے کہہ رہا تھا لیکن ان کی بات ہی نہیں ختم ہوتی تھی یہاں تک کہ میں نے ان کو سہارا دیکر اٹھایا اور دوسرے کمرے میں لے جارہا تھا پھر بھی وہ ایک روایات بولتے ہی جاتے تھے۔ سانس تیز ہو چکی تھی پیروں میں خود سے کھڑے ہونیکی طاقت نہیں ہاتھ میرے کاندھے پر تھا۔ اور میں ان کو اپنے سہارے پر کھڑا کئے ہوئے تھا۔ صرف زبان اور دماغ میں طاقت موجود تھی جو آخر وقت تک اسلام اور دین کی خدمت میں مصروف رہی

بنیادی کمیٹی کی سفارشات پر غور کرنے کے لئے اسمبلی کا اجلاس ہو رہا تھا اسلام ریاستی مذہب ہو قوم کا مطالبہ تھا۔ ان کے بیان کا ایک مسودہ ان کے سامنے پیش کیا گیا انہوں نے اس کو پڑھا اور رد کر دیا۔ دوسری مرتبہ جب محترمی راغب احسن صاحب اور مولانا عبد القدوس بہاری تشریف فرما تھے انہوں نے خود سے بیان کی اصلاح کی اور اخبارات کو بھیجنے کی اجازت دی۔

اسلام کے ریاستی مذہب کی تائیدی جلسہ کی صدارت کے لئے انہوں نے پیر غلام مجدد سرہندی کو نامزد کیا یہاں کے تمام علماء میں وہ پیر صاحب کے خلوص اور جوش جہاد کے بہت معترف تھے۔ ان ذات پر انہیں بہت بھروسہ تھا۔

ایک مرتبہ رات کے گیارہ بجے تھے۔ ابھی ابھی ان کی آنکھ لگی تھی کہ کسی نے دروازہ پر زور سے دستک دی

دروازہ کھولا گیا تو دیکھا ایک مولوی صاحب اپنے ساتھی کے ساتھ ایک بیان پر دستخط لینے کیلئے تشریف لائے تھے ان سے کہا گیا کہ ابھی آنکھ لگی ہے۔
ان حضرات کا اصرار ہوا کہ جگا دیا جائے اور انکی شدید علالت اور انکی نوعیت بتائی گئی۔ بڑی مشکل سے واپس تشریف لے گئے اس ہنگامہ میں ان کی آنکھ کھل گئی فرمانے لگے
کہ مجھے صرف یہ بتا دو کہ کون حضرات تشریف لائے تھے؟ ان کی غرض نہ بتاؤ۔ جب انہیں نام معلوم ہوا تو ایک دم خاموش ہو گئے۔ صبح جب ڈان میں ان حضرات کا بیان دیکھا
تو فرمایا کیا اسی لیے آئے تھے؟ دوسرے دن ڈاکٹر عبدالحی صاحب تشریف لائے تو ان سے بڑے دکھ کے ساتھ شکایت کی۔
ڈاکٹر صاحب نے ندامت سے اس طرح سر جھکا لیا جیسے انہیں سے یہ غلطی ہوئی ہو

ہمارے ایک عزیز لوہے کے تاجر ہیں وہ ان سے ملنے کے لیے آئے۔ ان سے تجارت کی حالت پوچھی۔ انہوں نے ملک کی اقتصادی بدحالی کا بہت ہی
پر درد منظر کھینچا۔ وہ ان کی بات بڑے غور سے سنتے رہے۔ جب وہ ختم کر چکے تو فرمانے لگے "میں تو پاکستان کے مستقبل سے مایوس نہیں ہوں، مشکلات فرد
اور ملت کی آزمائش کے لیے ہوتے ہیں اور آزمائش ہی فرد اور قوم کو زندہ رکھتی ہیں۔ مشکلات سے گھبرانا نہیں چاہیے بلکہ مردانہ وار ان کا مقابلہ کرنا چاہئے"

اب انہیں جلد جلد دورہ پڑنے لگا تھا۔ کرنل شاہ کی رائے ہوئی کہ ان کو جناح اسپتال میں داخل کر دیں لیکن اسپتال میں داخل کرنے کیلئے گھر کا کوئی فرد تیار
نہیں تھا۔ وہاں کے ماحول اور بے بسی سے اور وحشت ہوتی تھی۔ آخر کرنل شاہ کی رائے کے مطابق ڈاکٹر عبدالصمد کانپور والے بھی علاج میں شریک کر لیے گئے۔
کرنل شاہ اور ڈاکٹر عبدالصمد میں مشورہ ہوا۔ دونوں بالکل متفق تھے، چنانچہ اسی نہج پر علاج ہوتا رہا

دارالمصنفین اعظم گڑھ سے ایک مراسلہ آیا تھا جس میں ان سے کوئی استدعا کی گئی تھی۔ وہ اس کا جواب لکھنا چاہتے تھے لیکن
کچھ نہیں پاتے تھے۔ ایک دن انہوں نے مجھے بلایا اور کہا کہ اس کا جواب لکھو۔ اللہ اکبر کس کرب و بے چینی سے انہوں نے جواب لکھوایا۔ وہ بولتے جاتے تھے
اور پیشانی پسینے سے تر ہو جاتی تھی، بار بار اس کو پوچھا جاتا تھا۔ رنج و غم سے سارا چہرہ سرخ ہو جاتا تھا۔ اتنا سخت خط شاید ہی انہوں نے اپنی زندگی میں
لکھا ہو۔ میں بار بار منع کرتا تھا کہ اسے واپس لیجیے۔ لیکن تقریباً چالیس برس کا ناسور اب پھٹ چکا تھا، جو روکے نہیں رکتا تھا۔ وہ خط کیا ہے ان کے ضبط و صبر کے
پرانے زخم کا مواد ہے۔

جمعرات یعنی ۱۹ نومبر ۱۹۵۳ء کے دن وزیر شام ۴ بجے تشریف لائے اور انہوں نے ایک مسئلہ چھیڑ دیا۔ چچا جان نے گفتگو شروع کی، بار بار کلام پاک کے
حوالے دیتے جاتے تھے۔ جب وہ تشریف لائے میں انجکشن کے لیے قیوم صاحب کو لانے جا رہا تھا۔ میں ان کو لیکر واپس آیا وہ محو گفتگو تھے۔ حاضرین کی جانب
بستر پر لیٹ گئے۔ کمزوری اور ضعف کے سبب سے رگ کی تلاش میں بڑی دقت ہوتی تھی کبھی کبھی غلط جگہ سوئی چبھ جاتی تھی تو بڑی تکلیف ہوتی تھی انتہائی ضبط کے
باوجود آہ آہ نکل جاتی تھی ایک ہاتھ میں ناکامی ہوئی تو دوسرے میں کوشش کی گئی۔ بارے اس میں کامیابی ہوئی۔ اس کے بعد وہ اٹھ بیٹھے گفتگو کا تار جہاں سے
ٹوٹا تھا وہیں سے شروع کر دیا۔ کس کو یقین آسکتا تھا کہ یہ وہی شخص ہے جو ابھی دو منٹ قبل درد اور تکلیف سے بے چین تھا۔ میرا دل کڑھ رہا تھا لیکن میں
بول نہیں سکتا تھا۔ میں قیوم صاحب کو چھوڑ کر جب واپس آیا تو دیکھا کہ گفتگو اب بھی جاری ہے۔ یہاں تک کہ مغرب کا وقت ہو گیا۔ وزیر شام نے باہر صحن میں
نماز پڑھی اس کے بعد کچھ دیر گفتگو کے بعد وہ رخصت ہوئے، ساری گفتگو عربی میں ہو رہی تھی۔ میں ان کو گاڑی تک رخصت کرنے گیا وہ بڑے متحیر و متاثر تھے
جمعہ ۲۰ نومبر ۱۹۵۳ء ایک صاحب مجھ سے ملنے آئے، انکے ساتھ ایک اور صوفی منش بزرگ تھے۔ ان سے کہتے تھے کہ ہم لوگ ماہر القادری صاحب
دیکھنے جائیں گے۔ چنانچہ ان دونوں کو ملاقات کے کمرے میں بٹھا دیا اور خود کپڑے بدلنے چلا گیا اور فوراً واپس آگیا۔ چچا جان اسی کمرے میں محو خواب تھے
ان صاحب نے مجھ سے روایت بیان کی کہ صوفی صاحب کہہ رہے تھے عاصم صاحب جلد واپس آگئے۔ سید صاحب پر انوار کی ایسی بارش ہو رہی تھی کہ اٹھنے کو
جی نہیں چاہتا تھا۔"

۲۱ نومبر ہفتہ کا دن ہے۔ صبح میں دفتر جانے کے لیے تیار ہوا۔ عادل میاں (میرا چھوٹا بچہ) مچل گئے کہ میں بھی ساتھ جاؤں گا۔ میں ان کو سمجھاتا
لیکن وہ ضد کرتے رہے۔ مجھے غصہ آگیا اور میں نے ان کو ایک دو طمانچے رسید کر دیے۔ انہوں نے فریاد مچا دی "اے میرے ابا! اے میرے اللہ!" وہ اپنے نانا جان کو بہت

انھوں نے اپنے کمرے سے آواز دی "کس نے میرے بچے کو مارا؟" میں نے خاموشی سے ان کو چھوڑا اور پچھلے دروازے سے راہ فرار اختیار کی۔ کھانے کے وقت جب میں واپس لوٹا تو میں ان کے پاس گیا، اور ایک دوا جو کہیں نہیں مل رہی تھی حتیٰ کہ ڈاکٹر صاحب نے بھی ہمت ہار دیا تھا کہ "وہ ملنی بالکل ناممکن ہے" اور دوسری دوا تجویز کی تھی میں نے اس پہلی دوا کو ڈھونڈھ نکالا اور دل میں بہت خوش تھا کہ مجھے اس کامیابی پر دعائیں ملیں گی، اور ایک محبت بھری نگاہ جسکے تماشا قسم کی بجلیاں بھی ہونگی لیکن وہ کچھ نہ بولے والدہ نے سفارش کی کہ میرے بچے کی کچھ تعریف تو کر دیجیے۔ فرمایا "میرے بچے کو انھوں نے کیوں مارا؟" مجھے کیا معلوم تھا کہ میرے خلاف فرد جرم قائم ہو چکی ہے اور مدعی خود صاحب عدالت کی گود میں بیٹھا داد خواہ ہے۔ عادل میاں نے فاتحانہ انداز سے میری طرف دیکھا، اب مدعی کو منانے کے سوا میرے لیے کوئی چارہ کار نہ تھا۔

عادل میاں ان کے بہت چہیتے تھے۔ وہ فرماتے تھے کہ "عادل نے مجھے پاکستان بلایا ہے اور پھر روک لیا۔ عادل مئی ۱۹۵۰ء میں پیدا ہوئے اور ۱۴ر جون کو چچا جان تشریف لائے۔ اس وقت سے وہ ان کے لیے ایک کھلونا تھے۔ یہاں کا ہمیشہ کا معمول تھا کہ گھر کا سب سے چھوٹا بچہ ان کی توجہ کا مرکز ہوتا، یہاں عادل میاں کی بادشاہی تھی، اس سے وہ بچوں کی طرح کھیلتے۔ کبھی اپنے کمسند سے بٹھا لیتے، کبھی اپنے ساتھ نماز پڑھاتے، کبھی اس سے پوچھتے "تم کس کے ہو؟" وہ کہتا "ہم اپنے ابا کے ہیں!" وہ ان کو ابا ہی کہتا تھا۔ وہ کہتا ہم اپنے ابا کی لاٹھی ہیں، ابا کے سہارا ہیں" ان کا چہرہ خوشی سے کھل جاتا۔ اکثر ان کا چہرہ مسرت سے گلابی ہو جاتا۔ لیکن کبھی کھل کر وہ نہیں ہنستے۔ جس طرح وہ اپنے دکھ درد کو چھپاتے تھے اسی طرح اپنی مسرت کو بھی ظاہر ہونے نہیں دیتے تھے کبھی وہ پوچھتے "تم کون ہو؟" وہ نہایت متین صورت بنا کر کہتا میں "مولانا سید سلیمان ندوی ہوں"۔ اور جھٹ جانماز کھینچ نماز پر کھڑا ہو جاتا، اور سارے ارکان ادا کرتا، زبان سے بڑبڑ کرتا رہتا اللہ اکبر، اس کو یاد ہے۔ اسی سے شروع کرتا اور آخر میں السلام علیکم کہہ کر سلام پھیرتا، اور دعا مانگتے وقت داڑھی پر اسی طرح ہاتھ پھیرتا جس طرح چچا جان دعا کے بعد پھیرا کرتے تھے۔ وہ صبر و سکون سے اس کی ساری نقالی دیکھا کرتے اور خوش ہوتے۔ ہم لوگوں کو حیرت ہوتی کہ اس نے کیسی اچھی نقل اتاری ہے اور لطف یہ تھا کہ آپ کو ہنسی بھی نہیں آتی۔ ہمیشہ کی طرح صرف لبوں پر مسکراہٹ کھیلتی رہتی۔

رحلت سے ایک دو دن پہلے عادل میاں کو قریب بلایا اور کہنے لگے عدو میاں تم ابا کو پیار کرو گے؟ اس نے فوراً جواب میں ہاتھ پھیلانا شروع کر دیا تھے اور پھیلاتے پھیلاتے انتہا تک پہنچا کر کہنے لگا ابا کو اتنا چاہتا ہوں"۔ اس کے بعد چچا جان پلنگ پر بیٹھے ہوئے بڑی حسرت سے کہنے لگے کہ "ایک دن عدو میاں یاد کریں گے کہ میرے بھی نانا ابا تھے"۔ یہ سب باتیں عادل میاں کی فہم سے بالا تھیں اسلیے انھوں نے مطلق اس کی طرف دھیان نہیں دیا۔ ہم لوگ بے حد متاثر ہوئے اور وہ اپنی ہانکتے رہے ہم ابا کی لاٹھی ہیں ہم ابا کے سہارے ہیں

ایک دن مجھ سے سوال کیا کہ تمہارے والد کا کس عمر میں انتقال ہوا؟ میں نے عرض کیا کہ رحلت کے وقت ان کی عمر باسٹھ (۶۲) برس کی تھی۔

پھر پوچھا "اور بڑے بھائی کی (حکیم سید ابو حبیب صاحب) کی عمر کیا تھی؟

میں ان کی عمر ۶۳ برس تھی

پھر کہنے لگے کہ "میں نے تو خاندان میں سب سے زیادہ عمر پائی"۔

میں ان کا مطلب سمجھ گیا اسی لیے عرض کیا لیکن بڑے دادا یعنی (ان کے والد حکیم سید ابوالحسن صاحب) کی عمر تو ۷۲ برس کی تھی

وہ مسکرا کر خاموش ہو گئے۔ لیکن میں اس گفتگو سے سہم گیا۔ پھر اپنا وہم سمجھ کر اس کو ٹال گیا۔

ایک دن حکیم نصیرالدین صاحب ندوی تشریف لائے۔ انھوں نے حسب عادت بڑے حوصلہ افزا الفاظ کہے۔

قلب کی حالت بہت اچھی ہے۔ الحمد للہ نبض بھی متوازن ہے۔ چہرہ بھی شگفتہ ہے۔ ماشاء اللہ بہت اچھی حالت ہے

وہ ان کی باتیں سنتے رہے اور مسکراتے رہے۔ صرف یہ شعر پڑھ دیا ؎

ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق   وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

ایک مرتبہ شعیب قریشی صاحب کا لڑکا عمر جو سلمان کا ہم عمر اور مخلص دوست ہے ان سے ملنے آیا۔ اس کو اپنے پاس بلایا اور بٹھا کر فرمایا۔

"تم تو محمد علی کی جوانی کی ہو بہو تصویر ہو"

آخری دنوں میں اپنے گزرے ہوئے بزرگوں اور عزیزوں کی یاد بہت آنے لگی تھی۔ ہم لوگوں کو اپنے قریب بلاتے۔ سب لوگ ان کے پلنگ کے پاس فرش پر بیٹھ جاتے۔ وہ ان روحوں کو عجیب انداز سے یاد کرتے کبھی ان کے خلوص و محبت کو یاد کر کے بے چین ہو جاتے کبھی ان سے متعلق گذرے ہوئے واقعات انکو تڑپاتے۔ ان کی آنکھوں میں اکثر محبت کے آنسو جھلکتے دیکھے۔ دور کے عزیزوں میں سے بھی کوئی ملنے آجاتا تو سب سے پہلے اس سے اپنا رشتہ بتاتے پھر خاندانی تعلقات و روابط کے قصے اتنا مزے لے کر بیان کرتے کہ سننے والے کی آنکھوں کے سامنے ان بیتے ہوئے دنوں کا نقشہ پھر جاتا اور اپنے پچھلے بزرگوں کی محبت اور عظمت دل میں جاگزیں ہو جاتی۔

جمعہ ۲۰ نومبر ۱۹۵۳ء کو اصرار سے غسل کیا اور مل مل کر بدن کو صاف کراتے رہے۔ غرض بڑی مکمل صفائی ستھرائی کرائی۔ ہفتہ کا دن سکون سے گزر گیا۔ پچھلے پہر رات کو یک بیک میری آنکھ کھل گئی۔ کان میں بڑی درد بھری ایک آواز آئی۔ غور سے سنا تو چچا جان بڑے درد و کرب سے یہ شعر پڑھ رہے تھے ؎

موت کا ایک دن معین ہے نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

میں مضطر ہو گیا۔ اتنے میں والدہ نے آواز دی۔ میں تڑپ کر بستر سے کودا اور ان کے کمرے کی طرف گیا۔ دیکھا کہ تنفس کا دور ہے۔ چہرہ درد و کرب کا آئینہ دار ہے لیکن مجھے دیکھ کر مسکرا دیے۔ میں نے کہا میں ابھی ڈاکٹر کے پاس جاتا ہوں۔ کہنے لگے ابھی نہ جاؤ۔ ڈاکٹر صاحب سو رہے ہونگے۔ ان کو تکلیف ہوگی۔ میں اب کچھ بہتر ہوں۔ نماز فجر کے بعد جانا۔

میں نے والدہ سے کہا مجھے پہلے کیوں نہیں اٹھا دیا؟ انہوں نے فرمایا وہ تو اب بھی مجھے روک رہے تھے رات کی تاریکی دور ہو چکی تھی، سپیدۂ سحر نمودار ہو چکا تھا، ہوا تیز تھی، ٹھنڈ خاصی تھی، فضا میں ایک عجیب اداسی محسوس ہو رہی تھی۔ آج اتوار کا دن شروع ہو چکا تھا۔ میں نے فجر کی نماز پڑھی بارگاہ الٰہی میں ان کی صحت عاجلہ و کاملہ کے لیے دعا مانگی، ڈرائیور کو بیدار کیا اور ڈاکٹر صاحب کے پاس گیا۔ ان کا پھاٹک کھل چکا تھا۔ لیکن کسی آدمی کا پتہ نہ تھا۔ میں ہر طرف دیوانوں کی طرح کھٹ کھٹا رہا تھا۔ اتنے میں ایک ملازم آیا اس نے کہا ڈاکٹر صاحب نماز فجر کے بعد سو گئے ہیں۔ میں

میں نے کہا ڈاکٹر صاحب کو اٹھا دو! لیکن وہ چلا گیا

تھوڑی دیر کے بعد ڈاکٹر صاحب کے لڑکے نے مجھے دیکھا۔

میں نے ان سے حال بیان کیا۔

انہوں نے ڈاکٹر صاحب کو باہر بھیجا۔

ڈاکٹر صاحب نے کہا آپ جائیے۔ میں ابھی آتا ہوں۔ جب میں لوٹ کر آیا تو ان کو پہلے سے بہتر دیکھا۔ انہوں نے از خود کہا کہ مجھے دوا کی ایک ٹکیہ اور دے دو چنانچہ دے دی گئی۔ اتنے میں ڈاکٹر صاحب آگئے۔ انہوں نے کہا اچھا کیا کہ ٹکیا کھالی۔ پھر پوچھا کہ "دل میں درد تو نہیں؟" فرمایا الحمد للہ ذرہ برابر نہیں ہے۔

ڈاکٹر صاحب۔ پھر کوئی بات نہیں ہے

ڈاکٹر صاحب سے سوال کیا "ڈاکٹر صاحب! یہ مرض اچھا بھی ہو جاتا ہے؟"

ڈاکٹر صاحب "کیوں نہیں، آپ اچھے ہو جائیں گے

پھر فرمایا میرے خیال میں کوشش بیکار ہے

ڈاکٹر صاحب۔ ایسی مایوسی کی بات نہیں ہے

میں ڈاکٹر صاحب کو لے کر باہر آیا۔ ان سے پوچھا کیا حال ہے؟ کہنے لگے حملہ ہوگیا تھا، کمزور جسم ہے۔ میں نے پوچھا کوئی تشویش کی بات تو نہیں؟ کہنے لگے کوئی بات نہیں ہے۔ آج پھر انجکشن لگوا دیجئے گا۔ وہ چلے گئے میں واپس آگیا۔ اس کے بعد ہم لوگوں کے ساتھ مل کر انہوں نے ناشتہ کیا، دو توس جیلی لگا ہوا اور ایک نیم برشت انڈا۔

تھوڑی دیر بعد سفیر حجاز آگئے۔ میں نے کہا کہ اسی کمرے میں بلا لیجئے۔ کہنے لگے نہیں مجھے ملاقات کے کرہ میں لے چلو۔ میں نے ان کو سہارا دیا اور اس کمرے میں پہنچا دیا۔ وہاں بھی بستر لگا رہتا تھا، اس پر لیٹ گئے۔ خطیب صاحب بستر کے قریب ہی بیٹھ گئے، ان سے بھی اسیطرح گفتگو کرتے رہے جیسے ابھی دورہ پڑا ہی نہ تھا۔ گیارہ بجے کے قریب میں انجکشن کیلئے قیوم صاحب کو لانے گیا، حالت اتنی بہتر ہو چکی تھی کہ انہوں نے کہا اگر میں ایک گھنٹہ کے بعد آؤں تو کوئی حرج تو نہیں۔ اس نے کہا کوئی حرج نہیں چنانچہ وہ ایک بجے آئے اور انجکشن لگا کر چلے گئے۔ ہم لوگ کھانے سے فارغ ہو کر ان کے پلنگ کے پاس بیٹھ گئے۔ انہوں نے پھلکا کی فرمائش کی تھی اور رکھوا دی کہ بعد میں کھاؤں گا۔ شاید دو بجے ہوں، عادل میاں پینٹ وغیرہ پہن کر آئے اور نانا کے پاس بڑی شان سے السلام علیکم مولانا نانا کہکر کھڑے ہوئے اور کہنے لگے ابا ہم صاحب بن گئے۔ انہوں نے فرمایا تم صاحب بنو گے مولوی نہیں بنو گے۔ انہوں نے اسی بے تکلفی سے فرمایا۔ "نہیں ہم صاحب بنیں گے"۔ متبسم ہو کر بولے تو پھر ہم تم سے رنج ہو جائیں گے۔ عادل میاں نے فوراً جواب دیا اچھا تو نہیں بنیں گے۔ پھر وہ ہنسنے لگے اور عادل میاں پینٹ میں ہاتھ ڈال کر اٹھلاتے ہوئے چلے گئے اور وہ اس کو محبت بھری نگاہ سے دیر تک دیکھتے رہے۔

اب اتفاق سے میں تنہا رہ گیا، مجھ سے مخاطب ہوئے اور بہت ہی سنجیدہ ہو کر کہا "عاصم میاں!"

میں نے کہا "جی!"

آپ کو والد صاحب کی خدمت کا موقع نہیں ملا۔

میں نے کہا "جی نہیں"۔

پھر فرمایا تمھیں والدہ کی خدمت کا بھی موقع نہیں ملا۔ میں نے عرض کیا "جی نہیں"۔

پھر تھوڑی دیر توقف فرمایا اور مجھے عجیب نظروں سے دیکھتے رہے۔ میں ان کا مفہوم مطلق نہیں سمجھ سکا۔ ان کی آنکھوں میں عجیب بات نظر آئی میں اس کو بیان نہیں کرسکتا ہوں۔ شاید آنکھیں پرنم تھیں بڑے ہی درد میں ڈوبی ہوئی دھیمی آواز میں فرمایا "لیکن اس مرتبہ تمھیں موقع مل گیا"۔ میں بلبلا اٹھا اور بے اختیار زبان سے نکلا "میرے باپ! میں نے تو آپ کی کوئی خدمت نہیں کی"۔ وہ صرف مسکرا دیے اور مجھے دیکھتے رہے میرا دل بھر آیا اور میں وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ والد مرحوم کی یاد نے تڑپا دیا۔ اپنی کم فہمی پر ماتم کرنے کو جی چاہتا ہو کہ میں بالکل نہیں سمجھا کہ یہ الوداعی فقرے تھے، ورنہ قدموں سے آنکھیں ملتا اور پیر پکڑ کر کہتا کہ مجھے بے سہارا چھوڑ کر نہ جائیے۔

کوئی چار بجے کے قریب والدہ سے مخاطب ہوئے اور کہنے لگے کہ آپ عاصم کے ساتھ مطمئن ہیں۔

وہ کہنے لگیں کہ یہ کوئی سوال ہے ———؟

فرمایا میرے سوال کا جواب دیجئے۔ فضول باتوں میں مت الجھائیے۔

والدہ نے ان کے سوال کا جواب دیا "بے شک"

پھر فرمانے لگے "الحمد للہ میرا قلب بھی بہت مطمئن ہے۔

والدہ نے میرے پاس آکر ان کے فقروں کو دھرایا۔

میں نے ان کی تسلی کردی

لیکن خود اپنا دل کسی نامعلوم خوف سے دھڑکنے لگا۔

مجھ پر ایک عجیب اضطراب کی کیفیت تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ لیکن عجیب سناٹا سا معلوم ہوتا تھا۔ کیسی اُداسی تھی۔ وہ ماں سے باہر ہے۔ میں اُٹھا پھر ان کے کمرے میں گیا۔ دیکھا کہ سلمان وضو کرا رہے ہیں یہ خدمت ان کی سب سے چھوٹی لڑکی کیلئے مخصوص تھی۔ ہمیشہ وہی وضو کرایا کرتی تھی۔ عصر کی نماز پڑھی۔ اور رات کھانے کے وقت کی بچی ہوئی کھیر منگا کر نوش کی۔ پھر سلمان نے پان دیا۔ ان کا معمول تھا کہ ہر دو کھانے ناشتہ اور شام کی چائے کے بعد دو گلوری پان کھاتے تھے۔ اور اقتداءً خاں مقتدا خاں کا الائچی دانہ تمباکو نوش فرماتے تھے۔ اس مرتبہ پان کھانے کے بعد وہ مل نہیں رہا تھا۔ میں نے تلاش کر کے ان کو دیا۔ جب میں نے تمباکو دیا تو پھر انہوں نے مجھے بڑی عجیب ہی نظر سے دیکھا اور ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے رہے۔ میں ان کا مفہوم کچھ بھی نہیں سمجھا۔ اب سمجھتا ہوں کہ شاید وہ حسرت بھری نگاہ تھی، رخصتی کا پیام تھا۔ فرقت کا پیغام تھا۔ آہ مجھ کو کیا خبر تھی ؎

کیا خبر تھی انقلابِ آسماں ہو جائیگا ٭ باپ[1] کا ملنا نصیب دشمناں ہو جائیگا

ساڑھے پانچ بجے مشتاق صاحب جوہری ملنے آئے۔ وہ بھی چچا جان سے خصوصی محبت کرتے ہیں۔ ان سے وہ بیان کرتے رہے کہ رات پھر تنفس کا دورہ پڑ گیا تھا۔ اب اچھا ہوں۔ اس کے بعد مغرب کی نماز کا وقت ہو گیا۔ سلمان نے نماز پڑھوائی بیٹھے بیٹھے نماز ادا کی۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو مسکرائے۔ سلمان نے پوچھا کیا بات ہے؛

فرمایا آج میں نے شوکت علی کی نماز پڑھی۔

سلمان نے پوچھا کیا مطلب؛

فرمایا وہ اسی صورت سے نماز پڑھتے تھے۔

اس کے بعد سلمان نے کہا۔ ابا سو جائیے۔ آپ رات کو بھی نہیں سوئے ہیں۔ انہوں نے فرمایا بہت اچھا۔ اس کے بعد وہ بستر پر لیٹ گئے۔ اور روشنی بجھا دی اس کے بعد وہ دبے پاؤں آئے اور ان کے سر سے ٹوپی اتارنے لگے۔ انہوں نے پوچھا کون؛ سلمان نے کہا کوئی نہیں۔ اور وہ پھر سو گئے۔

میں نے باہر صحن میں مشتاق صاحب کے ساتھ مغرب کی نماز پڑھی۔ نماز کے بعد اسی چٹائی پر مشتاق صاحب سے باتیں کرنے لگا۔ اتنے میں تھوڑی بعد غلام محمد صاحب آئے۔ اب تاریکی کچھ بڑھ چلی تھی وہ بھی وہیں چٹائی پر بیٹھ گئے۔ اور خیریت پوچھی۔ ان کو حال بتاتا رہا۔ اتنے میں سلمان نے روشنی جلائی اور پکارا۔ "دیکھئے دیکھئے تو"۔ ہم لوگ دوڑ پڑے۔ دیکھا کہ وہ مٹھی بھینچ رہے ہیں۔ اور گہری سانس لے رہے ہیں۔ فوراً ڈاکٹر عبدالصمد صاحب کو ٹیلیفون کیا۔ انہوں نے فرمایا۔ "ابھی میرے پاس دو بجے ہیں"۔ ہم لوگوں نے سمجھا کہ شاید وہ اس وقت نہیں آسکیں گے۔ میں دوڑا کہ ڈاکٹر کو لاؤں۔ مگر گاڑی باہر گئی ہوئی تھی۔ پیدل ہی بھاگا تھوڑی دور جا کر ٹیکسی لی۔ اور مارٹن ہسپتال کے ڈاکٹر فاروقی کے پاس گیا۔ معلوم ہوا کہ وہ گھر پر نہیں ہیں۔ اب وہاں سے پیر الٰہی بخش کالونی گیا۔ ایک ڈاکٹر صاحب سے حال بیان کیا۔ انہوں نے کہا۔ یہ تو میرے مطب کا وقت ہے میں نہیں جا سکتا۔ پھر پوچھا معالج کون ہیں۔ میں نے کرنل شاہ اور عبدالصمد صاحب کا نام بتایا وہ کہنے لگے کہ ایسے ایسے ڈاکٹروں کے بعد میں کیا علاج کروں گا۔ میں نے کہا۔ ڈاکٹر صاحب میں آپ کو علاج کے لئے کہاں کہہ رہا ہوں۔ میں تو صرف اس لئے آپ کو لیجانا چاہتا ہوں کہ آپ دیکھ کر مجھے یہ بتلا سکیں کہ ان کی حالت کیسی ہے۔ کہنے لگے کوئی بات نہیں نیند آگئی ہوگی۔ میں نے کہا از راہِ کرم یہی بات وہاں دیکھ کر کہدیجئے گا۔ چنانچہ وہ راضی ہوئے ——— !

نہ معلوم کیوں یک بیک دل کا سارا اضطراب، ساری بیقراری، ساری تڑپ، ساری دھڑکن ختم ہو گئی۔ جیسے سکون ہو گیا۔ دل نے کہا شاید اب بہتر حالت ہے۔ شاید اب وہ خطرہ سے باہر ہیں۔ شاید اب میں ان کو دیکھ سکوں گا۔ ان سے باتیں کر سکوں گا۔ ان کی نورانی صورت سے اپنے قلب کو منور کر سکوں گا۔ ان کی اس غفلت کی نیند پر اپنی پریشانی کا اظہار کروں گا۔ وہ مسکرا کر فرمائیں گے۔ آپ کیا سمجھے تھے میں چل بسا۔ میں کہوں گا۔ میں قربان ایسا کیوں ہونے لگا۔ تھوڑی دیر تک اسی کا چرچا رہیگا۔ ٹیکسی اپنی پوری رفتار کے ساتھ گھر کی طرف لوٹ رہی تھی۔ میرے خیالات کی رو اس سے بھی زیادہ تیز تھی۔

آہ ! جب گھر پہنچا۔ کیسی خاموشی تھی۔ موت کی خاموشی۔ تاریکی بھیانک تاریکی۔ دل بیٹھنے لگا۔ تیز تیز قدم رکھتا ہوا دروازہ پر پہنچا۔ دیکھا غلام محمد

[1] یہ شعر اسی ترمیم کے ساتھ میری اہلیہ کی زبان سے بے ساختہ نکلا "عاصم"

اور مشتاق صاحب زمین پر پھیلے ہوئے بیٹھے ہیں میں نے اُن سے لرزتے ہوئے پوچھا۔ "خیریت" ـــــ انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ صرف گردن ہلادی۔ ان کا اترا ہو چہرہ اور بہتی ہوئی آنکھیں سب کچھ بتلا چکی تھیں۔ کمرہ کے اندر قدم رکھا۔ دیکھا کہ اُسی شان سے لیٹے ہوئے ہیں۔ اوپر سے چادر اڑھادی گئی ہے۔ عجیب قیامت کا منظر تھا۔ گھر کے سارے افراد اس شمع کے چاروں طرف پروانوں کی طرح کھڑے ہیں۔ سب کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہے۔ والدہ اُف چوڑی ندارد۔ چہرہ سفید۔ آنکھیں جل تھل۔ لیکن ضبط وصبر کی کوہ پیکر بنی کھڑی ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی لپٹ گئیں۔ اور کہا۔ بیٹا ضبط وصبر کا مقام میں نے کہا۔ اماں میں ڈاکٹر کو لاتا ہوں۔

ہاں میرے لال تم ڈاکٹر کو لاتے ہو۔ لیکن وہ ڈاکٹر سے بے نیاز ہو چکے۔

میرا سر چکرا گیا۔ معلوم ہوا جیسے دل کی دھڑکن بند ہو جائیگی۔ حلق خشک ہوگیا۔ والدہ نے مجھے اور اپنے کلیجہ سے لگالیا۔ اور میرا سر اپنے شانے پر رکھ لیا۔ وہ میری پیٹھ پر تھپکی دیتی رہیں۔ اور زبان سے یہی کہتی رہیں "صبر بیٹا صبر"

شمیمہ کو پکار کر مفرح منگوایا اور مجھے دیا۔ پھر پانی پیتا رہا۔ یک بیک کچھ خیال آیا۔ میں ہوش میں آگیا۔ ڈاکٹر صاحب باہر کھڑے تھے ان کو دکھلادوں۔ شاید ان لوگوں کا خیال غلط ہو۔ پس میں تیر کی طرح باہر گیا اور ڈاکٹر کو لے آیا۔ والدہ کہتی رہیں کہ ابھی ڈاکٹر عبدالصمد آچکے ہیں۔ اور اعلان کر چکے۔ لیکن دل نہیں مانا۔

ڈاکٹر صاحب نے دیکھا۔ آہ! کتنا شاہانہ سکون۔ کتنی پُروقار نیند تھی۔ ابدی نیند۔ ہائے انہوں نے بھی دوسرا فیصلہ نہیں سنایا۔

ان کو رخصت کیا ہی تھا۔ کہ سلمان ڈاکٹر رحمان کو لیکر آئے۔ سلمان نے آتے ہی چادر اُلٹ دی۔ اور ان کی داڑھی چھو کر بیتابانہ پکارنے لگا ـــــ

ابا ـــــ ابا ـــــ میرے ابا ـــــ بولئے!

ڈاکٹر رحمان نے بھی دیکھا اور کھڑے ہو گئے۔ سلمان کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اور کہا۔ صبر کرو صبر۔ اور رخصت ہو گئے۔

مجھ پر اب سکتہ کا سا عالم تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا ہوا۔ اور کیا ہو رہا ہے۔ میں بُت بنا کھڑا تھا۔ سلمان بہت بے قرار ہو رہا تھا۔ والدہ سلمان کو پکڑ کر لائیں اور مجھ سے لپٹا دیا۔ میں نے اس کو سینہ سے چمٹا لیا۔ میرے پاس الفاظ نہیں تھے جس سے میں اس کو تسکین دیتا۔ شاید دل کی بات دل تک پہنچ رہی ہو۔

میں سلمان سے علیحدہ ہوا اور صوفہ پر گر پڑا۔ والدہ نے مجھے پھر مفرح دیا۔ اور کہا "بیٹا! تم اپنے آپ کو سنبھالو" دل کو مضبوط کرو۔ تم پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔ سب کام تم ہی کو انجام دینا ہے۔

اب میں نے دل کی قوت کو مجتمع کرنا شروع کیا۔ مجھے ہوش آچکا تھا۔ اِتنے میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی ـــــ ریڈیو پاکستان کا ٹیلیفون تھا۔ انہوں نے پوچھا۔ کہ میں نے بہت ہی افسوسناک خبر سنی۔ کیا وہ سچ ہے؟

آہ! آپ نے جو کچھ سنا سب سچ ہے۔

سب بچیاں۔ سلمان۔ والدہ پلنگ کے چاروں طرف کلام پاک لیکر بیٹھ گئے۔ اور تلاوت شروع کردی۔ ریڈیو سے اعلان کے فوراً ہی بعد لوگوں کا تانتا شروع ہو گیا۔

زہرہ آپا۔ مولانا محمد علی کی صاحبزادی۔ شوکت علی کی بہو۔ زاہد علی صاحب کی بیگم روتی ہوئی آئیں۔ اور کہنے لگیں۔ لِلّٰہ! میرے چچا کو مجھے دکھاؤ۔! پھر بیگم نسیم۔ گلنار آپا (بیگم شعیب قریشی) تشریف لائیں۔

باہر لوگوں نے تجہیز و تکفین کے متعلق سوالات شروع کر دیئے۔ ان مسائل پر آہ میں نے کب سوچا تھا کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اتنے میں شعیب قریشی کے داماد ڈاکٹر عابد نے کہا۔ آپ متردد نہ ہوں۔ جہاں ماموں یعنی عبدالرحمٰن صدیقی کا مزار ہے وہیں انتظام کرلیں۔ مجھے کچھ تجربہ ہے۔ اور لوگوں کی رائے ہوئی کہ جہاں مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب مدفون ہیں وہیں انتظام کیا جائے۔ اس لئے سب سے پہلے میں نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو ٹیلیفون کیا اور اس جگہ دفن

کرنے کی اجازت مانگی۔ انہوں نے کہا۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ مولانا عثمانی کہاں مدفون ہیں۔ میں نے ان کو بتایا کہ میونسپلٹی کی زمین ہے۔ اور آپ اجازت دے سکتے ہیں۔ میرے دماغ میں تھا کہ نقوی صاحب چیف کمشنر کی وہ قائمقامی کر رہے ہیں۔ انہوں نے کہا آپ ان لوگوں سے ملئے جنہوں نے مولانا عثمانی کی تدفین کا انتظام کیا تھا۔

مجھے فوراً مولانا عبدالقدوس بہاری کا خیال آیا چنانچہ ان کو ٹیلیفون کیا۔ ان کا کوئی پتہ نہیں تھا۔ بیچارے ڈاکٹر عابد نے کہا۔ کہ میرے ساتھ چلئے۔ میں انہی کی موٹر پر مولانا عبدالقدوس بہاری اور دوسرے لوگوں کے یہاں سے ناکام ہو کر شعیب صاحب کے مکان پر پہنچا۔ اور وہاں سے ٹیلیفون کے ذریعہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے مکان کا پتہ چلایا اور ان کی تلاش میں نکلا پھر دیر تک بھٹکتا رہا۔ بالآخر یہ معلوم ہوا۔ کہ کلکٹر صاحب نے میونسپل کمشنر مسٹر ہورائڈ سے اجازت مانگی۔ اور انہوں نے فرمایا کہ میرا ارادہ اس زمین کو قبرستان بنانے کا نہیں۔ اس لئے نہیں مل سکتی۔

اب میں اور عابد سیدھے اس قبرستان پہنچے۔ جہاں عبدالرحمٰن صدیقی سوئے ہوئے ہیں۔ اور انہیں کے قریب مسجد کے دامن میں قبر کھودنے کا حکم دے کر گھر لوٹے۔ یہاں معلوم ہوا۔ کہ مولانا تمیز الدین خاں نے نقوی صاحب چیف کمشنر کو ٹیلیفون کیا تھا۔ انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ انشاء اللہ صبح تک انتظام ہو جائے گا۔ اس کے بعد طے پایا کہ کل ساڑھے آٹھ بجے اس عاشقِ رسولؐ کا جنازہ اُٹھے گا۔ دس بجے کے قریب شعیب صاحب کا اندرون سندھ سے ٹیلیفون پہنچا کہ میں نماز جنازہ میں شرکت کی غرض سے صبح آؤں گا لیکن راستے میں ان کی گاڑی خراب ہو گئی، اسلئے نماز جنازہ میں شریک نہ ہو سکے۔

اب اخبارات اور خبر ایجنسیوں کے مسلسل ٹیلیفون آنے شروع ہوئے۔ کہیں سے جنازہ کے متعلق استفسار۔ کہیں تدفین کے متعلق۔ بعض ان کی سوانح حیات جاننے اور چھاپنے کے لئے بے چین۔ اور اس پر لوگوں کا تانتا۔ بس قیامتِ صغریٰ کا منظر تھا۔ اپنی بے بسی اور بے چارگی کا کیا کہوں کہیں اتنی بھی فرصت نہیں ملتی تھی کہ کہیں چھپ کر رو ہی لوں۔ دوڑتے دوڑتے پیر جواب دے چکے تھے۔ ایک بجے تک لوگ جمع رہے۔

رات بھر دعائیں۔ اور قرآن خوانی، اگر، عود اور لوبان نے کیسا سماں کھینچا تھا۔ اس کا اندازہ وہی لگا سکتا ہے جس کے گھر کا سب سے بیش قیمت سرمایہ اس کی آنکھوں کے سامنے اس سے چھن گیا ہو۔ جب کبھی فرصت ملتی میں ان کے قریب جاتا اور ان کی پیشانی کو بوسہ دیتا۔ ان کے جسم کو غور سے دیکھتا۔ کیا کہوں یقین کرنے کو دل ہی نہیں چاہتا تھا۔ بس یہی خیال ہوتا اب اُٹھیں گے، اب بولیں گے۔ اب عشاء کی نماز کے لئے پکاریں گے۔ اب وضو کے لئے بلائیں گے۔ رات ڈھلتی جا رہی تھی، سناٹا بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ اب ان کے تہجد کا وقت آگیا۔ لیکن وہ تہجد میں ناغہ کر دیں گے۔ انہوں نے تہجد کبھی ناغہ نہیں کی ہے۔ اب وقت پر تہجد کی نماز کے لئے گھنٹی بجے گی۔ اب ان کے جسم کو حرکت ہوگی۔ لیکن آہ کچھ بھی نہیں ہوا۔

اُف صبح ہو گئی، رخصت کی صبح، دائمی فرقت کی صبح، وداع کی صبح۔ آہ! وہ صبح جس میں کوئی پیغامِ حیات نہیں۔

بس ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ساری فضا نے کفن اوڑھ لیا ہے۔

آہ! ہم اس جسمِ اطہر کو اُٹھا کر بیچ کے کمرے میں لائے۔ قینچی سے کاٹ کاٹ کر سارے کپڑے علیحدہ کئے۔ بے اختیار جی یہی چاہتا تھا۔ کہ بس لپٹ جاؤں اور کہوں ؎

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے ٭ کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

سب لوگوں نے مل کر تخت پر لٹایا۔ آہ! سارا جسم کتنا نرم تھا۔ جس طرف موڑا جاتا تھا مڑ جاتا تھا۔ چہرے پر وہی سنجیدگی، وہی وقار، وہی متانت وہی تبسم اب تک جو تھا۔ میں نے پھر پیشانی کو چوم لیا۔ ڈاکٹر عبدالحی صاحب نے شہادت کی انگلی چوم لی۔ اور لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ کتنی مبارک ہیں یہ انگلیاں۔ جو سرورِ کائنات کی سیرت نگاری میں زندگی بھر مصروف رہیں۔ اندر میں ——— اور ——— شمس ماموں پانی ڈال رہے تھے۔ صوفی جی کپڑے ——— طہارت کرا رہے تھے ——— ڈاکٹر بتا رہے تھے۔ سلمان بُت بنا کھڑا تھا۔ کبھی پانی ڈالتا اور کبھی قریب آکر غور سے دیکھتا رہتا۔

آخر آٹھ بجے رخصت کا لباس پہنایا گیا۔ داڑھی میں عطر لگایا گیا۔ کافور چھڑکا گیا۔ اور پلنگ پر لٹا دیا گیا۔

دوسرے کمرے میں سفیر مصر، سفیر حجاز۔ ڈاکٹر محمود حسین سابق وزیر تعلیم اور بہت سے لوگ تھے۔ وہ بلائے گئے۔ انہوں نے آخری زیارت کی۔ اور پھر کمرہ بند کر دیا گیا۔ اور عورتوں کو بلا لیا گیا۔

باہر ہر طرف کمپاؤنڈ میں ہزاروں کی تعداد میں لوگ جمع تھے۔ ہر طرف دریاں بچھا دی گئی تھیں۔ سب کلام پاک سے قرآن خوانی میں مصروف تھے۔

ساڑھے آٹھ بجے گھر سے جنازہ نکلا۔ سڑک پر رکھا گیا۔ دو بڑے بڑے بانس دونوں طرف......... لگا دیئے گئے۔ تاکہ ہزاروں آدمی کاندھا دے سکیں۔ لوگوں نے پھولوں سے اسے ڈھک دیا۔ اس کے بعد جنازہ ایک جلوس کی شکل میں گھر سے رخصت ہوا۔ سفیر مصر سے کہا۔ کہ آپ مسجد میں نماز کے لئے چلے جائیں ــــ لیکن انہوں نے کہا مجھے اس سعادت سے کیوں محروم کرنا چاہتے ہیں! ہر شخص کاندھا دینے میں ایک دوسرے سے سبقت کرنا چاہتا تھا۔

آہ! ان کے جنازے کا منظر بھولتا ہی نہیں۔ امیر غریب۔ فقیر سفیر سب اس طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے جیسے ان کا باپ ان کا بھائی۔ ان کا سب کچھ آج رخصت ہو رہا ہے۔ جس راستہ سے یہ جلوس گزرتا تھا مکانوں کی چھتوں پر سے عورتوں کی آہ و بکا کی آوازیں آتی تھیں ممالک اسلامیہ کے سفراء آگے بڑھ کر کاندھا دے رہے تھے ان کی آنکھیں نمناک اور لب کانپ رہے تھے۔ جیسے ان کا عزیز ترین محبوب ان سے چھن گیا ہو۔ یوں تو ان کی محبوبیت کے بہت سے واقعات دیکھے۔ لیکن اس دن اندازہ ہوا کہ ہر خاص و عام کے قلوب میں ان کی کتنی جگہ تھی۔

سفیر حجاز خطیب صاحب جنازہ کے آگے ایک طرف مجھے اور دوسری طرف سلمان کو اپنے قریب لیے ہوئے تھے۔

پوری سڑک طے کرنے کے بعد ہم ٹاؤن مسجد جہاں ایک مرتبہ انہوں نے بقرہ عید کی نماز پڑھائی تھی اور ایک دو جمعہ بھی پڑھائے تھے۔ وہ ابھی زیر تعمیر مسجد ہے اس کی تعمیر کا سامان پھیلا ہوا تھا۔ اس کے وسیع احاطہ میں مسجد کے محرابی در کے سامنے جنازہ رکھا گیا۔ اور ڈاکٹر عبدالحی صاحب نے نماز پڑھائی۔

آہ! افسوس، کسی کا گھر لٹ گیا۔ اور کوئی اپنی شہرت کیلئے اس کو بھی وسیلہ بنانا چاہتا تھا۔ اسی لئے ڈاکٹر صاحب کا انتخاب کیا گیا۔ ان سے خلوص و موانست تھی۔ نماز کے بعد زیارت کے لئے لوگوں کا اصرار ہوا۔ اس کے لئے لوگوں کا ہجوم ہوا۔ پھر زائرین اور مشتاقین کی ایک قطار بنا دی گئی۔ جو یکے بعد دیگرے سامنے سے آتے، چہرۂ انور کو ایک نظر دیکھ کر گزر جاتے تھے۔ ہر شخص آتا اور ایک نظر دیکھتا۔ یا پھر شاید دیکھ بھی نہیں پاتا اور صرف محبت اور عقیدت کے آنسو ان کی بارگاہ میں پیش کر کے چلا جاتا۔ ایک انجینیر صاحب چیخ چیخ کر پکار رہے تھے۔ زیارت کرتے جایئے اور چلتے جایئے۔

قطار کسی صورت سے ختم ہی نہیں ہو پاتی تھی۔ ان کا چہرہ انور نور سے معمور تھا۔ ایک طرف آفتاب کی روشنی ان پر ــــ پڑ رہی تھی۔ دوسری طرف خود اس آفتاب کی تابانی لوگوں کی نگاہوں کو خیرہ کئے ہوئے تھی۔

کتنا شاہانہ سکون۔ کتنا درویشانہ جلال اور کتنا روحانی وقار تھا۔ سلمان اور میں ان کے سرہانے کھڑا اس منظر کو دیکھ رہا تھا۔ دھوپ سے بچانے کے لئے چادر کا ایک کونا پکڑے ہوئے تھا۔ تین طرف سے اور لوگ گھیرے ہوئے تھے۔ اس منظر کو دیکھ کر کلیجہ پھٹ رہا تھا۔ خیالات و جذبات کا سیلاب امنڈا آ رہا تھا۔ آنسو تھے کہ تھمتے نہ تھے۔ کلیجہ تھا کہ پھٹا جاتا تھا۔ لیکن نگاہیں تھیں کہ ان کے چہرۂ انور پر مرکوز تھیں کہ ے

جی بھر کے دیکھ لیں یہ جمال جہاں فروز ٭ پھر یہ جمال نور دیکھا نہ جائے گا

کبھی جی چاہتا کہ چیخ چیخ کر رو دوں۔ اور مہینوں کے بند شکووں کے کھول دوں۔

اے عم محترم! آج کیوں نہیں بولتے۔ دیکھئے آج کتنے آپ کے مشتاقان دید جمع ہیں۔ آپ نے کسی کو کبھی مایوس نہیں لوٹایا۔ آپ سے نصیحت سننے کے لئے لامتناہی سلسلہ کلمہ گویوں کا ٹوٹا پڑ رہا ہے۔ یہ تو وہی ہیں جن کے لئے آپ نے اپنے چین کو چین نہیں سمجھا۔ اپنی راحت کو راحت نہیں سمجھا یہ کسی غرض سے نہیں آتے تھے۔ یہ آپ سے محبت اور خلوص سے ملنے آتے ہیں۔ انجینیر صاحب کی آواز کانوں میں ہتھوڑے کی طرح پڑ رہی تھی۔

حلیم صاحب وائس چانسلر آئے۔ آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا گئیں۔ اور وہ گزر گئے۔ سابق وزیر یوسف ہارون، سابق وزیر پیش پیش تھے۔ سب۔ وزیرِ اعظم ان دنوں پنجاب میں علیل تھے۔ ان کا نمائندہ اور گورنر جنرل کا نمائندہ شریک تھا۔ خواجہ ناظم الدین باہر تھے۔ یہاں سے جنازہ اٹھا اور کئی فرلانگ کی مسافت طے کر کے اٹھارہ ہزار مربع گز زمین کا وہ وسیع رقبہ جس کے ایک طرف مولانا شبیر احمد کا مزار ہے وہاں پہنچا۔ ان کے مزار کے سامنے رکھا گیا۔ اور چونکہ اجازت ملنے میں دیر ہوئی اس لیے ابھی تک قبر تیار نہ تھی۔ مولانا عثمانی کے مزار پر مائیکروفون لگا دیا گیا تھا۔ شام کو ابوالخیر صاحب نے ایسی تقریر کی جس نے سب کو رُلا دیا۔

ان کی تقریر جذبات، خیالات اور معلومات سے لبریز تھی۔ آخری فقرہ تو ہمیشہ یاد رہیگا۔

انہوں نے کہا

اے سلیمان! تمہارے جانے کا اتنا غم نہیں ہے جتنا اس گنجینۂ علم کا صدمہ جو تمہارے ساتھ دفن ہو رہا ہے

اس کے بعد قبر تیار ہوئی

قبر کے اندر ایک طرف غلام محمد صاحب دوسری طرف میں اور میرے ساتھ صلاح الدین احمد صاحب ندوی اُترے

سلمان اوپر والے حصے میں کھڑے تھے

آہ! اس کے بعد میں نے اپنے ہاتھوں سے اپنے سب سے قیمتی سرمایہ کو زمین پر لٹا یا۔

آہ! جس کی نفاستِ طبع نے شکن بستر پر بے کلی محسوس کی، آج وہ اپنی خواب گاہ میں سو رہا

چہرہ کھول دیا گیا۔ پھر ڈھک دیا گیا۔

میرے بڑے ابا حکیم سید ابو حبیب صاحب کا نواسہ مصطفٰی بے تابانہ چیخا

اَرے میرے چھوٹے نانا کو ایک مرتبہ اور دکھلا دو

جس کو سردی گرمی سے ہوا سے لُو سے ہمیشہ بچایا جاتا تھا، وہ آج منوں مٹی کے اندر چھپا دیا گیا۔

میرے لیے ہر طرف تاریکی

ہر طرف اندھیرا

ہر طرف سناٹا تھا

اللہ بس باقی ہوس

ٹھیرے گا دل، تھمیں گے اشک

آہ! مگر، ابھی نہیں

نوٹس

دودھ کے تاجروں اور دوسرے متعلقہ لوگوں سے میرپورخاص اور دادو کے مویشی فارم کے دودھ کی خریداری کے لئے یکم اپریل ۱۹۵۴ء سے ۳۱ مارچ ۱۹۵۵ء کی مدت کے لئے سربمہر ٹنڈر مطلوب ہیں۔ دادو فارم کے دودھ کے لئے ٹنڈر کے سادہ فارم ایک روپیہ فی فارم کے حساب سے ڈپٹی ڈائرکٹر انیمل ہسبینڈری سندھ، میرپورخاص کے دفتر سے حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ سادہ ٹنڈر فارم اسسٹنٹ ڈائرکٹر انیمل ہسبینڈری (بریڈنگ اینڈ ریسرچ) دادو سے بھی ایک روپیہ فی فارم کے حساب سے حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ تمام ٹنڈر ڈپٹی ڈائرکٹر انیمل ہسبینڈری سندھ، میرپورخاص کے پتہ پر ۸ مارچ ۵۴ء کو ۳ بجے سہ پہر تک یا اس سے پہلے پہنچ جانے چاہئیں۔

۹ مارچ ۵۴ء کو ڈپٹی ڈائرکٹر انیمل ہسبینڈری (بریڈنگ اینڈ ریسرچ) سندھ، میرپورخاص ۱۲ بجے دوپہر اپنے دفتر میں ان ٹھیکیداروں کے سامنے کھولیں گے جو اس وقت وہاں موجود ہوں گے۔

منظور شدہ ٹنڈر ڈائرکٹر انیمل ہسبینڈری سندھ، کراچی کی تصدیق سے مشروط ہونگے

ٹنڈر بغیر کوئی وجہ بتائے قبول یا رد کیا جا سکتا ہے

ہر ٹنڈر کے ساتھ پانچ روپے نقد یا دستخط کنندہ ذیل کے نام رسیدی چالان بطور زر پیشگی بھیجنے چاہیئے۔ جن لوگوں کے ٹنڈر منظور کئے جائینگے انہیں حکومت کی آخری منظوری کے بعد ڈھائی ہزار روپے میرپورخاص فارم کے لئے اور مبلغ پانچسو روپے دادو فارم کے لئے بطور زر ضمانت مزید داخل کرنا ہونگے۔

دونوں سرکاری فارموں کے لئے ٹنڈر فارم الگ الگ بھرنا چاہئیں۔

(ایچ کے مغل)
ڈپٹی ڈائرکٹر انیمل ہسبینڈری
(بریڈنگ اینڈ ریسرچ) سندھ

(اشتہار نمبر ۸۶ ۱۹۵۴ء)

سید سلیمان — شبلی کی نظر میں

۱

ملازمت نے مجھے حیدرآباد کے آنے پر مجبور کیا، مولوی سلیمان چند روز تک میرے ساتھ رہتے تو اچھا ہوتا، وہ جوہر قابل ہیں،

شبلی نعمانی

۲۷ نومبر ۱۹۰۲ء حیدرآباد (مکتوب بنام سید عبدالحکیم)

۲

عزیزی،

تم نے اپنی حالت کے متعلق حجابانہ طریقہ میں اظہار خواہش کیا ہے، عزیزی کیا اس کے کہنے کی حاجت ہے، تم ہر وقت میری آنکھوں میں ہو، اور — میں موقع ڈھونڈھتا رہتا ہوں، لیکن اتنی جلد کون کامیاب ہو رہا ہے، میاں حمید اس لیاقت پر جو زمانہ کے موافق بھی تھی، کتنے دنوں کے بعد ٹھکانے لگے، خود میرا کیا حال ہوا، عمادی کس حالت میں ہیں،

سب سے پہلے موقع جو ملے گا، میں تم کو پیش کروں گا، بھوپال میں تو علم کی کوڑی برابر قدر نہیں، حیدرآباد میں شاید کوئی صورت نکلے، لیکن ابھی تم کو شہرت کے عام منظر پر زیادہ نمایاں ہو کر آنا چاہیے، لہٰذا وہ بھی ایک ذریعہ ہے، اور میں تو ہر جگہ تمہاری نقابت کرتا ہی رہتا ہوں، میں خود متفکر ہوں کہ موجودہ حالت میں بھی تم کو کیونکر زیادہ مالی فائدہ پہونچاؤں، والسلام

شبلی،

۳ فروری ۱۹۰۸ء

۳

عزیزی،

الندوہ عمادی کے ہاتھ میں دیدیا گیا، پہلی اپریل سے[1]

تم اپنی نسبت سر دست طے کرو۔ کہ اگر تم انگریزی واقعی محنت سے پڑھنا چاہو، اور دو برس تک مستقل پڑھو اور اس قدر پڑھ لو کہ اچھی طرح کتب بینی کرنے کے قابل ہو جاؤ تو تمہارے وظیفہ کا جس کی تعداد موجودہ معاوضہ کے برابر ہوگی، انتظام کیا جائے اور اگر مولویانہ کاہلی سرایت کر گئی ہے، تو اور کچھ صورت سوچی جائے،

شبلی،

۳۱ مارچ ۱۹۰۸ء

۴

عزیزی،

یہاں نئی آسامیاں تجویز ہوئی ہیں، اس میں میں نے تمہارے لئے تحریک کی ہے، لیکن اس تجویز کے جاری کرنے میں کم از کم سال بھر کی دیر ہوگی، ورنہ انشاءاللہ کامیابی کی بظاہر امید ہے، والسلام

شبلی، ۶ جولائی ۱۹۰۸ء، حیدرآباد

---

[1] چند ماہ کے بعد پھر واپس لے لیا گیا۔) [2] مکتوب عالیہ تعلیم سے فراغت پا چکا ہے اب کوئی خدمت چاہتا ہے اس کے متعلق تسلی بخش نہ جانے دیں!۔

۵

عزیزی،

دونوں پرچوں میں تمہارا مضمون بہت اچھا نکلا، اب تم کو تصنیفی سلیقہ آچلا، البتہ عبارت کی ابھی تک کمزوری باقی ہے، وہ بھی جاتی رہے گی، یہ ممکن ہے کہ تم کو مصر بھیجا جائے، اس لیے اگر تم کسی قدر انگریزی پڑھ لیتے تو تمہاری ترجیح کو کوئی شخص دبا نہ سکتا،

ہاں شذرات ضرور ہونا چاہیے،

شبلی،

۱۴ر فروری ۱۹۰۹ء

۶

عزیزی!

تمہارا کوئی خط نہ آیا، ناراض تو نہیں ہو؟ بلاغۃ الغرب[1] کے لیے نہ لکھا ہو[2] تو اب لکھ دو، اور الندوہ سے روپیہ لو ضرور بھول نہ جانا، اس کی بہت ضرورت ہے،

شبلی، ۳۰ مئی ۱۹۱۰ء،
کلکتہ

۷

عزیزی،

تمہارے مضمون تصحیح اغلاط پر ارباب علی گڈھ کس قدر چونکے، فوراً ایک کمیٹی قائم ہوئی اور مختلف کورسوں کی جانچ کے لیے مختلف کمیٹیاں قائم ہوگئیں، لیکن ندوہ کا ذکر نہیں، بلکہ بیان کیا گیا کہ یہ کام ہم پہلے سے کر رہے ہیں، خیر کام ہونا چاہیے، کہیں سے ہو، تاہم تمہارا دائرہ الگ ہے، وہ صرف گورنمنٹ کو مطلع کریں گے اور تم کو تصحیح سے تعلق ہے،

مولوی خلیل الرحمن صاحب کا خط آیا ہے کہ سید سلیمان تمہاری تربیت و تعلیم کا اصلی نمونہ ہیں، اس لیے وہ نماز نہیں پڑھتے، شاید فجر کی نسبت ان کا الزام صحیح ہو، مخالفین کو کیوں ایسا موقع دیتے ہو۔

شبلی، ۱۶۔ اگست ۱۹۱۰ء
اعظم گڈھ

۸

عزیزی!

یا تو سموم لکھنؤ میں جھلس رہا تھا یا یہاں بہشت کی ہوائیں آرہی ہیں، تمام دن اور تمام رات اس قدر ہوا کے جھونکے آتے رہتے ہیں کہ بیان نہیں ہوسکتا، شاید اب کی زیادہ رہوں!

ہاں اب الندوہ یوں چلتا نظر نہیں آتا، پھر تم اپنے ہاتھ میں لو، جو شرطیں پیش کروگے منظور کروں گا، مجھ کو الندوہ سے کوئی غرض نہیں، لیکن وہ درحقیقت ندوہ کا ایک اعلان ہے، اس کو مٹانا نہیں چاہیے۔

شبلی، ۲۹ مئی ۱۹۱۱ء،
بمبئی،

۹

عزیزی،

سلام مسنون، تم کو مفصل خط لکھا تھا، افسوس نہیں پہونچا، تعلق کرکے پوچھا گیا! اگر جائز ہے تو عارضی اور مستقل دونوں اور ناجائز ہے تو دونوں، بہرحال تم کو جو پسند ہو میں کیونکر اس کو ناپسند کرسکتا ہوں،

---

[1] الندوہ ج ۵ نمبر ۱۱ و ۱۲ مضامین ایمان بالغیب و معجزات القرآن۔ [2] ایک شخص نے مصر میں فرنچ لٹریچر کے عمدہ نمونوں کا عربی میں ترجمہ کیا ہے اسی کا نام بلاغۃ الغرب ہے۔ [3] بجائے کم لعبتان عظیم،

شبلی، ۹۔ جون ۱۹۱۳ء،
بمبئی

۱۰

عزیزی،

اخبارات مخالف میرے پاس نہیں آتے، وہ کیونکر ماتم کر رہے ہیں یعنی کس پہلو سے اپنے خیالات ظاہر کرتے ہیں،
ہاں وحید الدین[1] لکھنؤ سے تشریف لے گئے اور اودھ ۔ کثافت سے صاف ہو گیا، اخبارات میں بھی یہ ذکر آگیا ہے، حقیقت میں اودھ نجاستوں میں آلودہ ہو رہا تھا، حریت اور آزادی سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں، لیکن سفاہت اور حریت مختلف چیزیں ہیں۔

"شبلی" ۲۷۔ اگست ۱۹۱۳ء
"از بمبئی"

۱۱

عزیزی،

ار آباد گورنمنٹ نے "الہلال" کا پرچہ "مشہدِ کانپور"[2] قابل ضبطی قرار دیا ہے، اور حسن نظامی کا پمفلٹ بھی۔
شبلی، ۱۶ ستمبر ۱۹۱۳ء

۱۲ عزیزی،

بھائی جو آج تم نے جانا وہ ہمیشہ سے جانتا ہوں، تاہم کیا کیا جائے، خیر ملاقات[3] پر اظہار کھتا ہوں، تمہارے مشاغل کے متعلق پیر بھوں کا ایک مضبوط ایکم بنانی چاہیے،
سیرت کے تعلق چھوڑنے میں تم نے جلدی کی، استصواب سے پہلے وہاں تعلق کر لیا، خیر گذشت ہرچہ گذشت،
شبلی، ۷ نومبر ۱۹۱۳ء

۱۳ حیدرآباد

عزیزی،

سلام علیکم، خط پڑھ کر افسوس ہوا، کہ تم نے اتنی مدت کے بعد میری عقل، میری ہمدردی اور میرے متعلق خاطر کو یہیں تک سمجھا، کیا مجھ کو اتنی عقل نہ تھی کہ میں تم کو بلا کر زیر بار مصارف کرتا، کیا اتنی ہمدردی نہ تھی، کہ تم کو تکلیف نہ دیتا، کیا مجھ کو تم سے اتنا تعلق اور اتنی محبت بھی کہ اگر تم کو فائدہ نہ پہونچا سکتا تو تمہارا نقصان نہ کراتا،
بہر حال اب میں یہاں سے روانہ ہوتا ہوں، تم یہاں آجاتے تو بہت اچھا ہوتا کہ یہاں کے عمائد سے تمہاری خوب معرفی کرا دیتا، خیر یہ موقع تو نکل گیا، ایک اور کشش ہو رہی ہے جواب کا انتظار ہے، لکھنؤ پہونچ کر لکھوں گا۔
دو چار مہینہ کے لیے سیرت میں تمہاری ضرورت ہے، یوں تو ارادہ ہے، کہ سیرت کا سلسلہ مستقل قائم کر دیا جائے اور کم سے کم میری زندگی تک تو باقی رہے، لیکن بہر حال تم کو زیادہ رو کنا نہیں چاہتا،
پٹنہ سے عمدہ رسالہ نکالنا محال ہے، اچھی چھپائی کے بغیر سب بیکار ہے،

شبلی،
۲۸ نومبر ۱۹۱۳ء حیدرآباد

---

[1] گورنمنٹ کے حکم سے وہ مسلم گزٹ کی اڈیٹری سے علیحدہ کر کے لکھنؤ سے باہر گئے تھے، وہ اس وقت مولانا کے خلاف اپنے اخبار میں ایسے مضامین لکھ رہے تھے جو تہذیب سے باہر تھے۔ [2] مشہد اکبر کی سرخی سے مکتوب الیہ ہی کا لکھا ہوا مضمون الہلال کے لیڈنگ آرٹیکل میں واقعہ کانپور کی نسبت شائع ہوا تھا، تمام ملک نے اس مضمون کو نہایت پسند کیا اور اب تک اس کا نام بچہ بچہ کی زبان پر ہے، مضمون اس قدر پرجوش تھا کہ گورنمنٹ نے اسکو قابل ضبطی قرار دیا اور اسی جرم میں الہلال سے دو ہزار کی ضمانت طلب کی، مولانا کو یہ معلوم نہ تھا کہ وہ کس کا لکھا ہوا تھا۔ [3] یہ اسکے عہد کے مشہور مصلح اخبار نویس کی نسبت لے ہے جو دکن کالج پونہ کی اسسٹنٹ پروفیسری کی ہے

سید سلیمان اقبال کی نظر میں

(۱)

لاہور

۱۲ نومبر ۱۹۱۶ء

مخدومی، السلام علیکم

مجھے یہ معلوم تھا کہ آپ ملازمت کوئی قبول نہ کریں گے لیکن سنڈیکیٹ کے بعض ممبروں کی تعمیل ارشاد میں آپ کو لکھنا ضرور تھا کسی قدر خود غرضی کا
شائبہ بھی میرے خط میں تھا۔ اور وہ یہ کہ میں چاہتا تھا کہ جس طرح پنجاب والوں کو صوبہ متحدہ کے علماء فصحاء سے اس سے پیشتر فائدہ پہنچا ہے۔ اب بھی وہ سلسلہ
آپ کے یہاں رہنے سے بدستور جاری رہے مولانا شبلی مرحوم کی زندگی میں میں نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح مولانا مرحوم پنجاب میں مستقل طور پر اقامت
گزیں ہو جائیں، مگر مسلمان امرا میں مذاق علمی مفقود ہو چکا ہے میری کوشش بارآور نہ ہوئی۔ اللہ تعالیٰ دار المصنفین کے کام میں برکت دے اور
آپ کا وجود مسلمانوں کے لئے مفید ثابت کرے۔

آپ کی غزل لاجواب ہے، بالخصوص یہ شعر مجھے بڑا پسند آیا ؎

ہزار بار مجھے لے گیا ہے مقتل میں
وہ ایک قطرۂ خوں جو رگ گلو میں ہے

۲۸ اپریل ۱۹۱۸ء

مخدومی السلام علیکم

والا نامہ بھی ملا ہے، رموز بیخودی میں نے ہی آپ کی خدمت میں بھجوائی تھی، ریویو کے لئے سراپا سپاس ہوں۔
آج مولانا ابو الکلام کا خط آیا ہے۔ انہوں نے بھی میری اس ناچیز کوشش کو پسند فرمایا ہے۔ مولانا شبلی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد آپ استاذ الکل
ہیں۔ اقبال آپ کی تنقید سے مستفید ہو گا۔ اسرار خودی کا دوسرا ایڈیشن تیار کر رہا ہوں۔ عنقریب آپ کی خدمت میں مرسل ہو گی۔
رسالۂ صوفی" میں میں نے کوئی نظم شائع نہیں کی۔ کوئی پرانی مطبوعہ نظم انہوں نے شائع کر دی ہو گی۔ ورنہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ میں صوفی"
کو "معارف" پر ترجیح دوں "معارف" ایک ایسا رسالہ ہے جس کے پڑھنے سے حرارت ایمانی میں ترقی ہوتی ہے۔ میں انشاء اللہ ضرور آپ کے لئے
کچھ لکھوں گا، یہ وعدہ کچھ عرصہ ہوا میں نے آپ سے کیا تھا اور میں اس وقت تک پورا نہیں کر سکا۔
امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہو گا

۱۰ مئی ۱۹۱۸ء

مخدوم مکرم جناب قبلہ مولوی صاحب السلام علیکم

"معارف" میں ابھی آپ کا ریویو مثنوی رموزِ بیخودی پر نظر سے گزرا ہے، جس کے لئے سراپا سپاس ہوں۔ آپ نے جو کچھ فرمایا ہے وہ میرے لئے سرمایۂ افتخار ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔

صحتِ الفاظ و محاورات کے متعلق جو کچھ آپ نے لکھا ہے ضرور صحیح ہوگا، لیکن اگر آپ ان لغزشوں کی طرف بھی توجہ فرماتے تو میرے لئے آپ کا ریویو زیادہ مفید ہوتا۔ اگر آپ نے غلط الفاظ و محاورات نوٹ کر رکھے ہیں تو مہربانی کر کے مجھے اُن سے آگاہ کیجئے کہ دوسرے ایڈیشن میں ان کی اصلاح ہو جائے۔

غالباً آپ نے "رموزِ بیخودی" کے صفحات پر ہی نوٹ کئے ہوں گے۔ اگر ایسا ہو تو وہ کاپی ارسال فرما دیجئے، میں دوسری کاپی اس کے عوض میں آپ کی خدمت میں بھجوا دوں گا۔

اس تکلیف کو میں ایک احسان تصور کروں گا۔ اُمید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔

مخلص محمد اقبالؔ لاہور

دوسری دسمبر ۱۹۱۸ء

مخدومی، السلام علیکم

والا نامہ مل گیا ہے، حالات معلوم ہونے پر طبیعت بہت متاثر ہوئی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اطمینانِ قلب عطا فرمائے۔ آپ کا یہ فقرہ کہ "میرے ساتھ خدا کا معاملہ عجیب ہے" گویا تمام ملتِ مرحومہ کے احساسات کا ترجمان ہے۔ جو قوم ایک مشن لے کر پیدا ہوئی ہے اس کی رُوحانی تربیت کے لئے ابتلا کے سوا اور کوئی ذریعہ نہیں۔ ایک انگریزی مصنف جسے ابتلا کے دُوررس نتائج کا تجربہ ہو چکا ہے لکھتا ہے کہ وہ "دکھ دیوتاؤں کی ایک رحمتِ عظیم ہے تاکہ انسان زندگی کے ہر پہلو کا مشاہدہ کر سکے" آپ اُمتِ محمدیہ کے خاص افراد میں سے ہیں اور اس مامور من اللہ قوم کے خاص افراد کو ہی امراض ودیعت کیا گیا ہے۔ فرقہ وہابیہ میں آجائیے، جس حقیقت کو آپ زیرِ پردہ دیکھ چکے ہیں اُس کی بے نقابی کا زمانہ قریب ہے۔ انشاء اللہ

"زمانہ باز بیفروخت آتش نمرود
کہ بے نقاب شود جوہر مسلمانی"

شخصی اعتبار سے مجھے آپ کے ساتھ حد درجہ ہمدردی ہے یقین جانیئے کہ آپ کے الفاظ نے میرے دل پر سوزو گداز کی کیفیت طاری کر دی اور میں دست بدعا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو آلام و مصائب میں استقامت عطا فرمائے۔

ہاں ترجمہ کی داد دیتا ہوں، لٹریری اغراض کے لئے یہ ترجمہ نہایت عمدہ ہے میرے خیال میں اس سے بہتر الفاظ نہ مل سکیں۔ البتہ فلسفیانہ اغراض کے لئے شاید اور الفاظ وضع کئے جائیں تو بہتر ہوگا۔

مخدومی، السلام علیکم

سیرۃ عائشہؓ کے لئے سراپا سپاس ہوں، یہ ہدیہ سلیمانی نہیں سرمۂ سلیمانی ہے۔ اس کتاب کو پڑھنے سے میرے علم میں بہت مفید اضافہ ہوا خدا تعالیٰ جزائے خیر دے۔

یہ معلوم کر کے تعجب ہوا کہ "حمیرا" والی سب احادیث موضوعات میں ہیں، کیا "کلمینی یا حمیرا" بھی موضوع ہے؟ کمال کا شعر کیا مزے کا ہے

ایں تصرف ہائے من در شعر من
کلمینی یا حمیرائے من است

۱۱ اکتوبر ۱۹۱۹ء

"مخدومی" "السلام علیکم"

نوازش نامہ ملا۔ عنوان جو آپ نے تجویز کیا ہے ٹھیک ہے تبصرہ کے متعلق میں بھی یہی مشورہ دوں گا کہ میرا مجموعہ شائع ہو لے تو لکھئے فی الحال میں ایک مغربی شاعر کے دیوان کا جواب لکھ رہا ہوں جس کا قریباً نصف حصہ لکھا جا چکا ہے، کچھ نظمیں فارسی میں ہوں گی کچھ اُردو میں، کلام کا بہت سا حصہ نظرِ ثانی کا محتاج ہے، لیکن اور مشاغل اتنی فرصت نہیں چھوڑتے کہ ادھر توجہ کر سکوں، تاہم جو کچھ ممکن ہے کرتا ہوں، شاعری میں لٹریچر... کبھی میرا مطمح نظر نہیں رہا کہ فن کی باریکیوں کی طرف توجہ کرنے کے لئے وقت نہیں، مقصود صرف یہ ہے کہ خیالات میں انقلاب پیدا ہو۔ اور بس اس بات کو مدِنظر رکھ کر جن خیالات کو مفید سمجھتا ہوں اُن کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہوں، کیا عجب کہ آئندہ نسلیں مجھے شاعر تصور نہ کریں، اس واسطے کہ آرٹ (فن) غایت درجہ کی جانکاہی چاہتا ہے، اور یہ بات موجودہ حالات میں میرے لئے ممکن نہیں، جرمنی کے دو بڑے شاعر بیرسٹر تھے یعنی گوئٹے اور اوہلنڈ گوئٹے تھوڑے دن پریکٹس کے بعد ویمر کی ریاست کا تعلیمی مشیر بن گیا اور اس طرح فن کی باریکیوں کی طرف توجہ کرنے کا اُسے پورا موقع مل گیا، اوہلنڈ تمام عمر مقدمات پر بحث کرتا رہا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت تھوڑی نظمیں لکھ سکا اور وہ کمال پُورے طور پر نشوونما نہ پا سکا جو اس کی فطرت میں ودیعت کیا گیا تھا، غرض یہ کہ موجودہ حالات میں میرے افکار اس قابل نہیں کہ ان کی تنقید کے لئے سید سلیمان کا دل و دماغ صرف ہو لیکن اگر احباب تبصرہ پر مصر ہیں تو یہی بہتر ہے کہ مجموعہ کا انتظار کیا جائے، اس کے علاوہ میں اپنے دل و دماغ کی سرگذشت بھی مختصر طور پر لکھنا چاہتا ہوں، اور یہ سرگذشت کلام پر روشنی ڈالنے کے لئے نہایت ضروری ہے، مجھے یقین ہے کہ جو خیالات اس وقت میرے کلام اور افکار کے متعلق لوگوں کے دلوں میں ہیں اس تحریر سے ان میں بہت انقلاب پیدا ہو گا۔

کاش "ماجوج ماجوج" پر آپ کوئی مضمون لکھتے"۔ امر تحقیق کا محتاج ہے۔

۵ جولائی ۱۹۲۲ء

مخدومی، السلام علیکم

پیامِ مشرق پر جو نوٹ آپ نے معارف میں لکھا ہے، اُس کے لئے سراپا سپاس ہوں۔

پروفیسر نکلسن کا بھی خط آیا ہے اُنہوں نے اسے بہت پسند کیا ہے، اور غالباً اس کا ترجمہ بھی کریں گے، وہ لکھتے ہیں کہ یہ کتاب جدید اور بخیل خیالات سے مملو ہے اور گوئٹے کے دیوانِ مغربی کا قابلِ تحسین جواب ہے۔ مگر میرے لئے آپ کی رائے پروفیسر نکلسن کی رائے سے زیادہ قابلِ افتخار ہے۔

سید نجیب اشرف صاحب نے اپنے مضمون میں محمد داراں کے لطیفۂ غیبیہ کا ذکر کیا ہے۔ یہ چھوٹی سی کتاب ہے اور میں نے ایران سے منگوائی ہے۔ اگر وہ یا آپ اُسے دیکھنا چاہیں تو بھیج دوں۔ ندوے والے اُسے دیکھیں گے تو کوئی نہ کوئی بات پیدا کریں گے۔

اب کہ انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسہ پر آپ سے ملنے کی توقع تھی۔ میں اسی خیال سے جلسہ میں گیا کہ آپ کو اپنے ہاں مہمان کرنے کے لئے لیتا آؤں گا۔ مگر جلسہ میں جا کر مایوسی ہوئی۔ انشاء اللہ پھر کوئی موقع پیدا ہو گا۔ کیا تفہیماتِ الٰہیہ چھپ گئی ہے؟ اُمید کہ آپ کا مزاج بخیر ہو گا۔ والسلام

۲۲ اگست ۱۹۲۲ء

مخدومی جناب مولانا۔ السلام علیکم

نوازش نامہ ابھی ملا ہے، جس کے لئے بہت شکر گذار ہوں جتنی آگاہی آپ نے دے دی ہے وہ اگر زمانہ فرصت دے تو باقی عمر کے لئے کافی ہے۔

۱۴، مئی ۱۹۲۲ء

مخدومی، السلام علیکم

والانامہ ملا، جس کے لئے سراپا سپاس ہوں۔

رویتِ باری کے متعلق جو استفسار میں نے آپ سے کیا تھا اس کا مقصود فلسفیانہ تحقیقات نہ تھی، خیال تھا کہ شاید اس بحث میں کوئی بات ایسی نکل آئے جس سے آئن سٹائن کے انقلاب انگیز نظریہ نور پر کچھ روشنی پڑے۔ اس خیال کو ابن رشد کے ایک رسالہ سے تقویت ہوئی جس میں انہوں نے ابوالمعالی کے رسالہ سے ایک فقرہ اقتباس کیا ہے۔ ابوالمعالی کا خیال آئن سٹائن سے بہت ملتا جلتا ہے، گو مقدم الذکر کے ہاں یہ بات محض ایک قیاس ہے۔ اور موخرالذکر نے اُسے علم ریاضی کی رُو سے ثابت کر دیا ہے۔

اگرچہ یورپ نے مجھے بدعت کا چسکا ڈال دیا ہے تاہم مسلک میرا وہی ہے جو قرآن کا ہے اور جس کو آپ نے آیت شریفہ کے حوالے سے بیان فرمایا ہے۔ خلافت پر جو مضامین آپ نے لکھے نہایت قابل قدر ہیں۔ ان سب کو ایک علیحدہ رسالے کی صورت میں شائع ہونا چاہیئے۔

والسلام مخلص محمد اقبال

۲۴-اپریل ۱۹۲۶ء

مخدومی، السلام علیکم

آپ اپنے نوازش نامہ کی طوالت کے لئے عذر خواہی کرتے ہیں مگر میرے لئے یہ طویل خط باعث خیر و برکت ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے میں نے اسے کئی دفعہ پڑھا ہے اور گذشتہ رات چودھری غلام رسول مہر سے بھی پڑھوا کر سُنا اور احباب بھی اس مجلس میں شریک تھے۔ اگر میری نظر اس قدر وسیع ہوتی جس قدر آپ کی ہے تو مجھے یقین ہے کہ میں اسلام کی کچھ خدمت کر سکتا۔ فی الحال انشاءاللہ آپ کی مدد سے کچھ نہ کچھ لکھوں گا

۱۰ ستمبر ۱۹۳۳ء

مخدومی جناب مولانا، السلام علیکم

شاہ افغانستان آپ سے تعلیم مذہبی کے بارہ میں مشورہ چاہتے ہیں۔ شاید اسی ماہ ستمبر میں آپ کو کابل سے دعوت آئے۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کیا آپ جانے کے لئے تیار ہوں گے، ممکن ہے کہ سید راس مسعود اور اقبال بھی آپ کے ہمراہ ہوں۔ اُمید کہ آپ کا مزاج بخیر ہو گا۔

جواب کا انتظار ہے۔

۱۷ ستمبر ۱۹۳۳ء

مخدومی، السلام علیکم

مسلمانوں کا مغرب زدہ طبقہ نہایت پست فطرت ہے میں نے آغا خاں کو باوجود اُن کی تمام کمزوریوں کے ان سب سے بہتر مسلمان پایا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مدت سے ان کے مذہبی خیالات میں ایک انقلاب عظیم آ رہا ہے۔

زیادہ کیا عرض کروں سوائے التماس دُعا کے والسلام

۹۔ دسمبر ۱۹۳۳ء

مخدومی، السلام علیکم

عمر خیام پر آپ نے جو کچھ لکھ دیا ہے، اُس پر اب کوئی مشرقی یا مغربی عالم اضافہ نہ کر سکے گا۔ الحمدللہ کہ اس بحث کا خاتمہ آپ کی تصنیف پر ہُوا!

اُمید کہ جناب کا مزاج بخیر ہو گا!

مخدومی جناب مولانا، السلام علیکم

آپ کا نوازش نامہ ابھی ملا ہے۔ تلخیص کے لئے نہایت شکر گزار ہوں، مگر اسے پڑھ کر میرے دل میں ایک خیال یا سوال پیدا ہوا ہے، جس کا پوچھنا ضروری ہے

میں نے زمان و مکان کے متعلق تھوڑا سا مطالعہ کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے بڑے بڑے مسائل پر غور و فکر کیا ہے اور اس غور و فکر کی تاریخ لکھی جا سکتی ہے۔ یہ کام صرف آپ ہی کر سکتے ہیں۔ میرے خیال میں آپ کو چاہیئے کہ اس کام کو اپنی زندگی کے اہم مقاصد میں شمار کریں۔

جواب کا انتظار رہے گا! والسلام

مخلص محمد اقبال

سید سلیمانؔ، محمد علی جوہرؔ کی نظر میں

۱ ۱۰ اگست ۱۹۱۸ء

چھنڈواڑہ (ممالک متوسط)

برادرم سید سلیمان صاحب ۔ السلام علیکم

اگر آپ کو پہلے سے بھی اس کا کافی احساس نہ تھا کہ میں سیرت نبوی کے لئے عرصے سے بے قرار ہوں تو کم سے کم یہاں تشریف لانے کے بعد تو قطعی طور پر اس کا احساس ہوگیا ہوگا بلکہ میں نے ایک سے وعدہ لے لیا تھا کہ اگر مکمل نہیں تو اجزا ہی ارسال کر دیئے جائیں گے۔ اگر اس پر بھی آپ کو میری بے قراری میں شک ہے تو میں دربار نبوی میں ازالہ حیثیت عرفی کی نالش دائر کروں گا۔ آپ کے جانے کے بعد سے کل تک برابر انتظار تھا کیا اور مجھ جیسے کاہل اور خط لکھنے میں چور نے بھی فیصلہ کر لیا تھا کہ ایک عریضہ ارسال خدمت کروں۔ آج صبح کے لئے ارادہ مصمم تھا کہ کل شام ہی معارف دیکھنے میں آیا اور سیرت کی پہلی جلد تیار ہو جانے کا مژدہ سنا۔ اب بھی اگر آپ ایک جلد ارسال نہ فرمائیں گے تو یقین کیجئے کہ میں رسیاں تڑا کر خود اعظم گڑھ آ کودوں گا اور دار المصنفین میں وہ ہڑبونگ مچاؤں گا کہ آپ حضرات اہل قلم کی محبوب یک سوئی کا خاتمہ ہو جائے گا اور اعظم گڑھ کی آنکھیں محاذ مغربی سے زیادہ آتشبازی سے خیرہ اور اعظم گڑھ کے کان اس سے کہیں زیادہ گولوں کے پھٹنے کی آوازوں سے بہرہ ہو جائیں گے۔ خیر یہ لاف و گزاف تو ہوتا ہی رہے گا اب عرض یہ ہے کہ براہ کرم ایک جلد قسم دوئم بذریعہ وی۔ پی پارسل ارسال فرما دیجئے۔

آپ کا نیاز مند

محمد علی

۲ ۸ ذی الحجہ ۱۳۳۷ھ

مطابق ۴ ستمبر ۱۹۱۹ء

جیل خانہ بیتول

برادرم سید سلیمان صاحب - - - - - - - - السلام علیکم و علی من لدیکم

معارف کے پرچے جلد بندھوانے کے لئے رکھے تھے (آپ یہ انتظام کیوں نہیں کر لیتے کہ ایک ہی نمونے کی جلدیں بندھوانے کے لئے مشتاقین کو اطلاع دیدیں کہ اس قیمت پر دار الاشاعت میں مع فہرست مضامین کے بندھ سکے گی جس کو بندھوانا منظور ہوگا پرچے روانہ کر دے گا) بہرکیف چھنڈواڑہ میں یہ کام نہ ہو سکا تھا، پرچے گھر چلے گئے تو خوف ہوا کہ کہیں ضائع نہ ہو جائیں۔ اس لئے یہاں منگا لئے۔ پہلی بار آئے تو کوئی بیس پرچے تین سالوں کی جلدوں کے غائب! گھبرا کر پھر لکھا، معلوم ہوا کہ نوکر کے گھر پر نہ ہونے سے گھبراہٹ میں ایک صندوق میں دیکھنا بھول گئے تھے۔ اس بار اور پرچے بھی روانہ کر دیئے مگر اب بھی چند پرچے سال گزشتہ کے کم ہیں اور ایک سال دوئم کا۔ وجہ یہ ہوئی کہ سال گزشتہ رواں تھا۔ اس لئے کچھ پرچے میرے کمرے میں تھے۔ کچھ بھائی کے کمرے میں۔ خانہ تلاشی میں گڑبڑ ہو گئے (جی ہاں یہ بھی ہوا تھا)

لی محتسب نے گھر کی تلاشی تو کیا ہوا
نکلا سبوئے کہنہ میں سرکہ بھرا ہوا

اب معارف کے ساتھ فہرست مضامین مجلد سوئم آئی تو ضروری ہو گیا کہ سب پرچے جمع کروں اور تفتیش سے پیشتر جلد بندھوا لوں، مگر ایک تو آپ

سے التماس کرتا ہے اور سینکڑوں آپ لوگوں کو گالیاں دیتا ہیں۔ التجا تو یہ ہے کہ حسب ذیل پرچے جو اس وقت نہیں ملتے ارسال فرمائیے جس وقت مل گئے واپس کر دوں گا۔

مجلد دوم۔ عدد یازدہم

مجلد سوم۔ عدد ہائے سوم، ششم، ہشتم، نہم، دہم، یعنی کل ۶ عدد۔ مزید مرحمت ہوں!

اب گالیوں کی فہرست سنیئے: آپ حضرات انڈکس پوری تفصیل کے ساتھ مرتب کرنا اب تک کیوں نہیں سیکھتے! انڈکس تو انڈکس فہرست بھی درست نہیں ہوتی، شکر ہے کہ معارف نے مجلد سوم کی ایک فہرست مرتب کی ہے مگر سہل انکاری ظاہر ہے۔ حروف تہجی کے حساب سے مضامین کی علیحدہ فہرست ہوتی اور اور لکھنے والوں کی علیحدہ۔ خیر غنیمت ہے کچھ تو ہے مگر مجلد اول و دوم اس سے بھی محروم ہیں اور مزید لطف یہ ہے کہ میں نے ارادہ کیا کہ ہر عدد کی فہرست علیحدہ کرکے شروع میں لگا دوں تو معلوم ہوا "خانہ خست خراب" فہرست کی پشت پر شذرات موجود ہیں۔ یہ مجبوری اپنی سستی رفع کروں گا اور بارہ فہرستیں قلمی تیار کروں گا۔ تب جاکر جلد بندھنے کی نوبت آئے گی بہر کیف اتنی گالیوں کے صلہ میں ۶ عدد جو اس وقت نہیں ملتے مرحمت ہوں تا کہ جلدیں بندھوالی جائیں۔ اب تک میرے متعدد انگریزی رسالوں کی جلدیں نہیں بندھی ہیں اور ممکن ہے کہ میرے عزیز دوست اور سارق کتب سید جالب صاحب ان میں سے اکثر پر قبضہ بھی کر بیٹھے ہوں، یہ شرف خاص معارف کو حاصل ہوگا کہ مجلدات تیار کرالیں جائیں گی، گو تین سال ہی کیوں نہ ہو۔

ایک التجا اور بھی ہے اور وہ پہلے بھی کر چکا ہوں کہ ایک پروف سیرۃ النبی کی دوسری جلد کا مجھے بھی عنایت ہوتا رہے۔ انشاء اللہ ترجمہ بلکہ انگریزی قارئین کے مذاق کے مطابق، ترتیب سیرۃ از سر نو کروں گا۔ میرا ارادہ مصمم ہے کہ سیرۃ کو انگریزی قالب میں ہی ڈھالوں، یہ کچھ تو بہ طریق تشکر استاذی و مولائی مرحوم ہوگا اور کچھ توشۂ آخرت کا انتظام۔

آپ کا مخلص صادق
محمد علی

۳

برادرم مکرم و محترم! السلام علیکم!

بجا ہے یہ تعویق تو ہم لوگوں پر جبر ہے۔ کب ایسی کتابوں کے بکنے میں دقت پیش آتی ہے؟ ارض القرآن جیسی کتاب کے لیے تو ہر تعلیم یافتہ مسلمان کو جس کی آمدنی سو روپیہ ماہوار۔ بکی ہے کم از کم ۲۵ روپیہ دینا ضروری ہے اور سیرۃ کے لیے تو ہر شخص کو ایک ماہ کی آمدنی دینا لازمی ہے، ہم لاکھ نادار سہی مگر اتنے نادار بھی نہیں ہیں کہ سال میں ۲۰، ۲۵ روپیہ ایسی کتابوں کی خریداری کے لیے نہ نکال سکیں!

دعاگو اور خیر طلب،
محمد علی

۴　　۲۴ دسمبر ۱۹۱۹ء

مسعود علی ندوی کے نام

جیل خانہ بیتول

برادر عزیز! السلام علیکم و علی من لدیکم

سلیمان صاحب کے خط کا اب تک انتظار ہے۔ مگر شکایت نہیں کیوں کہ اس عرصے میں میں نے ارض القرآن کی دوسری جلد بھی ختم کر ڈالی اگر لفظ "بھی" بالکل صحیح نہیں ہے کیونکہ بد قسمتی سے جلد اول اب تک پوری ختم نہیں ہوئی اور غلطی سے گھر چلی گئی ہے اور اب تک واپس نہیں آئی ہے۔ سلیمان صاحب اسی طرح کتابیں لکھتے رہیں اور ساری عمر بھی خط نہ لکھیں۔ تب بھی شکایت کا موقع نہ ہوگا، بلکہ مشکوریت کا سلسلہ جاری رہے گا۔

تمہارا خیر طلب بھائی
محمد علی

سید سلیمان، گاندھی جی کی نظر میں

سیواگرام وردھا۔ سی۔ پی

بھائی صاحب

۱۲-۲-۴۰

۲۶، ۲۷۔ فروری کو ہندوستانی پرچار سبھا کی

کانفرنس ہوگی، میں چاہتا ہوں کہ آپ بھی اس

میں شریک ہوں، اور اس سوال کے سلجھانے میں

حصہ لیں مجھے آشا ہے کہ آپ ضرور آویں گے۔

آنے کی تاریخ اور وقت سے خبر دیں گے۔　آپ کا

م۔ک۔ گاندھی

سید سلیمان ——— موتی لال نہروؒ کی نظر میں !

آنند بھون الہ آباد

۱۶ر اکتوبر سنہ ۲۸ء

مکرمی جناب سید صاحب تسلیم

جو طوفان بے تمیزی اس وقت برپا ہے اس کے انسداد کے لئے آپ کی امداد کی سخت ضرورت ہے، آپ کی امداد کے دو مواقع جلد پیش آنے والے ہیں، ایک تو کانفرنس جو ۲۷ر اکتوبر کو منعقد ہوگی اور دوسری اس کے بعد ۳ر نومبر سے ۶ر نومبر تک ایک مرتبہ دہلی کا سفر اختیار کرنا۔ پہلے موقع پر سُنا جاتا ہے مجمع کثیر ہوگا، اور ہر خیال کے اصحاب موجود ہونگے، وہاں اگر اچھی فضا قائم ہوگئی تو نہایت مفید ہوگا، دہلی میں آل انڈیا کمیٹی کی میٹنگ ہے، اور اس کے ساتھ ہی کانفرنس کمیٹی کی بھی میٹنگ ہوگی، وہاں جماعت علماء سے ضرور گفتگو کی نوبت آویگی۔ ان اصحاب کا جواب ہمارے پاس سوا آپ کے اور مولانا ابوالکلام آزاد کے. اور نہیں ہے، مولانا ابوالکلام آزاد صاحب ضرور موجود ہوں گے، لیکن آپ کی موجودگی بھی لازمی ہے، تکلیف تو ہوگی مگر بالفعل اس معاملہ سے زیادہ اہم کوئی قومی معاملہ نہیں ہے، اور میں امید کرتا ہوں کہ آپ اس تکلیف کو ضرور برداشت فرمائیں گے اور رپورٹ جو ۲۳ر کو شائع ہوگی، فوراً ابلاغ خدمت ہوگی۔

مخلص
موتی لال نہرو

سید سلیمان — راجندر پرشاد (صدر جمہوریہ ہند) کی نظر میں

جناب مولانا صاحب

تسلیم و تعظیم — آپ کو اس بات کی خبر ہوگی کہ کچھ عالموں نے ایک نظم اس لئے بنایا ہے کہ اپنے ملک کی صحیح تاریخ ترتیب دیویں، اس نظم کے ناظم اور اس کی روح شری جے چندر جی ودیالنکار ہیں، جنہوں نے جدوجہد کر کے آغاز کی کارروائی کرلی ہے، مگر اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اس نظم کی ایک بیٹھک بلائی جائے، اور کارروائی آگے بڑھانے کے لئے انتظام کیا جائے، اس نظم کا نام ہے اکیڈیمی آف ہسٹری اور ہندی میں اسے اتہاس پریشد اردو میں انجمن تواریخ کہتے ہیں، اب تک جو علماء اس اکیڈیمی میں شریک نہیں ہوتے ہیں اُس میں ان کو شامل کرنا ضروری ہے۔ اس خیال سے اس کے ممبروں نے جن علماء کو نوید دینے کا ارادہ کیا ہے۔ اس میں آپ کا بھی نام ہے۔ اکیڈیمی کو امید ہے کہ اس میں آپ کی شرکت سے بڑی مدد ملے گی، ناظم صاحب جے چندر جی کو میں نے لکھ دیا ہے کہ آپ کے پاس انجمن کے قواعد و ضوابط اس کے اصول اور اس کی رپورٹ اب تک انجام دیتے ہوئے کام آپ کے پاس بھیج دیویں۔ جناب ان کو ملاحظہ فرما کر اپنی شرکت اور مدد کی پروانگی دے سکیں گے۔

آپ کا خاکسار بندہ

راجندر پرشاد

سیّد سلیمانؒ ـــــ ابوالکلام آزادؔ کی نظر میں

Alhalal Office
MCLEOD STREET
CALCUTTA
۲۷ر جنوری ۱۹۱۵ء

عجبت لمن یقول ذکرت اسفی
وھل انسی فاذکر من ھویت

صدیقی العزیز الاجل

کل صبح سفر سے واپس آیا اور خط پڑھا، یہ آپ نے پہلے شکایت اس لئے تو نہیں کر دی تاکہ میرے لئے شکایت کا موقع نہ رہے

بینی وبینک فی المحبّة نسبة ــــ مستورة من اھل ھذا العالم
نحن اللذان ان تفارقت ارواحنا ــــ من قبل خلق اللہ طینة آدم

خط سے غالباً مقصود وہ خط ہوگا جو آپ نے بھوپال سے لکھا تھا۔ اس کے جواب میں ایک نہایت مفصل خط جس میں متعدد ضروری امور تھے اعظم گڈھ کے پتے سے لکھا، اور آج تک اس کے جواب کے لئے ترستا ہوں، اب آپ نے خط لکھا تو جواب کی جگہ الٹی شکایتیں ہیں ـــــ ۔ بہرحال مجھے ہر حال میں اپنا رفیق دمخلص یقین کیجئے، اور ہر دم خدمت گزاری کے لئے تیار ـــــ افسوس ہے کہ ملاقات کی صورت پیدا نہیں ہوتی، کاش اللہ یکجائی کا سامان کرتا، تو تیں مجتمع ہوتیں اور تفرق اور عدم توحد نے ان نتائج سے بھی محروم کر دیا ہے جو بایں ہمہ بے سروسامانی حاصل ہو سکتے تھے ـــــ دارالمصنفین نہایت آسانی کے ساتھ ایک وسیع النتائج چیز بن سکتا ہے اور یہ وہ کا حقیقی بدل بل نعم البدل اصلی کام وہی ہے باقی سب کے سب فروعی ہیں آپ کی زندگی کا اصل مقصد یہ ہونا چاہئے کہ آدمی پیدا ہوں۔

اس لئے میں نے لکھا تھا کہ ایک اچھے موقع کو ضائع کیا گیا اور بیگم صاحبہ[1] کے سامنے وسعت و اہمیت کے ساتھ اس چیز کو پیش نہیں کیا گیا، میں نے باوجود سخت موانع کے ارادہ کیا تھا کہ صرف اسی کی خاطر خود بھوپال آؤں۔

اس کا مرکز قطعاً لکھنؤ ہونا چاہئے یا اعظم گڈھ ہو۔ مگر ایک وسیع شاخ لکھنؤ میں ہو۔ میں نے طریق عمل اور

---

[1] نواب سلطان جہاں بیگم والئہ بھوپال۔

اصول کار کو اسی زمانہ میں بصورت اسکیم قلمبند کر لیا تھا اور وہ موجود ہے —

میں اواخر جنوری میں پھر نکلوں گا اور کوشش کروں گا کہ فاتحہ کے لئے اعظم گڈھ حاضر ہوں، بصورت دیگر آپ کو اطلاع دوں گا کہ نسبتہً کسی قریب تر مقام پر ملاقات ہو سکے، مولانا عبدالسلام امید ہے کہ بخیر ہوں گے۔ سلام شوق

ابو الکلام

خط لکھکر جب پتہ دیکھا تو معلوم ہوا کہ آپ اعظم گڑھ میں نہیں بلکہ پونا میں ہیں، اب سمجھ میں نہیں آتا کہ ملاقات کیونکر ہوں، بہر حال آپ حلیہ بحسبوئی اختیار کرلیں یہ بہتر ہے، ایک ملاقات آپ سے بہت ضروری ہے کوئی طریقہ بتلائیں۔

مکرمی، السلام علیکم

دار المصنفین کا پراسپکٹس پہنچا، آپ مجھے اس سلسلہ میں جو کچھ بنانا چاہیں منظور ہے آنریری فیلو تو ایک عمدہ بات ہے اگر اس میں کوئی جگہ قلی کی ہو جب بھی میں منظور کر لوں گا، بشرطیکہ کام ہو اور مجمع صحیح و خالص۔

ابو الکلام

صدیقی الجلیل الاعز، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

والانامہ گرامی پہنچا، مجھے تو خوف تھا کہ کہیں آپ پونا سے روانہ نہ ہو گئے ہوں۔

امثال القرآن کے متعلق آپ نے جو کچھ لکھا ہے بالکل درست ہے، یعنی حالات وقت نزول وطرق تمثیل و بیان عرب جاہلیہ، یہ دو چیزیں نہ صرف امثال القرآن بلکہ تمام قرآن کے فہم و درس کے لئے بمنزلہ اساس و اصل کے ہیں۔ امثال و اقسام و انواع بیان و تخاطب و تذکیر کے لئے تو اولین نظر انھیں پر ہونی چاہیئے۔

عرصہ کے بعد مولوی عبدالباری کا تذکرہ سننے میں آیا، وہ کشمیر میں تھے، اور انگریزی کی فکر میں، معلوم نہیں، اس کی تکمیل کا انھیں موقع کہاں تک ملا۔

دار المصنفین کے دائرہ کو جس قدر تنگ رکھیئے گا اسی قدر وہ حقیقی اور عملی ہوگا، دو چار آدمی اچھے کام کر سکتے ہیں لیکن مجمع جہلا بیکار ہے، بڑی چیز یہ ہے کہ آئندہ ایسے نمونے قائم کئے جائیں جن میں حقیقت ہو اور رسم پرستی و رسم سے احتراز کیا جائے، آپ دار المصنفین کو اس کا پہلا نمونہ بنائیے۔ مولانا عبدالسلام کو شوق سلام

فقیر ابو الکلام کان اللہ لہٗ

صدیقی العزیز السلام علیکم

معافی خواہ ہوں، جواب میں بہت تاخیر ہوئی لیکن بلا عذر نہ تھی، مولوی مسعود علی صاحب نے ازراہ عنایت سیرت وغیرہ بھیجدیں جس کے لئے شکر گزار ہوں، دار المصنفین سے تحائف تو ہمیشہ پہنچتے ہیں، لیکن کبھی کوئی بل نہیں آیا آخر آپ نے کوئی سالانہ یا ماہوار فیس تو رکھی ہوگی۔

جلسہ کے موقع پر ملاقات کی امید تھی مگر پوری نہ ہوئی تِلْکَ الاَیَّامُ نُدَاوِلُهَا آپ کے ہموم و غموم کا حال پڑھکر بہت افسوس ہوا، مجھے یہ تفصیل معلوم نہ تھی لیکن آپ کی شاعرانہ مایوسیوں سے متفق نہیں ہوں، اوائل حوادث میں ایسے ہی احساسات ہوتے ہیں لیکن فَاِنَّ مَا تَحْذَرِیْنَ قَدْ وَقَعَ کے بعد خود بخود طبیعت سکون پذیر ہو جاتی ہے، آپ نے لکھا کہ معنوی مادی زندگی کا خاتمہ ———— ہو گیا

زندگی کے لئے مادی سروسامان و محرکات ناگزیر ہیں اور نیز بقول آپ کے چاک دامنی کے لئے ایام گل کا اشارہ تو بتدریج خود ہی طبیعت اس کا انتظام کرے گی، آپ گھبرائیں نہیں .... آپ نے لکھا ہے کہ ہنگامہ آرائیوں کی شرکت چھوڑ دی، سچ یہ ہے کہ اس کے سوا چارہ نہیں، اس وقت مزاج وقت مبتلائے بحران ہے، ترک علاج ہی شاید علاج ہو، آپ کا عمل ابو ثعلبہ والی وصیت پر ہے حتی اذا رأیتم شحا مطاعاً وھوی متبعاً و اعجاب کل ذی رای برایہ فعلیک بنفسک ودع عنک امر العوام، اعجاب کل ذی رائی برایہ کا فتنہ موجودہ فتنہ سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے، پہلے فتنہ استبداد تھا، اب فتنۂ حریت ہے، علم، اخلاق، مذہب، تقویٰ، طہارۂ نفس کوئی شے بھی زمانہ کو مطلوب نہیں، صرف چند الفاظ مجہولہ کی ضرورت ہے، جو شخص ان لفظوں کو بلند آہنگی سے بول دے وہ امام العصر ہے۔ مقامات مقدسہ، نفر بدان اسلام، قربانی کا وقت آگیا، صرف ان لفظوں کے بغیر مرجع معانی پرستش ہو رہی ہے، شاید ایسا ہونا بھی ضروری تھا، اس لئے زیادہ شکایت بھی نہیں کرنی چاہیئے۔

معارف کے متعلق یہ آپ کیا کہتے ہیں، صرف یہی ایک پرچہ ہے اور تو ہر طرف سناٹا ہے، بحمد اللہ کہ مولانا شبلی مرحوم کی تمنائیں رائیگاں نہ گئیں اور صرف آپ کی بدولت ایک جگہ ایسی بن گئی جو صرف خدمت علم و تصنیف و تالیف کے لئے وقف ہے ۔۔۔ آپ نے تاریخ وفات کی نسبت لکھا ہے، سچ یہ ہے کہ اس کا کوئی صاف حل نہیں، ربیع کی کوئی بھی تاریخ قرار دیجئے حجۃ الوداع سے حساب ٹھیک نہیں بیٹھتا، الا یہ کہ اس سال کے لگاتار تینوں مہینے ۳۰، ۳۰ یا ۲۹/۲۹ کے مانے جائیں، اس صورت میں ۱۲ اور ۱۳ کو دوشنبہ پڑتا ہے، غالباً واقعۂ وفات بارہویں گزر کر رات کو علی الصبح ہوا ہے، دوسرا دن تیرہویں کا تھا اور لوگوں نے بارہویں سے بھی تعبیر کر دیا۔

فقیر ابوالکلام

صدیقی العزیز - السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ،

آپ کے دلچسپ خط نے پوری ملاقات کا لطف دیا، آپ کو اس قدر جلد اعظم گڑھ کے گوشۂ عافیت سے برداشتہ خاطر نہیں ہونا چاہیئے۔ ساری باتیں ایک جگہ اکٹھی نہیں ہو سکتیں، جہاں دلچسپیوں کی شورش ہے وہاں امن و جمعیت خاطر کہاں

آپ نے ارض القرآن میں صابئین کی نسبت الرد علی المنطقیین ابن تیمیہ کی عبارت نقل کی ہے، اس کے متعلق مطلع فرمائیے کہ یہ عبارت آپ نے کتاب کے کس صفحہ سے نقل کی ہے؟ یعنی وہ کتاب آپ کے پاس موجود ہے؟ تفسیر فتح البیان میں نواب صاحب نے ان الذین آمنوا والذین ھادوا والصابئین۔ الخ کی تفسیر میں پوری عبارت نقل کی ہے۔ اور بعض اور کتابوں میں بھی ہے، اگر آپ کے پاس کتاب مذکورہ موجود ہے تو میں خواستگار ہوں کہ ایک ہفتہ کے لئے مجھے عنایت فرمائیے، بحفاظت واپس کر دوں گا۔ سید علی بلگرامی کا نسخہ مولانا شبلی مرحوم کے پاس تھا، دوسرا نسخہ حکیم نور الدین صاحب قادیان کا تھا جو دیوبند آیا، مولانا عبید اللہ کے پاس رہا، پھر غائب ہو گیا، ممکن ہے مولانا مرحوم والا نسخہ اعظم گڑھ میں ہو، بہرحال مجھ کو اس کی سخت ضرورت ہے، اور ایک کام اس کی وجہ سے ناتمام رہ گیا ہے، امید کہ بصورت موجودگی آپ کو ترسیل میں کوئی عذر نہ ہوگا۔ موجب کمال امتنان و تشکر ہوگا صرف ایک ہفتہ بلکہ اس سے بھی کم کے لئے مطلوب ہے۔

آپ نے دار المصنفین کی موجودہ مالی حیثیت کا ذکر کیا... نہایت درجہ خوشی ہوئی یہ سب آپ کے قیام ہی

کا نتیجہ ہے، بحمد اللہ کہ مولانا شبلی مرحوم کے آخر حیات کی امیدیں بار آور ہوئیں، لیکن یہ بڑی مصیبت ہے کہ آپ وہاں کے قیام سے اُکتا گئے ہیں، اگر آپ نے وہاں رہنا چھوڑ دیا تو پھر سارا کارخانہ درہم برہم ہو جائے گا، کوئی ایسا انتظام کیجئے کہ "سہ ماہ بخورد و نہ ماہ پارسا می باش" کی اسکیم پر عمل درآمد ہو سکے، مستقل قیام وہاں رکھیئے عارضی ہر جگہ۔

ابو الکلام

نمبر ۴۵ رپن لین کلکتہ

۲۵ راگست

اخ الاعز الاجل		انعم اللہ علی بلقائکم والسلام علیکم

والا نامہ پہنچا، مجھے خوف تھا کہ کہیں آپ پونہ سے چلے نہ گئے ہوں یہ آپ نے کیوں کر کہا کہ میں آپ کو بھول جاتا ہوں، غالباً تواتر و تسلسل مراسلات علائق قلبیہ کیلئے شرط نہیں ہیں، آپ یقین کریں کہ موجودہ عہد کے جہل عام اور فساد محیط میں اتحاد مشرب و فکر کا رشتہ ایسا قوی ہے کہ اگر ہم میں سے کوئی کسی کو بھولنا بھی چاہے تو نہیں بھول سکتا۔

ارید لا نسیٰ ذکرھا، فکانما

تمثل لی لیلیٰ بکل سبیل

ترجمۃ القرآن کے متعلق اور امور تو پیش نظر تھے، لیکن ہر پیراگراف کے لئے عنوانات کا قائم کرنا، ایک نہایت ہی قیمتی اور مفید ترین چیز ہے، جو آپ نے مجھے تبلا دیا، مجھے اس کا بالکل خیال نہ تھا، البتہ رکوع وغیرہ پیشتر سے نظر انداز تھے، اصلی رکوع وہی ہے جو کسی مضمون مسلسل کا ایک مستقل مختتم بہ علامت وقف تام ٹکڑا ہے ہفتہ عشرہ میں سورہ بقر آجائے گی تو آپ کے پاس بھیج دوں گا، لیکن سچ یہ ہے کہ کام سے پہلے جن مشکلات کا علم نہیں ہوتا وہ کرنے پر اس طرح سامنے آگئے ہیں کہ قدم قدم رُک جانا پڑتا ہے ——— بہر حال کسی نہ کسی طرح کام کو جاری رکھا۔ یہ کام دراصل یوں تھے کہ باہم یکجائی ہوتی اور دیر دیر تک صحبتیں اس بارے میں کی جاتیں لیکن اللہ تعالیٰ کو یہ منظور نہیں تو جس حال میں جو کچھ ہو جائے اور توفیق مساعد ہو اسی پر شکر کرنا چاہیئے، حضرت شاہ ولی اللہ کی سوانح حیات موجودہ ٹونک کی خبر دے کر آپ نے مجھے بے چین کر دیا، ممکن ہے کہ اس میں کچھ حالات ہوں، تصانیف میں خاندان وغیرہ کی تفصیل ملتی ہے لیکن سلطنت مغلیہ کے آخری عہد میں ان کے سالہا سال کیوں کر بسر ہوئے، اور ایک شخص جسے ہم حجۃ اللہ البالغہ میں دیکھتے ہیں، عملاً کیسی زندگی بسر کر گیا؟ اس کا کوئی ذریعہ نہیں، مولانا شبلیؒ کی بدولت مجھے ایک عمدہ شے ملی اور میں نے نقل لے لی یعنی ذخیرہ دائرہ اللہ آباد و شاہ صاحب کے لئے اس سے زیادہ نہیں ملے گا۔

اگر میں یہ کہوں تو کیا آپ اسے سچ سمجھیں گے کہ میرا جی آپ سے ملنے کو بہت چاہتا ہے، اور آپ کی یاد ہمیشہ اس طرح آتی ہے گویا میں اپنے حقیقی بھائی کی نسبت سوچ رہا ہوں؟ تضاھا لغیری وابتلانی بحبھا ——— آپ نے لکھا ہے کہ آپ اکتوبر سے فارغ ہیں، لیکن پونہ سے کہاں جائیں گے؟ اعظم گڈھ یا وطن؟ اگر دلیسنہ کا قصد ہو تو اس سے کلکتہ دور نہیں اور ویسے تو پونہ اور اعظم گڈھ سے بھی ایک لمحۂ محبت میں بعد قرب ہو سکتا ہے۔

دار المصنفین کیلئے بہت ضروری ہے کہ اسے حقیقت اور اصلیت کا نمونہ بنایا جائے اور اس کے دائرہ کو اتنا وسیع نہ کیا جائے کہ ہر اڈیٹر اہل قلم اور ہر مضمون نگار مصنف ہو، ورنہ سب کچھ بے سود، وہ وقت ابھی سے پیدا کرنا چاہیئے کہ اس کا نام سند اور سارٹیفکٹ کا کام دے۔

فقیر ابو الکلام کان اللہ لہٗ

سید سلیمان ـــــ مہدی افادی کی نظر میں

مولانا سید سلیمان ندوی کے نام

۱

پیارے مولانا

مدّت سے میں نے آپ کو لکھا لکھایا نہیں لیکن میں نہایت دلچسپی سے آپ کی ادبی فتوحات کو دیکھ رہا ہوں۔

میرا خیال تھا تصنیفی عہد علامہ شبلی کے ساتھ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا اس خیال کو میں نے ایک مستقل عنوان کے تحت میں پھیلایا ہے۔

"اردو لٹریچر کا نفس واپسین"

عنقریب آپ کی نظر سے گذرے گا جس میں میں نے دکھایا ہے کہ "دار المصنفین" سے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔

"انجمن اردو" کے گرے ہوئے معیار اور ادھوری کوششوں سے مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے جہاں تک بلند پایہ لٹریچر کا تعلق ہے مجھے حسن ظن نہیں اور سمجھ میں نہیں آتا "پانچ ہزار روپے جو ہر سال ضائع ہوتے ہیں کس طرح رفقار "شبلی اکیڈمی" کی جیبوں تک پہونچا دوں۔

معارف کا ہر نمبر اپنے پیشرو سے بڑھا چڑھا ہوتا ہے اور مجھے حیرت ہے حسن سیرت کے ساتھ اچھی صورت کا اہتمام' محدود ذرائع اور مقامی مشکلات کے ساتھ کیونکر آپ کر سکے۔ بہر حال آپ کے دم سے میری امیدوں میں نئے سر سے جان آگئی ہے' ورنہ خیال تھا لٹریچر سے روابط سابقہ قایم نہ رکھ سکوں گا۔

۲

پیارے

اکبر پور ۹ ستمبر ۱۹۱۶ء

"ارض القرآن"[1] کی نسبت میں نے اس وقت تک آپ کو دو فقرے بھی نہ لکھے' یقینی اس موضوع پر آپ کو کوئی کتاب ہاتھ نہیں آئی مجھے حیرت ہے کہ ایک کام جو علم آثار کے ایک زبردست ماہر فن کے کرنے کا تھا وہ بھی ساٹھ برس کے بعد کسی یورپ کی اکیڈیمی میں بیٹھ کر آپ اس پر کیونکر قابو حاصل کر سکے میں عربیت سے زیادہ آپ کی "ادبیت" سے مرعوب ہو رہا ہوں۔ زبان نفس موضوع کے لحاظ سے قطعاً لایق شکایت نہیں یعنی کہیں سے بے جوڑ نہیں ہے' اور جب تناسب میں کہیں سے کور کسر نہیں تو حسن کی جامعیت میں کسکو کلام ہو سکتا ہے۔

آپ کا
مہدی

۳

تسلیم'

یہ کہنا بھول گیا کہ طنزیہ لٹریچر کی لطافت آپ کا حصہ ہے

م۔ اکبر پور' ۵ نومبر ۱۹۱۶ء

تسلیم'

"غیر سیاسی انسان"[2] کا خطبۂ صدارت' بنگال کے مجمع العلماء میں میں نے نہایت دلچسپی سے دیکھا خاص کر ایک "کافر" یعنی ابو الکلام[3] کا ذکر جس آزادی

---

[1] مکتوب الیہ کی ایک تصنیف کا نام [2] مکتوب الیہ نے انجمن علماء بنگال کے صدر کی حیثیت سے جو خطبہ پڑھا تھا اس میں خود کو "غیر سیاسی انسان" کے لفظ سے تعبیر کیا تھا۔

ے کیا گیا وہ اخلاقی جراءت کے بہترین شواہد میں سے تھا۔

فرنگی محل کی ایک نمود کی آواز میں دکھایا گیا ہے کہ "میں سب سے بڑے محمود کا ایاز ہوں"! "عشرۂ مبشرہ" میں تو اب موقع نہیں پھر کہاں گنجائش نکالیے گا؟ ۔۔۔ ابھی مزے کی بات ہے۔ بوڑھے عزت نے پھڑکا دیا۔

تلا بیٹھا ہوں کسی سلسلہ میں چوٹ کروں گا۔

م۔ اکبر پور، ۱۸ فروری ۱۹۱۸ء

۴

مکرمی،

مدت کے بعد دو صفحے دیکھے اور ممنون ہوا۔ سفر کی بے اطمینانی کے ساتھ بھی آپ نے ذرا تفصیل سے یاد فرمایا۔ ادبی رنگ آپ کے فقروں کی تہ میں بھی چمک اٹھتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ شوخی دور سے بلائیں لے رہی ہے۔

میں آپ کی جس ادائے خاص کا گرویدہ ہوں وہ اول درجہ کا معیار ہے جو آپ نے اختیار کر رکھا ہے، ملک کا عام مذاق بالکل حوصلہ افزا نہیں طبقۂ امراء لٹریچر سے قطعاً بے نیاز ہے، اس پر بھی دار المصنفین کا ایثار دیکھیے جو میرے خیال میں ایک طرح کی خودکشی ہے کہ وہ اپنی عزتِ نفس کے لحاظ سے جو کچھ کرتا ہے بلند تر معیار کو پیشِ نظر رکھ کر کرتا ہے۔

مہدی

۵

برادر محترم

عنایت نامہ ملا معارف میں "اعجاز خسروی" پر آپ کا چبھتا ہوا نوٹ[1] لٹریچر کی جان تھا، مجھے آپ کی اخلاقی جراءت کا قائل ہونا پڑا کہ یہی بات زبان پر آئی ہوئی اٹک گئی۔

آپ کا

مہدی

تحصیل، اکبر پور، ۲۹ اکتوبر ۱۹۱۸ء

۶

برادر محترم

تفصیلی عنایت نامہ میں نے بار بار پڑھا جس کے ۴ صفحے آپ کے خلوص کا بہترین مظہر تھے جی چاہتا ہے "وقایع سفر" کی چند سطروں کے عنوان سے کسی پرچہ کو بھیج دوں آپ کے مشاہدات کے اس حصے سے بہت متاثر ہوا "گذشتہ اسلامی تمدن کا ایک اجڑا ہوا خاکہ ہے" جس قلم سے ارض القرآن ہی سنگلاخ چیز نکلی ہو اس کے لیے ریشم پر موتی بکھیرنا چنداں دشوار نہیں، یہ کام استاد سے رہ گیا مگر شاگرد رشید اس کی تلافی کر سکتا ہے، وقت پر کچھ کر کے دکھا دیجیے، دنیا کیا یاد کرے گی، زاویہ نشینوں میں اس کا دل و دماغ کے لوگ بھی موجود تھے؟

آپ کا

مہدی

۷

برادر محترم

ادھر آپ بالکل ہی خاموش رہے، لڑکی پر آپ کی فاتحہ خوانی نے سنا بہتیروں کو رلا دیا![2]

تحصیل ڈیرہ پور، ۴ اکتوبر ۱۹۱۹ء

---

[1] نواب اسحاق خان مرحوم ایجوکیشنل کانفرنس کی طرف سے خسرو کی تصنیفات چھپوا رہے تھے ہر تصنیف پر کسی نہ کسی جامع نے عزیب خسرو پر طبعزاد تقریظ لکھی ہے، منجملہ اس کتاب پر چریا کوٹی صاحب نے تقریظ کا حق ادا کیا ہے اس کی طرف یہ اشارہ ہے۔ [2] خلاف کانفرنس اول منعقدہ لکھنؤ میں مکتوب الیہ نے ایک مختصر لیکن نہایت موثر تقریر کی تھی جس نے جلسہ کو بزم ماتم بنا دیا تھا اس کی طرف اشارہ ہے۔

۱۴ عزیزی،

تمہارا[1] عزائم دیکھ کر یہاں کے قیام کا ارادہ میں نے ترک کر دیا، اور لکھنؤ اور اعظم گڑھ میں رہنے کے انتظامات کر لیے، اس لیے اب تمہارا یہاں آنا بیکار ہے، میں ۶ دسمبر کو یہاں سے روانہ ہوں گا، بھوپال میں دو چار دن ٹھہروں گا، پھر لکھنؤ یا الہ آباد، کانفرنس کی شرکت سے فارغ ہو کر کہیں مستقل قیام کروں گا، اور اس وقت تم کو تکلیف دوں گا،

تمہاری ضرورت اس لیے ہے کہ بیضہ کی نظرثانی کرو، کوئی بات غلط درج ہو گئی ہو یا فرو گذاشت ہو گئی ہو، تو درست کرتے جاؤ، بعض امور میں مشورہ کی بھی حاجت ہے، چند مہینے کے بعد تم بالکل آزاد ہو، جو تمہاری اسکیم ہو اس کے موافق کام کرو، میں ہر کام میں مدد دینے کو تیار ہوں،

شبلی ۲ دسمبر ۱۹۱۳ء
حیدر آباد

۱۵ عزیزی،

افتخار عالم صاحب[1] میری لائف کیا لکھیں گے، کبھی تم اور دنیا کے تمام کاموں سے فارغ ہونا تو تمہیں لکھنا،

شبلی ۸ فروری ۱۹۱۴ء

۱۶ عزیزی،

مشرق[2] کا مضمون تو بہت پُرزور اور پُر از لطافت ہے، البتہ ایک غلطی کی پر فوراً اصلاح کرا دینی چاہیے، میں نے یکمشت چندہ کچھ سو دیا تھا، مضمون میں چھ ہزار چھپ گیا، اس قسم کی غلطی سے مضمون کا مضمون مبالغہ آمیز ہو جاتا ہے، غالباً مشرق نے یہ خود تصرف کیا ہے،

شبلی ۱۵ جولائی ۱۹۱۴ء
بمبئی

۱۷ عزیزی،

تمہارا انتظار بہت[3] رہا، مسعود آئے بھی اور چلے گئے، وہ تو اس ویرانہ کو علمی کوششوں (دار المصنفین و تکمیل وغیرہ) کی جولانگاہ بننے کے قابل خیال کرتے ہیں، کتابیں بقدر ضرورت مہیا ہو گئی ہیں، چھ سات الماریاں بھر گئی ہیں، وقف نامہ بالکل زیر تحریر ہے، بنگلہ کے نقل میں مختصر سا دار المصنفین بن گیا ہے، غالباً آپ کو تکلیف نہ ہوگی، لیکن آؤ تو چند روز ٹھہرو، پا در رکاب آنا مستند نہیں۔

شبلی ۱۰ اکتوبر ۱۹۱۴ء
اعظم گڑھ

۱۸ عزیزی،

بھائی مجھ کو اور لوگوں کو کیوں دق کر رکھا ہے، آنا ہے تو آؤ ورنہ الیاس [illegible]

شبلی
اعظم گڑھ
۲۶ اکتوبر ۱۹۱۴ء

۱؎ مولوی افتخار عالم صاحب مارہروی سوانح نگار مولوی نذیر احمد مرحوم مولانا کی لائف لکھنا چاہتے تھے، حالات پوچھے تھے، مکتوب الیہ نے ان کی سفارش کی تھی، اس پر لکھتے ہیں۔ ۲؎ مشرق گورکھپور میں ایک بزرگ نے مولانا پر اعتراضات کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ ۳؎ مکتوب الیہ کے نام آخری خط، آؤ جب تو دیکھا تو بلانے والا بستر مرگ پر دراز تھا!

قطعہ تاریخ رحلت علاّمہ سیّد سُلیمان ندوی

کشود پر نہ تمنائے عالمِ باقی
زخاکدانِ فنا رختِ زندگی بربست
نشانِ صاحبِ عرفاں بزیرِ خاک مجو
ببیں کہ "تختِ سُلیماں بباغِ فردوس است"

۱۹۵۳ء

حفیظ ہوشیارپوری
آہنگ

تاریخ مرگ، یگانۂ جہاں علامہ سلیمان

۱۹۵۳ء

محقق، مدقق سلیماں شکوہ
خوشا کشورِ علم کا تاجور

وہ چرخِ معارف کا مہرِ منیر
وہ عالم وہ سنجیدہ و نکتہ ور

جھلکتے تھے چہرہ پہ انوارِ فضل
چھلکتی تھی آنکھوں سے فکر و نظر

قلم تھا جو تیغِ صفاہان دہ ہند
تو خود مردِ میدانِ علم و ہنر

جہاں سے بہشتِ بریں کی طرف
گیا باندھ کر آج رختِ سفر

یہ تاریخِ رحلت ہے صابر لکھو
مورخ سلیمان عالی گہر

۱۳۷۳ھ

دیگر

حضرت علامہ سید سلیمان ندوی طالب ایزد

۱۹۵۳ء

محقق مورخ سلیمان رفت
ز دنیا سوئے خلد ذی شان رفت

غزالیِ دوران و رازیِ عصر
چو او رفت ہم علم و عرفان رفت

مدیرِ معارف ادیبِ شہیر
ز افسانہ تابندہ عنوان رفت

بلاغت بگرید کہ سحبان نماند
فصاحت بہ ماتم کہ حسان رفت

ز حرفِ عجم رفت شہد و شکر
ز نطقِ عرب اصمعیِ شان رفت

چہ سیرت نگار و چہ معجز نگار
بصد راہِ مشکل چہ آسان رفت

پئے سال تاریخ صابر بگو
"ریاضِ معانی سلیمان" رفت

۱۳۷۳ھ

صابر رامپوری

مناظر احسن گیلانی

نوحہ سُلیمانؔ
یا
عقیدت کے چند آنسو

اے سُلیمانؔ آہ پیغمبر کا وہ سیرت نگار
آج محفل علم کی افسوس سُونی ہو گئی
اب کرے گا کون ہم میں دین کے اسرار کو
خدمتِ بے مزد کرتا کون ہے اسلام کی
ذوق علمی کی ترے غزلی زباں ممنون ہے
گو پڑھا ندوہ میں تھا لیکن علی گڈھ دیو بند
خندہ زن یورپ تھا قرآنی قصص پر جہل سے
ہند اور تاریخ اسلامی کے اسرار و رموز
چاک پردوں کو کرے گا کون استشراق کے
حوصلہ افزائیاں تیری خدا بخشے تجھے
اپنی تحریروں میں خود میری نظر تجھ پر رہی
آج ہیں مبہوت تری راہ کے سارے رفیق
کھوئے کھوئے آجکل ہیں جوش بھی اور ہوش بھی

جس پہ نازاں ہند تھا اور فخر کرتا تھا بہار
دین و دانش کے چمن کی لٹ گئی گویا بہار
کاوشِ تحقیق کی سیقل گری سے آشکار
کس پہ ہو گا سنت کے اس عشق کا سودا سوار
ندوے لکھ تعلیم کا مانا گیا تو شاہ کار
تیرے علم و فضل کا کرتے تھے دونوں اعتبار
تیرے خامہ نے بتایا اس کا تاریخی وقار
سو رہو تم بھی جہاں سویا تمہارا راز دار
ان کی چالوں پر کرے گا خود انہیں کو شرمسار
کتنے ناکارے بنے ان کی بدولت اہل کار
رائے کا تری رہا دل کو ہمیشہ انتظار
گم رہی ہے ان میں جو تھا سب سے بہتر شہسوار
حضرت امجد بھی چپ ہیں اور جگر بھی دلفگار

خُلق تیرا حلم تیرا تیرا شرمیلا مزاج — یاد میں ان کی رہیں گی اپنی آنکھیں اشکبار
فتنہائے نو بہ نو سے ہوگیا آزاد تو — بے قراری میں یہی اک چیز ہے وجہِ قرار
جن کے تو قابل نہ تھا ان سے ملی تجھ کو نجات — وہ بھی ہلکے ہو گئے جن کے دلوں کا تھا تو بار
اہلِ دُنیا اب نہ آئیں گے ستانے کے لئے — ایک ہی مسئلہ کو پوچھیں گے نہ تجھ سے بار بار
اب بیاں چاہیں گے نہ تجھ سے اکیا صحافت کے سفیر — وقت کو ضائع کرے گی اب نہ پبلک کی پکار
کام کیا ہے اب خدا والوں کا ایسے عہد میں — خودنمائی خودفروشی کی ہو جب دُنیا شکار
پیری و بیماری میں اللہ رے چستی تیری — جست اک ایسی لگائی ہوگیا دُنیا سے پار
بس گئے ہوں جس کے دل میں رحمۃ للعٰلمین — گود میں اس کو نہ کیوں لے رحمت پروردگار
دل بھی کہتا ہے کہ تو مرحوم ہے مغفور ہے — مصطفٰے تیرے شفیع اور رب تیرا آمرزگار
ہے یہی کافی کہ تجھ کو تھا نوی دربار سے؟ — جانشینی اور خلافت کا تھا حاصل افتخار
گرچہ تو تنہا گیا ہے پر دلاتا ہوں یقیں، — آرہے ہیں آگے پیچھے تیرے سب احباب دیار
حق کی مرضی تھی وگرنہ آرزو اپنی یہ تھی — ہوتا اعظم گڑھ میں یا دسنہ ہی میں تیرا مزار
ہے جبھی مدفون تو کیا۔ رُوح تو آزاد ہے — اپنے تصنیفی ادارے کی تماشا کر بہار
قافلہ سالار اب بھی غم زدہ مسعود ہے — بعد تیرے پشت پر اپنے اُٹھائے تیرا بار
رُو رہے ہیں مُنہ چھپائے مولوی عبدالسلام — دل بھی اور آنکھیں بھی ان کی آج ہیں خونابہ بار
شاہ مولانا معین الدین احمد کو بھی دیکھ — چاک ہے جن کا گریباں اور دامن تار تار
اور عزیزِ خاص تیرا وہ صباح الدین غریب — تیرے ہی در پر پڑا ہے خستہ و زار و نزار
راہ میں آئے گا لکھنو اور دریا باد بھی — ہیں جہاں تھامے کلیجے تیرے کچھ یارانِ غار
ہو کبھی دسنہ جو آنا تو رہے اس کا خیال — ایک گیلانی میں بھی ہے آرزوؤں کا مزار

نسیم جماکی

آہ سلیماں چلا گیا

(۱)

اس دور میں کہ گرم ہے بازار جھوٹ کا
اس دور میں کہ سچ کا تصور محال ہے

دنیائے رنگ و بو پہ ہے زاہد مٹا ہوا
صوفی اسیرِ حلقۂ دامِ جمال ہے

ملا ہے جوڑ توڑ کے میداں میں گامزن
ناقابلِ بیاں ہے جو پیروں کا حال ہے

سیرت نگار محوِ فسانہ ہے ان دنوں
تاریخ داں اسیرِ کمندِ خیال ہے

یوں بن گئی ہے فطرتِ ثانی مبالغہ
ناپید گویا رسم و رہِ اعتدال ہے

مکر و ریا کے نیرِ تاباں کے سامنے
مہرِ خلوص و صدق و صفا کا زوال ہے

اس عہد میں کہ دعوئ باطل ہے ہر طرف
اس عہد میں کہ جوہرِ ذاتی کا کال ہے

اس دور میں کہ ڈھونگ رچا ہے ہر ایک سو
اور مردِ حق پسند کا ملنا محال ہے

(۲)

آیا دیارِ پاک میں اک عندلیب حق
اپنی نوا سے جس نے چمن کو کھلا دیا

گلہائے ذکر و فکر فضا میں بکھیر کر
دورِ خزاں کو دورِ بہاراں بنا دیا

اپنے خیال، اپنی زباں، اپنے فعل سے
معیار و اعتبار صداقت بڑھا دیا

گفتار سے بلند کیا راستی کا نام
کردار سے سلف کا نمونہ دکھا دیا

اپنی بلند پایہ تصانیف کے سبب
شمع ادب کو شمع ہدایت بنا دیا

ہر چند تھا وہ قافلہ سالار اہل عقل
پھر بھی سلوک و جذب کا رستہ دکھا دیا

اُس نے خلوص نیت و حسن سلوک سے
خلق محمدی کا طریقہ سکھا دیا

اُس مست لم یزل نے ہمیں سرخرو کیا
یعنی ہمارے عہد کو زریں بنا دیا

(۳)

مایوس ہو کے اہلِ چمن سے وہ عندلیب
آخر مثالِ بوئے پریشاں چلا گیا

گلشن میں خار و خس کے سوا کچھ نہیں رہا
روحِ بہار و جانِ گلستاں چلا گیا

جسکا وجود آیۂ رحمت سے کم نہ تھا
وہ فخرِ خویش و رشکِ عزیزاں چلا گیا

سیرت نگارِ سیدِ بطحا نہیں رہا
وہ ہم زبانِ شبلی و سحباں چلا گیا

پیشِ نظر تھا جس کے سدا اسوۂ رسول
وہ پارسا وہ حاملِ قرآں چلا گیا

کتنے ہی اس کے فیض سے محروم ہو گئے
لذت شناس بادۂ عرفاں چلا گیا

کتنوں کے رک گئے رہِ تحقیق میں قدم
جس دن سے وہ محققِ دوراں چلا گیا

مسند علوم دین کی خالی ہوئی نسیم
اس انجمن سے آہ سلیماں چلا گیا

یادِ استاذ

حکیم نصیر الدین ندوی

یہ چند افکار پریشاں ہیں جو حضرت اقدس کی حیات میں میں نے اپنی ذات کو مخاطب کرتے ہوئے لکھے تھے۔ اور ان اشعار کے متفرق اور نا تمام رہ جانے کی وجہ سے اُن کی خدمت گرامی میں پیش کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔

زِ سید بیاموز علمِ رسول — ولی حق است و امام ہمام

نشانے زِ آیاتِ حق بر زمیں — بہ اوجِ سما ذکرِ خیرش مدام

بہ شکل و بہ صورت ملک زادۂ — بہ حسن و بہ خوبی چو ماہِ تمام

غزالی بہ علم و فلاطوں بہ عقل — مجاہد بہ فطرت سلیماں بنام

بہ تبلیغ دیں مستفیض از رسولؐ — بہ ارشاد و تلقیں چو ابن ہمام

پئے دفع کفار و ہم قطعِ شرک — چو شیرے کہ بیروں جہد از کنام

گرفتہ سرِ کفر در دستِ قہر — چو بازے کہ گیرد بہ چنگل حمام

ز شعرش فروزندہ رخسارِ صبح — چو ماہِ درخشندہ از کحلِ شام

تراود زِ کلکش چناں دُرِ شعر — تو گوئی کہ ریزد شراب از غمام

لطافت از و یافت طبعِ نصیر

نصیبِ[1] زمیں ہم زکاسِ کرام

[1] ترجمۂ جمیل مصرعۂ ذیل،

فللارض من کاس الکرام نصیب

(ایڈیٹر)

اشتہار

سندھ لوکل اتھارٹیز سروس کی حسب ذیل آسامیوں کے لئے سندھ کے دیسی باشندوں اور بونا فائیڈ مسلم مہاجرین سے جنہیں سندھ میں ایک سال کی سکونت کی شرط پوری کرنی ہوگی درخواستیں مطلوب ہیں:۔

۱۔ چیف افسر، میونسپلٹی گروپ ۳ (ا)

۲۔ چیف افسر، میونسپلٹی گروپ ۳ (ب)

۳۔ سکریٹری میونسپلٹی گروپ ۴

تمام آسامیاں مستقل اور قابل پنشن ہیں۔ مدت ملازمت دو سال ہے۔ انتخاب کے بعد منتخب شدہ امیدواروں کو فوراً ملازمت پر جانا اور صوبہ سندھ میں کسی جگہ بھی تعیناتی کیلئے تیار رہنا ہوگا۔ سرکاری پراویڈنٹ میں چندہ دینا لازمی ہوگا۔ اگر افسران محکمہ اجازت دیں تو سرکاری ملازمین بھی درخواست دے سکتے ہیں۔ ان کیلئے زیادہ سے زیادہ عمر کی شرط نرم کی جاسکتی ہے۔ براہ راست درخواست دینے والے امیدوار جن کی مادری زبان سندھی نہیں ہے انہیں قواعد کے مطابق سندھی کا مجوزہ امتحان پاس کرنا ہوگا۔ عورتوں کیلئے درخواست دینے کی اجازت نہیں ہے۔ عمر ۲۸ فروری ۱۹۵۴ء کو ۲۵ سال سے کم اور ۳۵ سال سے زیادہ نہیں ہونی چاہیئے۔ مذکورہ بالا تینوں قسم کی آسامیوں کے لئے تنخواہ اور شرائط استعداد حسب ذیل ہونگے:۔

آسامیاں نمبر ۱	شرح تنخواہ	شرائط استعداد
	(ا) ۱۸۰ روپے — ۸ — ۲۶۰ ای بی — ۱۰ — ۳۰۰ روپے علاوہ ان الاؤنسوں کے جو حسب قاعدہ دیئے جاتیں گے	(ا) (۱) انجینیرنگ کی ڈگری اور تین سال کا عملی تجربہ کسی سرکاری یا لوکل اتھارٹی یا کسی بڑے ادارے کی سروس میں۔ (ا) (۲) آرٹ یا سائنس کی ڈگری اور دو سال کا تجربہ لوکل اتھارٹی سروس یا نیم سرکاری ادارہ کی ملازمت میں
	(ب) ۱۴۴ روپے — ۶ — ۱۸۰، ای بی — ۸ — ۲۶۰ روپے علاوہ ان الاؤنسوں کے جو حسب قاعدہ دیئے جائینگے۔	(ب) انجینیرنگ کا ڈپلوما اور تین سال کی سرکاری یا لوکل اتھارٹی یا کسی بڑے ادارہ کی ملازمت کا تجربہ
آسامیاں ۲	۱۲۰ روپے — ۱۰ — ۲۱۰ روپے علاوہ ان الاؤنسوں کے جو حسب قاعدہ دیئے جائینگے	آرٹ یا سائنس کی ڈگری یا انجینیرنگ کا ڈپلوما یا سرٹیفکیٹ
آسامیاں ۳	۱۰۰ روپے — ۵ — ۱۵۰ روپے علاوہ ان الاؤنسوں کے جو حسب قاعدہ دیئے جائینگے	کسی تسلیم شدہ یونیورسٹی کی ڈگری یا میٹرک کی سند اور کسی سرکاری یا لوکل اتھارٹی کی ملازمت کا تین سالہ تجربہ یا انجینیرنگ کا ڈپلوما یا سرٹیفکیٹ۔

درخواستیں مع تصدیق شدہ نقول اسناد متعلقہ شرائط استعداد، تجربہ، عمر، توطن اور چال چلن ریونیو کمشنر سندھ نیپیئر بیرک کراچی کے پتہ پر یکم مارچ ۱۹۵۴ء سے پہلے پہنچ جانی چاہئیں۔ جو امیدواران آسامیوں کے پہلے درخواستیں دے چکے ہیں انہیں بھی از سر نو درخواستیں بھیجنی چاہئیں۔

(اشتہار نمبر ۳ ۔ ۵۴ء)

نقشِ سُلیمانی

محمد اسماعیل ذبیح

نُور کے سانچے میں ڈھلا ہوا، ایک پیکرِ خاکی، جو آج جزوِ خاک ہے، مگر اپنا نُورِ علم آئندہ نسلوں کے لئے چھوڑ گیا، ایک قدسی صفت راوی جس نے پوری دُنیائے انسانیت کے سامنے ہادیٔ عالم کی پاک سیرت کی وہ سچی کہانیاں سُنائیں جس کا لفظ لفظ جذبۂ شوق سرمستی و سرور، تحقیق و تفتیش، صحت و پاکیزگی کا آئینہ دار ہے، جس نے ایک قوم کے فرائض، ایک سلطنت کی ذمہ داری، اور مصنفوں کے ایک پورے کارواں کا کام خدا کی توفیق سے تنہا انجام دیا، جس نے ایک خطۂ ملک کے ایک گمنام سے گوشہ میں بیٹھ کر ساری دُنیا کے علم کو جگمگا دینے والے فانوس روشن کئے، جس نے ایک عجمی زبان میں عربی علوم الہٰیہ کا سارا جوہر اس طرح نچوڑ دیا کہ اب وہ ہر زبان کا سرمایۂ افتخار ہے، جس کا سینہ نورِ عرفان سے اس طرح اُبلتا رہا ہے جیسے کسی کوہسار کا شفاف اور پُرجوش چشمہ، جس کی نظر میں ہمیشہ گدازِ عشق کی نمی جھلملاتی رہی، اور جو ہمیشہ سرمدی لطافتوں کے جلوے اپنے تاروں میں پروتی رہی، جن کا دماغ شعور کی لامحدود وسعتوں کا امین رہا، اور جن کا قلب وجدان و آفاق کا بسیرا تھا، علم خود ان کے سامنے زانوئے ادب طے کرتا رہا، اور علوم و فنون حقہ سمٹ سمٹ کر ان کے انفاس میں جذب ہوتے رہے۔

سید سلیمان ندوی، بذاتِ خود ایک مختصر سے نحیف و نزار وجود تھے، مگر جس طرح برقی رو کمزور سے تاروں میں دوڑ کر روشنی اور طاقت کا خزانہ بن جاتی ہے، پہاڑوں کا سینہ چیرتی، اور رادیٔ تہذیب نو کی سربراہ ہے، اسی طرح اس دبلے پتلے نام کے انسان کے آب و گل میں جو رُوح کارفرما تھی، اس نے علم و فن کے نئے نئے تخلیقی عجائبات کھڑے کر دئے، اور اپنی روحانی طاقت سے وہ عظیم کام سرانجام دے، جو آج علمی دنیا کا شاہکار ہیں۔

سید سلیمان اپنی زندگی کے آخر میں پاکستان آئے، اور اس نئی مملکت کو اپنی عظمتیں بخشیں، مبارک ہیں وہ لوگ جو ان کے فیض سے مستفید ہوئے، اور صد مبارک ہے وہ سرزمین جہاں ان کا جسدِ خاکی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک مینارۂ نور کی طرح فروزاں ہے، اور جو اس نئی مملکت کو حصولِ علم اور صراطِ مستقیم کی دعوت دیتا رہے گا!

مورِ بے مایہ

محمد اسماعیل ذبیح

Regd. No. S. 1739

MARCH 1954

The "REYAZ" Monthly

Arambagh Road Karachi-1.

